روشنی

دینی موضوعات پر نشری تقاریر

جلد اوّل

مولانا محمد متین ہاشمی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیّہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور

طبع اول	۱۹۹۱ء
ناشر	ناظمِ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۔ کلب روڈ، لاہور
مطبع	کمبائن پرنٹرز، لاہور
قیمت	۱۰۰/- روپے

اس کتاب کی طباعت و اشاعت اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی مالی معاونت کی بدولت ممکن ہوئی ہے۔ شکریہ!

مقدمہ

زیرِ نظر کتاب دراصل میری ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو "روشنی" کے عنوان سے وقتاً فوقتاً ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہی ہیں۔ میں ریڈیو پاکستان کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس کے ذمہ داران نے افادۂ عام کی خاطر ان تقاریر کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔

یہ مجموعہ اس سے قبل بھی شائع ہو چکا ہے جسے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت کم عرصے میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ تیسرا ایڈیشن ملک کے مشہور علمی ادارے "ادارہ ثقافتِ اسلامیہ" کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہا ہے۔

اس مجموعے میں شامل تقاریر کا مواد مستند تاریخی حوالوں سے لیا گیا ہے۔ حوالہ اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ اس سے کتاب بوجھل ہو جاتی۔ چونکہ ان تقاریر کا مقصود افادۂ عام تھا اس لیے عبارت میں سلاست، روانی اور تاثیر کو بھی ملحوظ رکھا گیا اور ہر آن یہ بات پیشِ نظر رہی ہے کہ مسلمان اپنے اکابر (رحمہم اللہ) کے نمونۂ عمل سے آشنا ہیں اور ایک ایسے وقت میں جبکہ اغیار کے ملمع زدہ کارنامے انہیں ورطۂ حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں اور وہ دوسروں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی طرف دوڑ رہے ہیں، انہیں معلوم ہو کہ ان کے دامن میں کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب چھپے ہوئے ہیں، جن سے وہ غافل ہیں۔

آخر میں میں جناب حافظ محمد سعد اللہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس مجموعے کی ترتیب و تبویب میں میری مدد فرمائی۔ نیز میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس خدمت کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

سید محمد متین ہاشمی
ڈائرکٹر ریسرچ سیل، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور

۲۰- اپریل ۱۹۹۱ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

—فہرست مندرجات—

روشنی

بابِ اوّل

ایمان و توحید و صفاتِ باری تعالٰے

۷

حقیقتِ ایمان

توحید کا کمال یہ ہے کہ دل پر توحید کے سوا کسی چیز کا گزر ہی نہ ہو۔ جب انسان کے دل پر توحید کا پوری طرح غلبہ ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی کے کسی گوشے میں بھی توحید کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی اور یہ حقیقت ہے کہ انسان کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے وہی اس کے عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ عمل سے بڑھ کر دل کا کوئی سچّا گواہ نہیں ہے۔ عمل ہی دل کے خیالات و عقائد کا حقیقی ترجمان ہے۔ ناممکن ہے کہ دل میں تو شرک و نفاق بھرا ہوا ہو اور عمل موحّدانہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زبانی دعووں کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ وہ دلوں کے راز جاننے والا اور نیّتوں کے کھوٹ سے پوری طرح آگاہ ہے۔ توحید کو پوری طرح اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی زندگی کے کسی گوشے میں بھی توحید سے تضاد باقی نہ رہے۔ اس کے عقیدہ و اعمال میں اس کے اقوال و افعال میں، اس کے اخلاق و کردار میں، اس کے معاملات و تعلقات میں یکسانیت ہو۔ جو باطن میں وہی ظاہر میں ہو جو جلوت میں ہو وہی خلوت میں۔ کیونکہ وہ خود کو ہر وقت بارگاہِ الٰہی میں حاضر تصوّر کرتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دل پر توحید کا پورا غلبہ اور قبضہ ہو اور وہ دل پر اس طرح چھا جائے کہ توحید کے سوا کوئی اور شے اس کے قریب بھی پھٹکنے نہ پائے۔ جب دل جو سب فکر و عمل کا سرچشمہ و محرّک ہے اس کیفیت کا حامل ہو جاتا ہے تو ساری زندگی آپ سے آپ توحید کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ اس وقت انسان کی اپنی پسند اور اپنا ارادہ اللہ تعالیٰ کی پسند اور اس کے ارادے میں فنا ہو جاتا ہے اور انسان تقدیرِ الٰہی پر اعتراض نہیں کرتا بلکہ ہنستا مسکراتا اس کا استقبال کرتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر زہر شربت، زخم مرہم اور مصیبت راحت بن جاتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

ہر حال میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دُنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنّت کی فضا دیکھ

(ایمان کی دُنیا میں محبت کی حیثیت ایک دعوے کی اور اطاعت کی حیثیت دلیل کی ہے۔ دُنیا کی کسی بھی عدالت میں کوئی دعویٰ بغیر دلیل اور ثبوت کے قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ ایمان کی دُنیا کا بھی آئین یہی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعوے کرے اس کے احکام کی اطاعت بھی کرے۔ جس شخص کے دل میں جس قدر اللہ کی محبت ہوگی اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا اور اس کا فرماں بردار ہو گا۔ اگر کسی کا دل خُدا کا محل ہو اور آنکھ کائنات ہست و بُود میں ربِّ ذوالجلال کی قدرت کا مشاہدہ کر رہی ہو تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو ترک کر دے یا اس کے بجالانے میں پس وپیش کرے۔ جس شخص کا بدن امرِ الٰہی کو بجالانے سے گریز کرے وہ اگر معرفتِ خداوندی کا دعویٰ کرے تو وہ اپنے دعوے میں جھُوٹا ہے۔ معرفت حاصل کر لینے کے بعد دل شوقِ الٰہی کا محل بن جاتا ہے اور پھر وہ اپنے محبوب کے احکام کی تعظیم کرتا اور اسے بجالانے میں سکون ولذّت محسوس کرتا ہے۔ گرویدہ ہونے کی علامت ہی یہ ہے کہ توحید قلب میں راسخ ہو جائے۔ انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو دیکھ کر انسان عبرت وموعظت حاصل کرے۔ کان اسی کا کلام سنیں، زبان سے صدق کے سوا کچھ نہ نکلے، معدہ حرام غذا سے پاک ہو اور سارا بدن ان چیزوں سے پرہیز کرے جن سے کائنات کے خالق و مالک نے منع فرمایا ہے۔ حقیقت میں ایمان اسی کا نام ہے کہ بندے کی تمام قوتیں اوصافِ خُداوندی کی طلب و جستجو میں لگی رہیں اور زندگی کی ہر ساعت میں صرف اور صرف اسی کی رضا اور خوشنودی پیشِ نظر ہو۔

ایمان کے تقاضے ــــ ایمان اور عملِ صالح

(ایمان کی مثال ایک سلطان ذی شان کی ہے۔ جب ایمان قلب میں داخل ہوتا ہے تو شک و وہم، بے عملی و نافرمانی اور بغاوت وغیرہ کے تمام خس و خاشاک شبستانِ قلب سے دُور ہو جاتے ہیں اور ایک فانی انسان کا دل اللہ تعالیٰ کا عرش

اور جمالِ خداوندی کے مشاہدے کے لئے آئینہ خانہ بن جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایمان کی معرفت کا بادشاہ کسی دل کی بستی میں فاتحانہ داخل ہو اور پھر بھی اس کے منافی کوئی چیز اس بستی میں باقی رہ جائے۔ دل کی دنیا پر جب سلطانِ ایمان کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے تو توکل اپنی تمام تر عظمتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور ہر بندہ ہر معاملے اور ہر کام میں صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے لگتا ہے۔ رزق، رہنمائی اور کارسازی کے معاملے میں بندے کی نگاہ کسی اور کی طرف اٹھتی ہی نہیں اور پھر اس کا سر کٹ تو سکتا ہے جھک نہیں سکتا۔ کیونکہ غیر اللہ کے آستانوں پر وہی سر جھکا کرتے ہیں جو صحیح معنوں میں بارگاہِ خداوندی میں خم نہیں ہوتے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

خوف و رجا اور ایمان

ایمان خوف و رجا، اُمید و بیم، یاس اور آس کے درمیان کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یعنی انسان جب اپنی کوتاہیوں، گناہوں اور نافرمانیوں پر نظر ڈالے تو اس پر اس درجہ خوف طاری ہو جائے کہ وہ اپنی مغفرت تک سے نااُمید ہونے لگے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاریت و ستاریت، اس کی رحمت اور مخلوق پر اس کی بے پایاں شفقت کا تصور کرے تو اس کا دل اچھی امیدوں اور بخشائش کے خیال سے مسرور ہو جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب امید خوف پر غالب آجاتی ہے تو آدمی بے خوف ہو کر گناہ کے تاریک غار میں چھلانگ لگا دیتا ہے اور اپنے نفس کی حفاظت ترک کر دیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے معاملات خراب ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر خوف اس پر غالب آجائے تو توحید میں نقص پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ خوف کے غلبے کی صورت میں انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نااُمید ہو جاتا ہے اور خدا کی

رحمت سے نا اُمیدی تو کفر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا اُمیدی تو اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان اس کو قادرِ مطلق نہ جانے وہ کہ جو خالقِ کائنات ہے۔ عزّت و ذلّت، حیات و موت، صحت و مرض، تنگی و فراخی اور خیر و شر کا مالک ہے۔ جس کے فیصلے کو کائنات کی کوئی شے روک نہیں سکتی۔ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے۔ پل بھر میں ذرّے کو آفتاب اور آفتاب کو نیست و نابود کر دینے پر قادر ہے۔ بھلا اس کی رحمت سے نا اُمیدی کیا معنی رکھتی ہے۔ بندے کا کام تو بندگی ہے، بندگی کرتا رہے اور یقین رکھے کہ وہ سخی داتا جو اپنے در سے کسی سائل کو نامُراد نہیں لوٹاتا، ہرگز ہرگز اپنے بندے کو محروم نہیں کرتا۔ بندے کا کام تو صرف یہ ہے کہ اس کے دَر پر پڑا رہے، دروازہ کھٹکھٹاتا رہے۔ کبھی تو اس کا دروازہ کھُلے گا۔ کبھی تو وہ کہے گا لبّیک یا عبدی۔ میرے بندے! کہہ تو کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہی دن بندے کی کامیابی و شادکامی کا دن ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اُمید کی درستی اور خوف کی صحت ایمان کے کمال کے لئے دونوں ضروری ہیں۔ اُمید کی درستی سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی معرفت حاصل ہوگی اور خوف کی صحت سے انسان گناہوں سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرے گا اور اگر گناہ سرزد ہو تو فوراً توبہ کی طرف سبقت کرے گا۔ اس لئے کہ اس کا ربّ توّابُ الرّحیم ہے۔ شرط یہ ہے کہ بندے میں ندامت و پشیمانی، گریہ وزاری اور عاجزی و خاکساری پیدا ہو کہ مولا کو یہی پسند ہے۔ اس کی بارگاہ میں گر پڑو، وہ اُٹھا لے گا اور اٹھاتے وقت وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کون نیکوکار ہے اور کون بدکار اس لئے کہ ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے!
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

حُبِّ الٰہی

چند خصوصیات کی بنا پر ہر چیز میں کوئی نہ کوئی کشش، مزا یا حلاوت ہوتی ہے

ایمان میں بھی ایک خاص قسم کی حلاوت اور لذّت ہے جسے اس کی لذت و حلاوت کا شعور حاصل ہو جاتا ہے وہ انتہائی بے پروائی سے بڑی سے بڑی چیز کو ٹھکرا دیتا ہے۔ چنانچہ ایسا بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ ایمانِ کامل والے مومن نہایت بے نیازی سے مال و دولت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ بلکہ انسان اگر عزم و استقلال سے کام لے تو ابتلاء و امتحان پر بھی صبر کر سکتا ہے۔ اہلِ ایمان کے صبر و استقلال کی درخشندہ مثالوں سے تاریخِ اسلام کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ بلکہ استیعاب میں ہے کہ جب صحابہ کرام رض شام تشریف لے گئے تو انہیں دیکھ کر ایک راہب نے کہا تھا کہ حضرت عیسےٰ مسیح علیہ السلام کے وہ اصحاب جو آروں سے چیرے اور سُولی پر لٹکائے گئے تھے ان مسلمانوں سے زیادہ راہِ حق میں تکلیف برداشت کرنے والے نہ تھے۔ یہ اسی لئے تھا کہ ایمان اپنی تمام تر لذتوں اور حلاوتوں کے ساتھ ان کے قلوب میں داخل ہو چکا تھا۔

(ماں، باپ، بھائی، بہن، اعزّہ و اقارب اور اہل و عیال کے تعلقات کتنے مستحکم ہوتے ہیں۔ یہی اعزّہ غربت و افلاس کے عالم میں دست گیری کرتے ہیں۔ مصیبت کے عالم میں تسکین دیتے اور عیش و عشرت کے لمحات میں لطفِ زندگی بڑھاتے ہیں، لیکن اگر کوئی ایسا موقع آتا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ مقدس رشتے بھی توڑنے پڑتے تو حضراتِ صحابہ بے تکلّف توڑ دیتے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لائے تو ان کی والدہ نے قسم کھالی کہ جب تک وہ اسلام نہ چھوڑیں گے وہ ان سے بات چیت نہ کریں گی، نہ کھانا کھائیں گی نہ پانی پئیں گی۔ انہوں نے اپنی یہ قسم پوری بھی کی یہاں تک کہ تیسرے دن بے ہوش ہو گئیں۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ماں بہت عزیز تھیں اور وہ ہلاکت کے قریب تھیں۔ مگر حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اس کا مطلق اثر نہ پڑا اور انہوں نے اپنی ماں سے کُھلم کُھلا کہہ دیا تھا کہ ماں! اگر تمہارے بدن میں ہزار جانیں بھی ہوں اور ایک ایک کر کے تمہاری ہر جان نکل جائے جب بھی میں اپنے اس دین کو نہیں چھوڑوں گا جسے بہت سوچ سمجھ کر میں نے قبول کیا ہے۔ ماں! تمہاری محبت میرے دل میں ضرور ہے لیکن الحمد للہ کہ وہ محبت

اللہ تعالیٰ کی محبت پر غالب نہیں۔

تقدیر

چاند سُورج تو چاند سُورج اس وقت تو بارگاہِ خداوندی کے مقرب ترین فرشتے بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقدر پر رشک کر رہے ہوں گے جب کہ ایک اونٹنی پر آگے سیّد الکونین صاحب المعراج صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور آپ کے پیچھے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکارؐ کی پشت مبارک کا سہارا لئے ہوئے بیٹھے تھے۔ قسمت والوں ہی کو اتنا قُرب نصیب ہوتا ہے۔ عین اس عالم میں سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے پیار سے ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی طرف متوجہ کراتے ہوئے ارشاد فرمایا بچے! آج میں تجھے چند اہم باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ارشاد فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سُن، تو اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی حدود و حقوق کی حفاظت کر وہ تیری حفاظت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض عائد کئے ہیں انہیں ادا کرتا رہ۔ جن باتوں سے منع فرمایا ہے اُن سے بچتا رہ تو اسے ہر آڑے وقت میں اپنے سامنے پائے گا۔ آرام و راحت کی حالت میں اسے یاد کرتا رہ، تکلیف اور شدت کے وقت میں وہ تجھے یاد کرے گا۔ یاد رکھ کہ جب بھی تو صبر کرے گا تجھے غیبی مدد ملے گی۔ ہر طرح کی تکلیف کے بعد راحت کا دروازہ کھلتا ہے اور ہر تنگی کے بعد آسانی آتی ہے۔

(ایک بات اور یاد رکھ، جب بھی کچھ مانگنا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے مانگا کر۔ مدد طلب کرتے وقت صرف اسی سے مدد طلب کرنا اور اس بات پر پُوری طرح یقین کر لے کہ اگر سارے لوگ مجتمع ہو کر تجھے نفع پہنچانا چاہیں تو اتنا ہی نفع پہنچا سکتے ہیں جتنا کہ کاتبِ تقدیر نے تیرے مقدّر میں لکھ دیا ہے اور ساری دنیا اگر مل کر تجھے نقصان پہنچانا چاہے تو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی جتنا کہ تیرے مقدر میں لکھا جا چکا ہے، جو کچھ لکھنا تھا قلم لکھ چکا ہے اور قلمِ تقدیر خشک ہو چکا)

اب کسی کی طاقت نہیں کہ اس میں گھٹا یا بڑھا سکے۔ توجہ کا مرکز صرف اس ذاتِ واحد کو بنا کہ حیات و موت، نفع و نقصان، کامیابی یا ناکامی کا صرف اور صرف وہی مالک ہے۔ اُونٹنی محوِ خرام تھی اور توحید کے نور کا دریا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے میں موج در موج منتقل ہو رہا تھا۔

رحمتِ ایزدی کی اُمّید

شیخ بو علی شفیق بن ابراہیم ازدیؒ جیسے علامۃ الدہر اور شیخ المشائخ بھی ایک عام بوڑھے کا جواب سُن کر حیرت میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب بوڑھے سے کہیں تو کیا کہیں۔ علم و فہم کسی کی میراث تو نہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اور جب چاہے عطا کر دے۔ بعض اوقات تو ایک عام سا آدمی ایسی باتیں کہہ دیتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہی صورتِ حال اس وقت پیش آئی جب شیخ المشائخ حضرت بو علی شفیق بن ابراہیم ازدی رحمۃ اللہ علیہ اپنے طالبین و مسترشدین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ایک بوڑھا انسان آیا اور ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ شیخ کی نگاہ پڑی تو بوڑھے کو اپنے پاس بُلایا اور دریافت کیا۔ بابا! کس غرض سے آئے ہو؟ شیخ کا سوال سُن کر بوڑھا آبدیدہ ہو گیا اور عرض کی، حضرت! میں بہت گنہ گار ہوں۔ زندگی کی شام آ چکی ہے نہ جانے کب چراغِ حیات گُل ہو جائے۔ آپ کا نام اور شہرہ سُن کر توبہ کرنے حاضر ہوا ہوں۔ مجھے توبہ کرا دیجیے، شاید اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول کرے! اور میری مغفرت ہو جائے۔ شیخ شفیقؒ نے بوڑھے کے وجود پر نگاہ دوڑائی۔ اسّی پچاسی سال کا بوڑھا، قویٰ مضمحل، اعصاب کمزور، جسمانی طاقتیں یا تو جواب دے چکی تھیں یا جواب دینے والی ہیں۔ شیخؒ نے دل میں سوچا۔ اب بے چارہ راہِ سلوک کیسے طے کرے گا اس میں ریاضت و مجاہدے کی بھی طاقت نہیں۔ بالکل چراغِ سحری ہے، ذکر اذکار کی تعلیم دوں تو بھی کیا فائدہ۔ یہ بے چارہ تو معمولات بھی پورے نہ کر سکے گا۔ غور کرتے رہے اور کسی قدر تامّل کے بعد فرمایا، بابا! بہت دیر سے آئے ہو۔ تمہاری عمر

کا پیمانہ تو لبریز ہونے کے قریب ہے۔ شیخ کا جواب سُن کر بوڑھا تلملا اٹھا۔ بیم و رجا کی سی کیفیت اس پر طاری ہو گئی مگر سنبھل گیا اور بولا۔ نہیں شیخ میں بہت جلد آگیا ہوں شیخ شفیق ازدی رحمۃ اللہ علیہ نے حیران ہو کر پوچھا وہ کیسے ؟ اور جو جواب بوڑھے نے دیا اسے سُن کر تو لگا جیسے شیخ پر وجد طاری ہو جائے گا۔ بوڑھے نے کہا، شیخ ! جو شخص موت سے پہلے آجائے وہ جلدی آنے والا ہے اگرچہ کتنی ہی دیر لگا کر آیا ہو۔ یاس اگر آس پر، نا امیدی اگر اُمید پر اور خوف اگر رجا پر غالب آجائے تو توحید میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ میرا ربّ غفور الرّحیم ہے۔ توبہ کو قبول کرنے والا اور بے سہاروں کو سہارا دینے والا ہے۔ حضرت شفیقؒ دم بخود بیٹھے تھے اور بوڑھا کہے چلا جا رہا تھا، اور غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ انسان چاہے کتنا بڑا گناہ گار و سیاہ کار ہو۔ خواہ اس کے جسم کا رُونگٹا رونگٹا معصیّت اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی غلاظت میں آلودہ ہو لیکن وہ غفّار الذّنوب و ستّار العیوب ایسی بخشش و مغفرت والا ہے کہ موت سے قبل زندگی کی کسی بھی ساعت میں بندہ اپنے مولا کے حضور ندامت و شرمندگی کے آنسو اپنی آنکھوں میں سجائے اپنی جبینِ نیاز اس کی بارگاہ میں جُھکا دے۔ یقین کر دکہ مولا اسے سنبھال لے گا، کیونکہ چاہے وہ جیسا بھی ہے اس کی تخلیق ہے، اس کی تیار کردہ تصویر ہے۔ اس کا بنایا ہوا بندہ ہے۔

دفترِ رُبُوبیّت

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ جن قوموں نے اللہ تعالےٰ کی آیات کو جھٹلایا ان کا کیا حشر ہوا۔ اس حکم کے تحت سابقہ اُمتوں کا ایک راہب بھی زمین کی سیاحت کرتا تھا۔ مگر پہاڑوں پر چڑھتے اترنے اور سنگلاخ وادیوں سے گزرنے میں اسے بڑی تکلیف ہوتی۔ ایک دن نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ تخلیقِ خداوندی پر اعتراض کر دیا کہ بارِ الٰہ اگر تُو نے پہاڑ نہ بنائے ہوتے تو ہم کتنے آرام سے سفر کرتے اور آج جن پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں ان سے محفوظ رہتے۔

پہاڑ بنا کر تو تُو نے ہمیں مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ اتنا کہنا تھا کہ اس کے علاقے کے نبی کو وحی ہوئی کہ آپ اُس راہب سے کہہ دیں کہ تُو نے چونکہ میری تخلیق پر اعتراض کیا ہے اور میری تخلیق پر اعتراض، اللہ کے دوستوں کا نہیں دشمنوں کا کام ہے اس لئے میں نے تیرا نام دوستوں کے دفتر سے کاٹ کر دشمنوں اور جہنّمیوں کے دفتر میں درج کر دیا ہے۔ نبی نے جب یہ پیغام اس راہب کو پہنچایا تو وہ سجدے میں گر کر تسبیح و تہلیل کرنے لگا۔ نبی کو سخت تعجب ہوا کہ یہ موقع تو سجدۂ شکر بجالانے کا نہیں ہے یہ وقت تو غمزدہ ہونے اور پشیمان ہونے کا ہے اور یہ اللہ کا بندہ غمزدہ ہونے کے بجائے سجدۂ شکر ادا کر رہا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس پاک نبی نے درویش سے اس کا سبب دریافت کیا۔ درویش نے عرض کیا اللہ کے نبی! آپ کا خیال بالکل درست ہے کہ مجھے غمگین ہونا چاہیئے تھا مگر میں سجدۂ شکر اس بات پر ادا نہیں کر رہا کہ میرا نام دوستوں کے دفتر سے کاٹ کر دشمنوں اور جہنّمیوں کے دفتر میں لکھ دیا گیا۔ میں نے تو یہ سجدۂ شکر اس بات پر ادا کیا ہے کہ چاہے کسی بھی دفتر میں میرا نام لکھا گیا کم از کم میرے ربّ کے دفتر میں میرا نام تو لکھا گیا ہے۔ یہی اعزاز میرے لئے کیا کم ہے کہ میرے ربّ نے مجھے یاد رکھا ہے؟ اب آپ میرے ربّ سے اتنی التجا کر دیں کہ جہنّم میں ڈالتے وقت میرے جسم کو اتنا بڑا کر دے کہ سارا جہنّم صرف میرے وجود سے بھر جائے اور دوسرے اس میں داخل ہی نہ کئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ اس درویش کو کہہ دیں کہ انسانیّت کے ساتھ اس محبّت کی وجہ سے اس کا ہر قصور معاف کیا جاتا ہے کہ انسانیت کی محبّت سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔

حضرت ابراہیمؑ اور ایک مجوسی مہمان

ابراہیم علیہ السلام کی عادت تھی کہ جب تک اپنے دسترخوان پر کسی مہمان کو نہ بٹھا لیتے کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اکثر صبح اور شام کے وقت وہ شہر کے دروازے پر جا کر بیٹھ رہتے کہ کوئی مسافر مل جائے تو اسے اپنا مہمان بنائیں۔ اتفاق سے ایک دن

کوئی مہمان نہ ملا اور شام کا جھٹپٹا وقت شروع ہونے لگا۔ سیّدنا ابراہیم علیٰ نبیّنا و علیہ السلام بہت دل گیر و ملول بیٹھے ہوئے تھے اور اب واپسی کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک بوڑھے کو دیکھا کہ لاٹھی ٹیکتا چلا آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُمّید بندھی کہ شاید یہ مسافر ہو اور میرا مہمان بننا منظور کر لے لپک کر اس کے پاس گئے اور سہارا دے کر اسے اپنے قریب لائے۔ حسبِ عادت سب سے پہلے اس کا نام دریافت کیا اور پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ بوڑھے نے جو اپنا نام بتایا تو ابراہیم علیہ السلام کی ساری اُمّیدوں پر پانی پھر گیا۔ کیونکہ نام سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بوڑھا آتش پرست ہے۔ بھلا خدا کے خلیل کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ ایک ایسے شخص کو اپنا مہمان بنائے اور اپنے دستر خوان پر جگہ دے جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آگ کا پُجاری تھا توحید تو جناب ابراہیمؑ کی رگ رگ میں پیوست تھی۔ اپنے ربّ کی خاطر تو ابراہیمؑ آگ کے الاؤ میں بے خطر کُود چکے تھے۔ محض ایک خواب دیکھ کر ابراہیمؑ نے تو اپنے اکلوتے بیٹے جناب اسماعیلؑ کے حلقوم پر چھری چلا دی تھی۔ وہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ایک مشرک کے میزبان بنیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بوڑھے کی طرف سے رُخ موڑ لیا۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ بے چارہ ستّر سالہ آتش پرست کہاں جاتا، کس کے ہاں قیام کرتا بڑا ہی فکر مند بیٹھا تھا۔ آخر ہمّت کر کے حرفِ مطلب زبان پر لایا اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے درخواست کی کہ آپ مجھے اپنا مہمان بنا لیں۔ ابراہیم علیہ السّلام معمولی آدمی نہیں تھے دینِ حنیف کے بانی، شرک و بُت پرستی کے سخت دشمن، صاف جواب دے دیا۔ میں نبی ہوں ایک مشرک کو اپنی پاک روٹی نہیں کھلا سکتا۔ البتہ اگر تُو اسلام قبول کر لے آتش پرستی سے توبہ کر لے تو ایک دن کیا ساری زندگی تیری خدمت کرنے کو تیار ہوں بُوڑھا خاموش رہ گیا اور دوسری طرف چل پڑا۔ اب رات آ چکی تھی۔ اس لئے خلیلُ اللہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام بھی اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئے ابھی دو چار قدم ہی چلے ہوں گے کہ وحی نازل ہوئی۔

ابراہیم! تم اس بوڑھے مجوسی کو ایک وقت بھی نہ کھلا سکے اور کھلانے کے عوض

اس سے دین کو بدلنے کا مطالبہ کر دیا۔ مجھے دیکھو کہ میں ستّر برس سے اس کے شرک و کفر، بغاوت و طغیان کے باوجود اس کی پرورش کر رہا ہوں۔ اس کی ہر ضرورت کو پورا کرتا ہوں وہ مجھے چھوڑ کر آگ کے آگے سجدہ کرتا اور اس کے حضور دستِ دُعا کرتا ہے ایک اپنا ظرف دیکھو اور ایک میرا ظرف وحی آتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام پلٹ پڑے اور اس بوڑھے کو جا لیا۔ کہا! جناب چلیے میں آپ کی میزبانی کے لئے تیار ہوں۔ آپ میرے مکان پر قیام فرمایئے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ وہ بوڑھا مجوسی حیران ہو گیا کہ انہوں نے اتنی جلدی اپنا فیصلہ کیوں واپس لے لیا؟ ابھی تو کہہ رہے تھے اسلام قبول کر لو تو اپنا مہمان بناؤں گا، اور ابھی مجھے لینے چلے آئے۔ پوچھا سچ سچ بتایئے آپ نے انکار کے بعد اپنی رائے کیوں بدل دی۔ ابراہیم علیہ السلام نے وحی آنے کا سارا قصہ کہہ سنایا۔

مجوسی کی آنکھیں بہنے لگیں، ندامت سے سر جھکا دیا۔ کہا، اللہ کے نبی! میں خُدا کا باغی، میں آگ کا پجاری، میں اس کے دَر کو چھوڑ کر دَربدر کی ٹھوکریں کھانے والا میں رسم و رواج کا اسیر، میں جھوٹے توّہمات کا قیدی حقیقی مالک کو ستّر برس سے بُھلا کر بھٹک رہا ہوں۔ میں نے اسے کبھی بھی یاد نہیں کیا، اسے کبھی بھی نہیں پکارا۔ مگر میرا مالک مجھ سے غافل نہیں رہا۔ اس نے مجھے میری نافرمانیوں کے باعث کبھی بھی اپنے خوانِ نعمت سے نہیں اٹھایا۔ میری پرورش کی مجھے سہارا دیا حتےٰ کہ آپ کو تنبیہہ کی۔

ہاتھ بڑھایئے، مجھے قبول کر لیجیے، اس ستّر برس کے گنہ گار بھگوڑے کو اس کے مالک کے آستانے پر حاضر کیجیے، جلدی کیجیے، مجھے اسلام کا کلمہ پڑھایئے۔ میرا مالک غفورُالرحیم ہے وہ مجھے ضرور قبول کر لے گا۔

قرآن و سُنّت

بخار کی شدت میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا اور آپ ہر لمحہ الرفیق الاعلیٰ

کی طرف متوجہ ہوتے جا رہے تھے۔ ضعف اس قدر غالب آ گیا تھا کہ آپؐ نے حکم فرمایا کہ ابوبکر صدیقؓ لوگوں کو نماز پڑھائیں ــــ ایسے وقت میں لوگ بال بچوں کا فکر کرتے ہیں۔ کسی کو فکرِ آخرت لاحق ہوتی ہے۔ مگر سیّد العرب والعجم نبی الحرمین خاتم المرسلین ﷺ کو اُمّت کی فکر دامن گیر ہے۔ فرمایا۔ لوگو! میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہے تو کبھی بھی گمراہ نہ ہو گے۔ حاضرین سارے کے سارے دم بخود ہو کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ لوگو! سنو میں تمہارے درمیان اللہ کی کتاب اور اپنی سُنّت کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ہر دور میں ان دونوں چیزوں کو پیشِ نظر رکھنا، تم کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کا مطلب یہی ہے کہ زندگی کے تمام مسائل کا حل ہر زمانے اور ہر دور میں صرف قرآن و سُنّت میں تلاش کیا جائے۔ اگر اختلاف ہو تو قرآن و سُنّت کی طرف رجوع کیا جائے اور اگر کوئی الجھن یا پیچیدگی پیدا ہو جائے تو قرآن و سُنّت ہی کے ناخنِ تدبیر سے گرہ کشائی کی جائے ــــ سابقہ اُمّتوں کا یہ حال تھا کہ جب وہ حق کو بھلا دیتیں تو ان کی اصلاح و ہدایت کے لئے دوسرے نبی آتے تھے جو بدعات و خرافات کے جھاڑ جھنکاڑ کو ہٹا کر صلاح و ہدایت کے راستے کو صاف کر دیا کرتے، لیکن خاتم النبیّین ﷺ کی اُمّت کے لئے یہ راستہ تا قیامت بند ہے۔ اب تو اصلاح اور حق کی جستجو اس اُمّت کا اجتماعی فریضہ ہے جسے بہر حال اسے ادا کرنا ہے، ظاہر ہے کہ فرقہ وارانہ نظریات اور ذاتی و گروہی مفادات کی موجودگی میں یہ فرض انجام نہیں دیا جا سکتا اور افسوس کہ آج اُمّت فرقہ واریت اور مفادات پرستی کی بندشوں میں اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ حق کا نور نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ یہ صورتِ حال سخت خطرناک ہے اور آج بھی اس کا علاج سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ چھوٹے موٹے گروہی اختلافات اور جزوی و فروعی مسائل میں الجھنے کے بجائے قرآن و سُنّت کے ان مستحکم ستونوں کو تھام لیا جائے جن سے تمسک کرنے کی ہمارے آقا و مولیٰ ﷺ نے

وفات کے وقت وصیّت فرمائی۔"

اِتّباعِ سُنّت

تقریباً دو ماہ کے طویل قیام کے بعد جب مہمان خانقاہ سے رخصت ہونے لگا تو حسبِ عادت حضرت جُنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اسے رخصت کرنے کے لئے بنفسِ نفیس اس کے کمرے میں تشریف لائے اور ہر چند کہ مہمان بار بار منع کر رہا تھا سامان باندھنے اور اس کی سواری کے لئے چارہ پانی کا بندوبست کرنے میں اس کی مدد فرمانے لگے۔ مہمان حیران تھا کہ آخر یہ لوگ کس مزاج اور کس طبیعت کے لوگ ہیں — سیّد الطائفہ کہے جاتے ہیں۔ شرق و غرب میں ان کی شہرت ہے۔ لاکھوں انسان ان کے مُرید و معتقد ہیں کہ چشم و ابرو کے معمولی سے اشارے پر اپنی قیمتی سے قیمتی متاع لٹا دیں اور یہ خاکساری و انکساری کے ایسے پیکر کہ میرے جیسے معمولی انسان کی حاجت براری و خدمت گزاری کو باعثِ فخر اور فرضِ اوّلین تصوّر کر رہے ہیں۔ سامان تیار ہو گیا اور سواری بھی۔ اب وقتِ رخصت آن پہنچا۔ مصافحے اور معانقے کی باری آئی تو حضرت جُنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے مہمان سے دریافت فرمایا کہ "آپ اتنے دن یہاں رہے لیکن آپ نے کچھ نہیں بتلایا کہ آپ کس غرض سے یہاں آئے تھے اور اب کیوں واپس جا رہے ہیں؟ حضرت جنید بُغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سوال سُن کر مہمان بہت سٹپٹایا اگر حقیقت بتلا دے تو اندیشہ تھا کہ جنید بُغدادی رحمۃ اللہ علیہ ملول و دل گیر ہوں گے اور نہ بتلائے تو کتمانِ حق ہوگا جو اہلِ حق کے نزدیک روا نہیں ہے۔ گہری سوچ میں پڑ گیا اس کی دلی کیفیت کو بھانپ کر حضرت جُنید بُغدادیؒ نے فرمایا: میرے عزیز! گھبرانے یا شرمانے کی ضرورت نہیں جو کچھ تمہیں کہنا ہو صاف صاف کہو۔ ہم لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں کبھی ایسی ویسی بات کا بُرا نہیں مناتے۔ حضرت جُنید بغدادیؒ کے ہمت دلانے سے رُخصت ہونے والے مہمان میں کسی قدر جرأت پیدا ہوئی اور شرماتے شرماتے وہ کہنے لگا حضرت! گستاخی معاف، میں دُور دراز علاقے کا رہنے والا

ہوں دراصل میں یہ سُن کر آیا تھا کہ آپ بڑے صاحب کرامت و ولایت بزرگ ہیں۔
مگر میں افسوس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اتنے دن میں آپ کے پاس رہا لیکن
میں نے تو کوئی کرامت دیکھی نہ ولایت۔ اس لئے ناامید ہو کر اب واپس جا رہا ہوں
جُنید بغدادیؒ مسکرائے اور فرمایا۔ میرے دوست! ایک بات بتلاؤ، تم اتنے دن
میرے ساتھ رہے۔ اتنے دنوں میں تم نے میرا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسولِ اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے خلاف دیکھا ہے؟ مہمان نے کمال سادگی سے جواب
دیا۔ حضرت! یہ تو آپ درست فرما رہے ہیں۔ ایسی کوئی چیز تو میں نے نہیں دیکھی ہے۔
حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ بھائی! یہی میری ولایت اور یہی میری
کرامت ہے۔ میرے طریق کی رُوح، منتہائے مقصود اور سب کچھ یہی ہے کہ بندے
کا کوئی قدم مولا کے حکم کے خلاف نہ اُٹھے اور زندگی کا ہر لمحہ اس کی یاد میں بسر ہو جائے
ہَوا میں اڑنا اور پانی پر دَوڑنا کرامت نہیں ہے کہ مکھی بھی ہَوا میں اُڑتی ہے اور مچھلی
بھی پانی میں دَوڑتی پھرتی ہے۔ اصل کرامت اور اصل ولایت تو یہی ہے کہ کوئی عمل
سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے خلاف نہ ہو سُنّت ہی جادۂ مستقیم ہے۔
سُنّت ہی راہِ نجات اور اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا قریب ترین راستہ۔ یاد رکھو
پیغمبر کی ذات بابرکات منارۂ نور ہے۔ اسی کی روشنی میں سفرِ حیات
طے کرنے کے بعد تم منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہو، باقی سب ہیچ اور بے حقیقت ہے۔

محبّتِ رسولؐ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت جزوِ ایمان بلکہ عین ایمان ہے۔ اسی لئے آپؐ
نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارا ایمان اُس وقت تک درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب
تک میں تمہارے نزدیک تمہاری اولاد والدین اور سارے جہان سے زیادہ عزیز
نہ بن جاؤں۔ آپؐ سے محبّت رکھنے کا یہ جو حکم دیا گیا ہے اس کی مصلحت یہ ہے کہ
محبت ہی سے اتباع اور پیروی کا جذبہ ابھرتا ہے جو اصل مقصود ہے جس طرح ضروری

ہے کہ ہر دعوے کا کوئی ثبوت ہو اور کوئی دعویٰ بلا دلیل و ثبوت کے قبول نہیں کیا جاتا اسی طرح حضور ﷺ کی محبت کے دعوے کا ثبوت آپؐ کی پیروی آپؐ کے احکام کی تعمیل اور آپؐ کی مکمل اتّباع ہے۔ چلنے میں پھرنے میں، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے میں، اخلاقیات میں، معاملات میں، سیاسیات میں، معاشیات میں، خلوت میں، جلوت میں، بیرونی زندگی میں اور گھریلو زندگی میں غرضیکہ زندگی کے ہر ہر عمل میں، ہر ہر حرکت اور سکون میں ہر ہر لحظے اور لمحے میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ اور آپؐ کے معمولات و تعلیمات کو پیشِ نظر رکھا جائے اگر یہ نہ ہو تو محض زبانی و کلامی محبت بارگاہِ نبوّت میں لائقِ اعتنا نہیں۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں دونوں چیزیں موجود تھیں۔ محبّت بھی اور اتّباع بھی۔ محبّت ایسی کہ اس کی مثال پیش کرنے سے تاریخِ عالم قاصر ہے اور اتّباع ایسی کہ ان میں کا ہر فرد پوری طرح سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰت کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وادیٔ بطحا سے عشق والوں کا یہ قافلہ جادہ پیما ہوا سہل و جبل اور کوہ و دمن نے ان کا استقبال کیا اور دیدہ و دل فرشِ راہ کئے۔ انہوں نے نبیٔ اکرم ﷺ پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور کسی صلے کی تمنّا کی نہ کسی منصب کی آرزو۔ انسانی رشتے کہاں نہیں ہوتے، ان کے یہاں بھی تھے۔ مگر سارے رشتے ناطے نبوّت کے مقابلے میں ہیچ تھے۔ ان کے قلوب و اذہان نورِ نبوّت سے مستنیر تھے اور آپؐ کی محبّت تمام محبّتوں پر غالب۔ معرکۂ اُحد میں سردارِ انبیاء ﷺ زخمی ہو گئے تھے اور کفّار نے افواہ اڑا دی کہ آپؐ شہید ہو گئے ہیں۔ ایک انصاری عورت آپؐ کی خیریت دریافت کرنے کے لئے اُحد کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ اس کا باپ، اس کا شوہر اور اس کا بھائی سب غزوۂ اُحد میں لڑنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ شام ہو رہی تھی اور مجاہدینِ اُحد سے واپس آ رہے تھے۔ اس نے ایک مجاہد سے دریافت کیا کَیفَ رسولُ اللہ ﷺ — یہ تو بتاؤ کہ حضورؐ کیسے ہیں۔ مجاہد نے جواب دیا۔ تیرا باپ شہید ہو گیا۔ اس نے کہا مجھے بتاؤ کہ حضورؐ کیسے ہیں؟ دوسرے

مجاہد نے خبر دی کہ تیرا بھائی شہید ہو گیا۔ تیسرے نے بتلایا کہ تو بیوہ ہو گئی، تیرا شوہر مقامِ شہادت پر فائز ہو گیا۔ مگر اس پیکرِ وفا کا صرف ایک ہی سوال تھا۔ کیف رسول اللہ ﷺ لوگو! مجھے اتنا تو بتاؤ کہ حضور کیسے ہیں۔ باپ چھن گیا یتیم ہو گئی۔ بھائی چلا گیا قوتِ بازو سے محروم ہو گئی، شوہر رخصت ہو گیا بے سایہ و بے آسرا ہو گئی۔ یہ سب منظور، مجھے تو میرے مولا کی خیریت بتلاؤ۔ کسی نے کہا کہ آپ صحیح و سلامت ہیں۔ مگر اس کے دل کو قرار نہ آیا بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ کوکبۂ نبوی نمودار ہوا۔ آقائے نامدار ﷺ کو جلوہ افروز دیکھا تو ہر غم کو فراموش کر کے کہا کل مصیبة بعدك جلل "یا رسول اللہ" یا رسول اللہ! آپ کے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں، ہیچ ہیں۔

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہِ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی علامات

حضور ﷺ سے محبت اصل ایمان ہے۔ لیکن زبانی کلامی دعوائے محبت قابلِ قبول نہیں، بلکہ آپ کی محبت میں سچا وہ شخص ہے جس میں آپ سے صحیح محبت کی علامتیں پائی جائیں۔ آپ کی محبت کی سب سے پہلی اور سب سے اہم علامت یہ ہے کہ مومن آپ کی پیروی کرے اور آپ کی سنت پر عامل ہو۔ آپ کے اقوال و اعمال میں آپ کی اتباع کرے۔ آپ کے احکام بجالائے اور ان چیزوں سے پرہیز کرے جن سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ تنگی، فراخی، خوشی اور غم ہر حالت میں وہی ادب اختیار کرے جس کی آپ نے تعلیم دی ہے۔ دوسری علامت یہ ہے کہ اپنے نفس کی خواہشات پر ان باتوں کو ترجیح دے جن کا آپ نے حکم فرمایا ہے۔ تیسری علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بندوں کی ناراضگی کی پروا نہ کی جائے۔ آپ کی محبت کی چوتھی علامت کثرت سے آپ کا ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ

جو شخص جس چیز سے محبّت رکھتا ہے اس کا ذکر بھی کرتا ہے اور آپؐ کے ذکرِ مبارک کا سب سے بہترین طریقہ کثرت سے آپؐ پر درُود پڑھتا ہے۔ پانچویں علامت یہ ہے کہ آپؐ کا ذکر کرتے وقت آدمی عاجزی وانکساری اور انتہائی ادب کا اظہار کرے کہ آپؐ کی بارگاہ ادب کی بارگاہ ہے۔ آپؐ کی محبّت کی چھٹی علامت یہ ہے کہ آپؐ کی محبّت کی وجہ سے آپؐ کے اہلِ بیت اطہار اور آپؐ کے مہاجرو انصار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بھی محبت کرے کیونکہ جو کسی سے محبّت کرتا ہے وہ اس سے بھی محبّت کرتا ہے جو اس کے محبُوب کو عزیز ہوں چنانچہ سلف صالحین رحمہم اللہ کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر اس شخص اور چیز کو عزیز رکھتے تھے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبّت فرماتے تھے۔ آپؐ سے محبّت کی ساتویں علامت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو عزیز رکھے جسے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور جس کے ذریعہ سے آپؐ نے لوگوں کو راہِ ہدایت دکھائی۔ آٹھویں علامت یہ ہے کہ آپؐ کی اُمّت پر شفقت کرے۔ اس کا ہر حال میں خیر خواہ رہے آپؐ کی محبّت کا کمال یہ ہے کہ اس کا دعویٰ کرنے والا دُنیا سے دل نہ لگائے اور فقیرانہ صفات کا حامل ہو۔

محبّتِ رسُولؐ

مکّہ معظمہ سے آپؐ کی روانگی کی خبر مدینہ منوّرہ پہنچ چکی تھی۔ مشتاقانِ دید بصد ذوق وشوق مدینہ سے نکل کر صبح ہی سے مقامِ حرہ پر آ کر کھڑے ہو جاتے اور جب دوپہر کا وقت ہو جاتا تو اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے۔ انتظار کرنے والوں میں یثرب کے سردار تھے۔ اُمراء اور رؤسا تھے اور ان کے ساتھ ہی کنارے میں ایک غریب بھی کھڑا رہتا۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے خیالات میں گم۔ اس کے دل میں صرف ایک آرزو مچل رہی تھی کہ جسے اللہ تعالیٰ نے شمعِ ہدایت بنا کر سارے عالم کی طرف مبعوث کیا ہے، ایک لمحے کے لئے سہی، اُس کی کٹیا میں قدم رنجہ فرما دے کہ

اس کے نصیب جاگ اُٹھیں۔ پھر سوچتا میں کیسا نادان ہوں۔ نہ یثرب کا سردار ہوں نہ سابق الایمان۔ بھلا وہ تشریف لائیں گے تو میرے یہاں کیوں آئیں گے۔ ایک دن حرہ کے مقام پر اسی ادھیڑ بن میں کھڑا تھا اور اب مایوس ہو کر لوٹنے ہی والا تھا کہ ایک یہودی نے ٹیلہ پر سے کوکبۂ نبوّت کو رونق افروز ہوتے دیکھا چہرہ ماہِ مبیں سارا جسم رنگ و نور کا مُرقّع پہچان گیا کہ یہ وہی ہیں جن کا اہلِ یثرب انتظار کر رہے تھے۔ بے اختیار پکار اُٹھا، اے اہلِ یثرب تمہارا بخت مبارک اور سامان خوش نصیبی آن پہنچا ؂

اینک آں سرو خراماں می رسد
اینک آں گلبرگِ خنداں لی رسد

اس خبر کا کانوں میں پڑنا تھا کہ انصار والہانہ و بے تابانہ دوڑ پڑے اور نعرۂ تکبیر سے ساری وادی گونج اٹھی۔ مدینہ منوّرہ سے تین میل کے فاصلے پر قبا کے گاؤں میں آپؐ نے چند روز قیام فرمایا اور جمعہ کے دن مدینہ منوّرہ کا ارادہ فرمایا۔ ہر شخص کی تمنّا اور آرزو تھی کہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں قیام فرمائیں۔ ہر طرف سے یہی عاشقانہ و والہانہ استدعا تھی کہ یا رسول اللہ علیک میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ آپؐ ان کو دُعا دیتے اور فرماتے یہ ناقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے، جہاں اللہ تعالیٰ کے حُکم سے بیٹھ جائے گی وہیں قیام کروں گا۔ آپؐ نے لگام کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ بنو نجّار کی بچیاں خوشی کے ترانے گا رہی تھیں اور بدرِ کامل مدینہ میں طلوع ہو رہا تھا۔ ناقہ خود بخود اس مقام پر گئی جہاں اس وقت مسجدِ نبویؐ کا دروازہ ہے مگر آپؐ ناقہ سے نہ اُترے۔ تھوڑی دیر کے بعد ناقہ اُٹھی اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے دروازے پر جا کر بیٹھ گئی اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ سے اُتر پڑے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تو شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی کہ

وہ آئے گھر پہ ہمارے خُدا کی قدرت ہے۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

آپؐ کا سامان اٹھایا اور گھر میں لے گئے۔ سرکارؐ سے عرض کیا آپؐ مکان کے

بالائی حصّے میں قیام فرمائیں ہم لوگ نچلی منزل میں رہیں گے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں مجھ سے ملنے کے لئے لوگ آتے رہیں گے۔ تمہارے اہلِ خانہ کو تکلیف ہوگی اس لئے میں مکان کے نچلے ہی حصّے میں قیام کروں گا۔ سردیوں کے دن تھے۔ ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بالائی منزل میں مقیم تھے کہ پانی کا مٹکا ٹوٹ گیا۔ ابوایوبؓ نے سوچا کہیں پانی نچلی منزل میں نہ چلا جائے۔ جھٹ لحاف اٹھایا اور پانی پر ڈال دیا۔ میاں بیوی مل کر جلد جلد پانی جذب کرنے لگے۔ مگر گھر میں تو ایک ہی لحاف تھا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا اوڑھنا نہ تھا۔ سردی کی رات تھی۔ اہلِ خانہ نے رات بھر سردی میں ٹھٹھر نا گوارا کر لیا۔ مگر یہ پسند نہ کیا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی آپؐ کے بستر مبارک پر گر کر آپؐ کے لئے باعثِ تکلیف بن جائے کہ عشقِ نبویؐ کا تقاضا اور دُنیائے محبّت کا یہی آئین ہے۔

عشقِ رسُولؐ

قرآن کریم میں صریح حکم ہے کہ بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل نہ ہونا۔ اگر کسی کے گھر میں داخل ہونا ہو تو پہلے اجازت طلب کرو اور اجازت مل جائے تب داخل ہو اور اہلِ خانہ کو سلام کرو۔ اس معاملے میں اتنی احتیاط کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھر میں بھی داخل ہوتے وقت دروازہ پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جایا کرو اور کسی نہ کسی ذریعہ سے مستورات کو اندازہ ہو جانے دو کہ تم گھر میں آرہے ہو تاکہ مستورات اپنے کپڑے برابر کرلیں۔ اس کے بعد حکم دیا گیا کہ اپنے گھر میں داخل ہوکر سلام کیا کرو اگر ایسا کرو گے تو مکان میں افلاس نہیں آئے گا۔ عہدِ نبویؐ میں اجازت لینے کا نہایت خوب صورت طریقہ رائج تھا۔ جب کوئی آدمی کسی کے گھر جاتا تو دروازے کے دائیں یا بائیں جانب کھڑا ہوکر سلام کرتا۔ صاحبِ خانہ اگر گھر میں موجود ہوتا تو جواب دیتا ہوا اپنے مکان سے باہر نکلتا اور مہمان کو اندر لے جاتا۔ اگر تین مرتبہ سلام کرنے کے بعد مہمان جواب نہ سنتا تو یہ سمجھ کر کہ صاحبِ خانہ گھر میں موجود نہیں ہے اور شاید صرف

مستورات ہیں واپس ہو جاتا۔ ایک مرتبہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعدؓ سے ملاقات کرنے کی غرض سے ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور اسلامی آداب کے تحت آپؐ نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر السلام علیکم یا اہل البیت فرمایا۔ مکان میں حضرت سعدؓ اور ان کے صاحبزادے موجود تھے۔ لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا جواب نہیں سُنا تو آپؐ نے دوبارہ سلام کیا۔ اب حضرت سعدؓ کے صاحبزادے سے برداشت نہ ہو سکا۔ انہوں نے اپنے والد سے کہا۔ جناب آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام سُن رہے ہیں اور باہر نکل کر آپؐ کا استقبال کرتے ہیں نہ بآوازِ بلند جواب ہی دے رہے ہیں، یہ عجیب بات ہے۔ سعدؓ نے بیٹے سے کہا تم خاموش رہو۔ تیسری مرتبہ سلام کا جواب نہ پا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اصول و آداب کے تحت واپس لوٹنے لگے تو حضرت سعدؓ دوڑتے ہوئے باہر آئے اور آپؐ سے گھر میں تشریف لے جانے کے لئے درخواست کی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ "کیا تم نے میرے سلام کی آواز نہیں سُنی تھی؟" سعدؓ نے کہا "آقا! میں نے تینوں مرتبہ آپؐ کے سلام کی آواز سُنی اور تینوں مرتبہ پست آواز سے جواب بھی دیا تھا۔ بآوازِ بلند نہ جواب دیا نہ باہر آیا تاکہ آپؐ بار بار میرے اور میرے گھر والوں پر سلامتی کی دُعا فرمائیں اور یہ سعادت تین مرتبہ مجھے نصیب ہو جائے۔ آقا نے اپنے غلام کا یہ پاک اور مخلصانہ جذبہ دیکھا تو اس کی قدر فرمائی اور اپنے مبارک قدموں سے سعدؓ کے غربت کدے کو اوجِ ثریا بخش دیا۔

ابو خیثمہؓ اور محبّتِ نبویؐ

معرکہ تبوک کے لئے لشکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں روانہ ہو گیا۔ گرمی سخت تھی اور فصل تیار۔ منافقین نے عُذر معذرت کر کے جان چھڑالی اور گھر میں بیٹھے رہے۔ علامہ ابنِ کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے کہ نادانستہ طور پر حضرت ابو خیثمہؓ بھی پیچھے رہ گئے اور لشکر کے ساتھ شامل نہ ہو سکے۔ جب سورج ڈھلنے لگا

تو ابو خیثمہؓ گھر لوٹے دیکھا کہ ان کے باغ میں سایہ دار سائبان ہے۔ پانی کا چھڑکاؤ ہو چکا ہے۔ کھانا تیار ہے اور اہلِ خانہ اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔ درختوں کے جھنڈ میں واقع مکان، ٹھنڈا پانی، گرم کھانا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی ہے۔ اہلِ خانہ نے بڑھ کر استقبال کیا۔ مگر ابو خیثمہؓ دروازے کے باہر ہی ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اہلیہ نے کہا، آجائیے، باہر کیوں کھڑے ہو گئے؟ ابو خیثمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو لُو اور دھوپ میں سفر کر رہے ہیں، میں یہاں تم لوگوں کے ساتھ سائبان اور نخلستان میں بیٹھ کر عیش کروں۔ الوان نعمت کھاؤں اور ٹھنڈا پانی پیئوں؟ ناممکن، فوراً مڑے اور توشہ دان میں کھجوریں بھرنے لگے۔ بیوی نے کہا، اتنی جلدی بھی کیا ہے، کھانا تو کھالو۔ کہا نہیں ایک دانہ بھی نہیں کھاؤں گا، ایک لقمہ بھی نہیں توڑوں گا۔ عیش و آرام میرے اوپر اس وقت تک حرام ہے جب تک اپنے آقا کے قدموں میں نہ پہنچ جاؤں۔ کسی کی ایک نہ سُنی۔ سب کو ٹھکرا کر یہ جا اور وہ جا۔ لوگوں نے شمع کی طرف پروانے کو، چاند کی طرف چکور کو بھاگتے دیکھا ہو گا۔ لیکن یہ پروانۂ شمعِ محمدیؐ سب سے تیز رفتار، سب سے بیگانہ دیوانہ وار اپنے محبوبؐ کی سواری کا نقشِ قدم ڈھونڈتا ہوا بڑھتا رہا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کب دن آیا اور کب رات گئی۔ صحرائے عرب کی پنہائیاں تھیں اور وہ تھا۔ تاآنکہ اس قافلے کا سواد نظر آنے لگا جس میں اُس کا سرمایۂ حیات تھا، سواری کو اور تیز کر دیا۔ قافلے والوں نے جو دُور سے گرد اُڑاتے ہوئے ایک ناقہ سوار کو دیکھا تو کہنے لگے نہ جانے کون ہے کہ صبا رفتار چلا آ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نبیؐ ان پر لاکھوں صلوٰۃ و سلام نے فرمایا۔ خدا کرے ابو خیثمہؓ ہو، اور جب گرد چھٹی تو نبیؐ کا قول پورا ہوا۔ نبی کے قدموں میں بیٹھ کر ابو خیثمہؓ نے داستانِ سفر سنائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک ابو خیثمہؓ کے حق میں دُعا کے لئے دراز ہو گیا۔

ہر دو بمنزلے رواں ہر دو امیر کارواں
عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

ادبِ الٰہی کا صلہ

آج رات اس نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ قدموں میں لرزش تھی۔ ہوش وحواس درست نہ تھے، لڑکھڑاتا چلا جا رہا تھا۔ جو دیکھتا ایک نفرت انگیز نگاہ ڈالتا اور اپنی راہ لیتا۔ اس لئے کہ ملّتِ اسلامیہ کا ضمیر ہمیشہ سے شراب اور شرابیوں سے نفرت کرتا آیا ہے ــــ لوگ اسے حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے، مگر اس کو کیا کیجئے کہ اس کے سر پر ستارۂ اقبال مندی چمک رہا تھا اور ان حقارت آمیز نگاہوں کے پیچھے تقدیر کھڑی مسکرا رہی تھی، چلتے چلتے بشر حافی کی نگاہ اسی نشے کی حالت میں زمین پر پڑے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی جس پر بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھا تھا۔ بشر حافی اگرچہ نشے میں تھا لیکن رحمٰن ورحیم ربّ کے نام کی عزّت کا جذبہ اس کے دل میں موجود تھا۔ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اس کاغذ کے ٹکڑے کو اُٹھایا، اُسے بوسہ دیا اور موڑ کر جیب میں رکھ لیا کہ میرے مالک کا نام ہے اس کی توہین ہو رہی ہے اور پھر مے خانے میں داخل ہو گیا۔ رات بھر دَورِ جام چلتا رہا اور عین اسی وقت بغداد کے ایک ولی کو خواب میں یہ پیغام دیا جا رہا تھا کہ بشر حافی سے جا کر کہہ دو کہ تم نے میرے نام کو بلند کیا ہے۔ ہم نے تمہیں بلند کر دیا۔ تُم نے میرے نام کی تعظیم کی، مَیں نے تمہیں ہمیشہ کے لئے عزت بخش دی ہے۔ تُم نے ہمارے نام کو پاک کیا، ہم نے تمہیں گناہ کی آلائشوں سے پاک کر دیا۔ اللہ تعالےٰ کے ولی نے صبح کی نماز مسجد میں ادا کی اور سیدھے مے خانے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ ننگے سر، ننگے پیر بشر مے کدے سے نکل رہے تھے کہ دروازے پر ولی نے بشر کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ بشر کو ہوش آگیا۔ ولی کامل حضرت فتح موصلیؒ کا ہاتھ تھا اور توبہ کر کے طریقِ زُہد اختیار کیا۔ اُس دن سے بشر نے جُوتا پہننا چھوڑ دیا ننگے پَیر رہتے۔ اسی لئے انہیں حافی یعنی ننگے پَیر رہنے والا کہا جاتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ آپ جُوتے کیوں نہیں پہنتے، جواب دیا کہ مَیں توبہ کے وقت ننگے پَیر تھا۔ اب مجھے شرم آتی ہے کہ جُوتے پہنوں۔ اس طرح مجھے ہر وقت اپنی توبہ یاد رہتی ہے۔

بندے کی توبہ پر اللہ تعالیٰ کی خوشی

لق و دق صحرا میں ایک سوار چلا جا رہا ہے اس کی اونٹنی صبا رفتار اور خوش اطوار ہے، اس پر ایک چھاگل میں پانی رکھا ہوا ہے اور ایک توشہ دان میں ہفتوں کے لئے خوراک بھی محفوظ ہے۔ نہایت اطمینان سے سوار کا سفر جاری تھا کہ دھوپ تیز ہو گئی اور ریگستان جہنم زار بن گیا۔ تھوڑی دیر تک تو سوار دھوپ کی تمازت کا مقابلہ کرتا رہا لیکن آخر کار تھک گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس لق و دق صحرا کے ایک کنارے پر چند درخت ہیں۔ سایہ کی تلاش میں اس نے ادھر کا رُخ کیا اور ایک درخت کے سایہ میں بستہ جما لیا۔ سوچا کہ تھوڑی دیر آرام کر لوں جب ذرا دن ڈھلے گا تو سفر شروع کروں گا۔ اس نے اونٹنی کو اسی درخت سے باندھا اور لیٹ گیا۔ درخت کے سایہ میں تھکے ہارے مسافر کو اتنا آرام ملا کہ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ دیر تک پڑا سوتا رہا۔ نیند ہی کی حالت میں اس پر پیاس کا اتنا غلبہ ہوا کہ آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو صحرا میں آگ برس رہی ہے۔ اس خیال سے اُٹھا کہ اونٹنی پر سے چھاگل اُتار کر اپنی پیاس بجھائے۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ اونٹنی غائب ہے۔ اس نے دُور دراز تک ریگستان میں نگاہ دوڑائی لیکن اونٹنی کا نام و نشان نظر نہ آیا۔ وہ دیوانہ وار ریگستان میں اونٹنی کو تلاش کرنے لگا۔ اسے تلاش نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس وقت وہ اونٹنی ہی تو اس کا سرمایہ حیات تھی، اسی پر سوار ہو کر وہ سفر کر سکتا تھا، اسی اونٹنی پر اس کا زادِ راہ تھا۔ اگر اونٹنی غائب ہو جائے تو اس ویرانے میں سوائے موت کے اس کے لئے کوئی دوسری صورت نہیں تھی۔ سوار مغرب کی طرف دوڑتا، مشرق کی طرف گیا، جنوب و شمال کے کونے چھان مارے۔ لیکن اونٹنی نہ ملتی تھی نہ ملی۔ اس دوڑ دھوپ میں پیاس نے مزید شدت اختیار کر لی۔ اب تو اس کی زبان پر کانٹے پڑ گئے۔ حلق خشک، چہرہ سیاہ اور قدم میں لڑکھڑاہٹ، گرتا پڑتا درخت کے پاس آیا۔ دم لبوں پر ہے اور خیال کی نگاہ کے سامنے موت کا چہرہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اس کا دل یاس و حرماں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے لگا۔ زار و نزار سوار انتہائی نا اُمیدی کے عالم میں موت کا استقبال کرنے کے لئے لیٹ گیا آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ ہاتھ پیر سے جان نکلنے لگی تھی کہ یک بیک اسے

قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا تو جو اس نے دیکھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یا اللہ! میں یہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ آنکھیں بھیچ بھیچ کر دیکھنے لگا۔ مگر یہ خواب نہیں تھا۔ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اونٹنی توشہ دان اور چھاگل سمیت اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ سوار جب یاس کی بے کراں تاریکی سے بیک لحظہ مسرّت کی روشنی میں اور موت کی تاریک وادی سے حیات کے جگمگاتے اُجالے میں داخل ہوا تو وہ خوشی سے ایسا دیوانہ ہو گیا کہ اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے، کہنے لگا "اے میرے اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا ربّ ہوں" (نعوذ باللہ) حالانکہ اسے کہنا چاہیئے تھا کہ "اے میرے اللہ! میں تیرہ بندہ اور تو میرا ربّ ہے" —— بہر صورت اس کی یہ غلطی قابلِ معافی تھی۔ فرطِ مسرّت میں اگر بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا تو معافی مل سکتی تھی —— مُسلم شریف میں ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اُونٹنی کے مِل جانے پر سوار کو جتنی خوشی ہوئی تھی اس سے بہت زیادہ خوشی اللہ تعالیٰ کو اس وقت ہوتی ہے جب کوئی گنہگار بندہ اس کے حضور توبہ کرتا ہے۔

باب دوم

سیرتُ الرّسولؐ

سیرت و اخلاقِ نبویؐ

ایک شخص نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے۔ جواب ملا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے. جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل موجود تھا. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا. جب تک کسی عمل کو اس کے کمال کی آخری منزل تک نہ پہنچا لیا اس وقت تک امت کو اس عمل کا حکم نہ دیا اگر غریبوں اور مسکینوں کی مدد کا حکم دیا تو پہلے اپنا گھر اللہ کی راہ میں لٹا لیا۔ خود بھوکے رہے دوسروں کو کھلایا قاتلوں اور دشمنوں کو معاف کرنے کا حکم دیا تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہ لیا ایک وقت ایسا بھی تھا کہ صدیق اکبرؓ کے ساتھ رات کے سناٹے میں جباران قریش کے جور و ظلم سے تنگ آکر مشیئت ایزدی کے تحت اپنے مولد و مسکن اپنے محبوب ترین شہر شہر مکہ کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب دس ہزار قدوسیوں کی جماعت کے ساتھ اسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے. صحن حرم میں وہ تمام دشمن موجود تھے جنہوں نے کبھی راستے میں کانٹے بچھائے تھے پتھروں کی بارش کی تھی۔ حالتِ نماز میں رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر پر اونٹ کی اوجھ ڈالی تھی۔ آپ کو قتل کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ آپ کے چاہنے اور ماننے والوں کے گلے پر رسی باندھ کر اور سینے پر پتھر رکھ کر عین دوپہر کے وقت جبکہ مکہ کی سڑکیں دہک رہی ہوتیں گھسیٹتے پھرتے اور وہ سرگروہ عاشقاں جسے دنیا آج سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے نام سے یاد کرتی ہے احد احد کا ورد کرتا آج وہ حاضر ہیں. سر جھکائے. شکست خوردہ۔ اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر. سوال ہوا۔ اہل مکہ! تم

مجھ سے کس سلوک کی توقع کرتے ہو؟ اہلِ مکہ کیا جواب دیتے! آج انہیں اپنا ایک ایک ظلم یاد آ رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب کوئی فاتح کسی سرزمین میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوتا۔ تو کیا کرتا ہے۔ سروں کے مینار بناتا۔ خون کی ندیاں بہاتا۔ عبادت گاہوں کو مسمار کرتا اور آتش آہن کا بھیانک کھیل کھیلتا ہے۔ اکثر کا خیال تھا کہ آج وہی ہوگا جو دنیا میں آج تک ہوتا آیا ہے۔ تاہم انہوں نے ہمت کر کے کہا آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے۔ بحرِ رحمت جوش میں آگیا۔ ارشاد ہوا۔ آج میں تم سے وہی بات کہوں گا جو مجھ سے پہلے میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم پر کوئی سرزنش نہیں جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔ اپنے عقائد میں اپنے اعمال میں۔ میں تم سے کسی قسم کا انتقام لینا نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کونین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ تاریخ کے کان میں جب یہ آواز گونجی تو تاریخ بھی ٹھٹھک کر رہ گئی کہ آج تک اس نے یہ منظر دیکھا تھا نہ کسی فاتح کی زبان سے اس قسم کا کوئی جملہ سنا تھا۔ تاریخ کے دفتر کھنگال ڈالیئے سکندر و دارا، قیصر و کسریٰ، فغفور و بخت نصر سب کی داستانیں پڑھ ڈالیئے۔ آمنہؓ کے در یتیم اور قبیلۂ بنو سعد کی چراگاہوں میں بکریاں چرانے والے فاتح مکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر زمین کی پیٹھ پر اور آسمان کے سایہ تلے آپ کو نہیں ملے گی۔ اس لیے کہ نقاشِ ازل نے ان کا نقش بنانے کے بعد وہ قلم ہی توڑ دیا جس نے ان کا نقش بنایا تھا تاکہ قیامت تک نہ نقاش کا کوئی مثیل و نظیر ہو نہ نقش کا۔

آپ کی سیرت صرف سیرت ہی نہیں ایک دارالعلوم ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے۔ ایک ایسا چشمہ صافی ہے جس سے قیامت تک ہر پیاسا اپنی پیاس بجھاتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ستارے جھڑ کر تڑ جائیں چاند تاریک ہو جائے اور سورج اپنی تابانی و درخشندگی سے محروم ہو جائے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا آفتاب کبھی غروب نہ ہوگا کہ یہ آفتاب غروب ہونے کے لیے طلوع ہی نہیں ہوا تھا۔ ازل سے چمک رہا اور ابد تک چمکتا رہے گا ذروں کو آفتاب اور قطروں کو گہر بناتا رہے گا۔

تسبیح و تکبیر

ایک دن خلیفۂ راشد امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا کہ میں تمہیں اپنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا خاتون جنت کا ایک واقعہ نہ سناؤں؟ شاگرد نے عرض کیا۔ ضرور سنائیے۔ فرمایا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز ترین بیٹی سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اپنے ہاتھ سے چکی پیستی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاتھ میں سگٹے پڑ گئے تھے۔ مشکیزے میں پانی بھر کر لاتیں جس کے سبب ان کے شانوں پر مشک کی رسی کے نشان پڑ گئے تھے۔ سارے گھر میں جھاڑو بھی خود ہی دیتیں جس کے باعث ان کے کپڑے میلے ہو جاتے۔ (۱) کھانا پکانا۔ کپڑے دھونا۔ بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش اس پر میری خدمت۔ خاتون جنت پریشان ہو جاتیں اتفاق سے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند غلام اور باندیاں آئیں میں نے سیدہ سے کہا کہ تم بھی جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خدمت گار مانگ لو تا کہ گھریلو کام کاج میں تمہیں کچھ مدد مل جایا کرے۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں تشریف لے گئیں لیکن وہاں مجمع تھا اس لیے شرم کے مارے واپس چلی آئیں۔ دوسرے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود ہمارے گھر تشریف لائے اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے دریافت فرمایا کہ کل تم کس کام کے لیے گئی تھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سیدہ تو شرم سے چپ تھیں مگر میں نے ان کی ساری پریشانیاں جو چکی پیسنے۔ پانی بھرنے۔ جھاڑو دینے اور دوسرے گھریلو کاموں میں ہوتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کر دیں۔ حضرت فاطمہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ میرے اور علی کے پاس ایک ہی بستر ہے اور وہ بھی مینڈھے کی ایک کھال ہے جسے بچھا کر رات کو سوتے ہیں اور صبح کو اسی پر دانہ گھاس ڈال کر اونٹ کو کھلاتے ہیں۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیٹی صبر کر۔ اللہ کے نبی حضرت موسیٰ اور ان کی بیوی کے پاس دس سال تک ایک ہی بچھونا تھا اور وہ بھی حضرت موسیٰ کا چوغا۔ بیٹی تقویٰ اختیار کر اپنے رب کا فریضہ ادا کرتی رہ اور گھر کے کام کاج کو انجام دیتی رہ

البتہ سونے سے پہلے ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو کہ یہ خادم سے زیادہ اچھی چیز ہے۔

سیّدہ فاطمہؓ کی رخصتی

ازواج مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیھن اجمعین کے حجروں میں جشن کا سا سماں تھا۔ اُس طرح کا جشن نہیں جیسا کہ ہمارے گھروں میں ہوتا ہے کہ شریعت کی حدود توڑ دی جاتی ہیں۔ اہل خانہ ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ نمود و نمائش کا دور دورہ ہوتا ہے۔ قیمتی ملبوسات اور بھاری بھرکم زیورات دکھا کر اپنی امارت اور مالی برتری کا سکہ اپنے غریب رشتہ داروں پر بٹھایا جاتا ہے کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ مال و دولت، یہ زیور اور کپڑے آخر آئے کہاں سے ہیں؟ حلال ذریعے سے یا حرام سے؟ رشوت سے یا اسمگلنگ سے۔ کپڑے شاندار ہونے چاہئیں اور زیورات بھڑک دار۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ مگر کاشانۂ نبوتؐ میں آج یہ کیفیت نہیں تھی۔ البتہ جشن کی سی کیفیت ضرور تھی اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ خاتون جنت سیدۃ النساء فاطمہ الزہرا کی رخصتی کے لیے مکان تیار کیا جائے۔ حضرت ام سلمہ اور حضرت عائشہ پیش پیش تھیں کمرہ سجایا جانے لگا۔ لیکن کیسے؟ وادی بطحا سے اچھی قسم کی مٹی منگوائی گئی۔ اور کمرے کی لپائی کی گئی۔ دونوں ازواج مطہرات نے اپنے ہاتھوں سے کھجور کی چھال درست کر کے دو گدے تیار کیے۔ خرما اور منقی کا دولہا اور دولہن کے لیے بطور خوراک کے اور میٹھے پانی کا بطور شربت کے انتظام کیا گیا۔ کمرہ تیار ہو گیا تو اس کے ایک کونے میں سیدہ عائشہ نے ایک لکڑی گاڑ دی ام سلمہ نے پوچھا کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ سیدہ نے فرمایا اس پر کپڑے اور مشکیزہ لٹکایا جائے گا۔ لیجیئے یہ حجلۂ عروسی تیار ہو گیا۔ مسند احمد اور بیہقی میں ہے کہ شہنشاہ لولاک سید الکونین محبوب رب العالمین، صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز صاحبزادی سیدۃ نساء اہل الجنۃ سیدہ فاطمۃ الزہراء

کے جہیز میں ایک چمڑے کا تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی ایک چکی۔ ایک مشکیزہ اور دو گھڑے دیئے گئے۔ کائنات ارض وسما کے شفیق ترین باپ نے عزیز ترین بیٹی کو چادر اڑھائی۔ سر پہ ہاتھ رکھا اور سادگی کے ساتھ شہید خدا علی مرتضیٰ کے گھر رخصت کر دیا تاکہ بیٹی کی یہ رخصتی قیامت تک آنے والی امت کے لیے اسوۂ حسنہ بن کر پیشِ نظر رہے کہ امت کا امیر تو اپنی بیٹی کو بیش قیمت جہیز کے ساتھ رخصت کر کے دل ٹھنڈا کر سکتا ہے غریب باپ کم سے کم سادہ جہیز کے ساتھ بیٹی کو رخصت کرتے وقت اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ تو کہہ سکتا ہے کہ بیٹی صبر کر کہ نبیؐ نے فاطمہ کو اسی سادگی سے رخصت کیا تھا اور فاطمہؓ کے نمونۂ عمل سے بڑھ کر کوئی نمونہ نہیں۔

حضورؐ اور ایک پگلی بڑھیا

مسجد نبوی کے کنکریلے فرش پر سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں قبائل سے وفود بھی آئے ہوئے ہیں۔ اجلاء صحابہ بھی موجود ہیں نہایت اہم مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ خیر و شر کے درمیان امتیاز کرنے کے طریقے بتلائے جا رہے ہیں کتاب و حکمت کی تعلیم جاری ہے۔ لوگ سوال کر رہے ہیں اور انہیں تشفی بخش جواب دیا جا رہا ہے۔ لبہائے مبارک سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ سورج نصف النہار پر آگیا ہے۔ گرمی بھی سخت ہے۔ مگر کلمات نبوت میں ایسی خنکی ایسی مٹھاس اور ایسی شگفتگی ہے کہ مردہ دلوں کو حیات۔ گم گشتہ افکار کو راہ مستقیم اور بے چین احساسات کو طمانیت و سکون میسر آ رہا ہے۔ اتنے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظریں اٹھائیں تو دیکھا کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک بڑھیا مجمع کے آخر میں کھڑی کچھ عرض کرنا چاہ رہی ہے۔ سرکار اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے عرض کی سرکار! میں آپ کی خدمت میں اپنی چند حاجتیں پیش کرنا چاہتی ہوں۔ سب کے سامنے نہیں۔ تنہائی میں بیان کروں گی۔ صحابہ نے جو اس بڑھیا کو دیکھا تو کہنے لگے۔ حضور! اس کے دماغ میں خلل ہے۔ اہلِ محلہ کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہے۔ اس کی

طرف توجہ نہ فرمایئے۔ یہ خواہ مخواہ آپ کو پریشان کرے گی اور آپ کا وقت ضائع ہو گا۔
چہرۂ رسالت متغیر ہو گیا۔ جبین انور پر بل پڑ گئے۔ فرمایا۔ پاگل ہے تو کیا انسان نہیں۔
کیا اس کے سینے میں دل نہیں ہے تم کیسی باتیں کہتے ہو۔ دکھ کی ماری میرے پاس
آئی ہے۔ اس کی تو کوئی نہیں سُنتا۔ اگر میں بھی نہ سنوں تو یہ کس کے پاس جائے گی۔
یہ ارشاد فرما کر آپ کھڑے ہو گئے۔ بڑھیا کے قریب تشریف لے گئے۔ اے ام
فلاں! بتا تیری کیا حاجت ہے۔ بڑھیا نے کہا آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں
فرمایا۔ اے ام فلاں! تو جہاں جہاں مجھے لے چلے گی میں چلوں گا۔ اور تیری جو
بھی حاجت ہو گی میں اسے پورا کروں گا آگے آگے بڑھیا تھی اور پیچھے پیچھے محبوب
رب کائنات۔ دھوپ کی تمازت۔ لُو کی لپٹ۔ کوئی چیز آپ کو روک نہ سکی۔ مدینے
کی گلی کے ایک نکڑ پر جا کر پگلی بڑھیا نے کہا آپ زمین پر تشریف رکھیں۔ آپ بیٹھ گئے۔
بڑھیا نے اپنی ضرورت بیان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے پورا کر دیا۔ خوش ہو کر دعا دینے لگی۔ نبیؐ
بھی خوش خوش واپس تشریف لائے کہ دل تو کعبہ کی طرح محترم ہوتا ہے۔ عبادت نماز و
روزہ ہی نہیں حج و زکواۃ ہی نہیں دکھے دلوں کو سکون پہنچانا۔ اور بے سہاروں کو
سہارا دینا سب سے بڑی عبادت ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل خوشتر است

طفیل دوسی اور تلاوتِ نبویؐ

اجنبی شہر مکہ میں داخل ہوا تو رات ہو چکی تھی اس لیے کسی سے ملاقات نہ کر سکا
اور ایک دوست کے مکان میں رات بسر کرنے کے لیے ٹھہر گیا۔ اجنبی معمولی آدمی تو
نہیں تھا کہ شہر مکہ میں آکر چپ چپاتے واپس چلا جاتا۔ شاعر تھا۔ ادیب تھا۔ قبیلۂ دوس
کا نامی گرامی سردار تھا۔ اس کے سینکڑوں جاننے والے شہر میں موجود تھے۔ صبح ہوتے
ہوئے ملاقات کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا لیکن جو آتا۔ نصیحت کرتا اور اپنا دکھڑا
روتا۔ قبیلۂ قریش کے بعض سردار آئے اور انہوں نے بتلایا کہ طفیل ذرا سنبھل کر مکہ میں

وہنا آج کل شہر کی فضا ٹھیک نہیں ہے۔ طفیل نے دریافت کیا تو انہوں نے بتلایا کہ ہماری قوم میں ایک شخص پیدا ہو گیا ہے جس کے باعث ساری قوم میں تفرقہ پڑ گیا ہے نہ جانے اس کے کلام میں کیا سحر ہے کہ باپ بیٹے سے بھائی بھائی سے اور شوہر بیوی سے جدا ہو جاتے ہیں مگر جو ایک مرتبہ اس کا کلمہ پڑھ لیتا ہے اس کے دامن کو نہیں چھوڑتا۔ لہذا ہمارا مشورہ ہے کہ تم اس کا کلام نہ سُننا ورنہ باپ دادا کے دین سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔ طفیل نے روئی لی اور کانوں میں ٹھونس لی کہ کہیں قرآن کی آواز اس کے کانوں میں داخل نہ ہو جائے اور اس طرح شہر میں دن گزارنے لگا۔ اتفاقاً ایک دن حرم کعبہ میں داخل ہوا تو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں مشغول پایا طفیل نے کانوں کی روئی کو ذرا اور ٹھونس لیا کہ کہیں آپ کا کلام نہ کان میں پڑ جائے جس وقت طفیل مضبوطی سے روئی کو کانوں میں ٹھونس رہے تھے تقدیر پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اب مشیئت ایزدی نے اپنا عمل شروع کیا اور قرآن کی آواز روئی کی دیوار کو پھلانگتے ہوئے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ کلام اللہ کا آواز رسول اللہ کی۔ مقام کعبۃ اللہ۔ اللہ کے کلام نے کانوں کی دہلیز پر قدم رکھا اور دل کے نہاں خانے میں اُترنے لگا۔ اس کلام میں ایسا کیف و سرور اور ایسی لذت ایسا انبساط تھا کہ اُترتا ہی چلا گیا۔ طبیعت کو عرصۂ دراز کے بعد جو نشاط میسّر آیا تو طفیل نے روئی کو ذرا اور ڈھیلا کیا اور عرب کا نابغہ روزگار شاعر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذرا اور قریب آ گیا۔ روئی کانوں سے نکال کر پھینک دی کہ وہ معرفت حق کے درمیان حائل تھی۔ اب طفیل پر عالم محویت طاری ہے تلاوت ہو رہی ہے اور طفیل مبہوت کھڑا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ختم کی اور دولت کدے کی طرف چل پڑے۔ آگے آگے نبی تھے اور پیچھے پیچھے طفیل۔ دروازے پر پہنچ کر طفیل نے آپ کو روک لیا۔ اور قدموں میں بیٹھ گئے۔ "آقا! آپ کی قوم نے مجھے آپ کا کلام سُننے سے اس قدر ڈرایا تھا کہ میں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ مگر مشیئت ایزدی مجھے آپ کے دروازے پر لے آئی۔ دست مبارک دراز کیجئے اور اس غلام کی بیعت کو قبول فرما کر عمر بھر کی بے قراری کو قرار بخشئے۔ فدا کی۔

قسم میں نے قرآن سے بہتر کبھی کوئی کلام نہ سُنا۔ یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔ طفیل نے اسلام قبول کر لیا۔ قبیلے کی طرف لوٹنے لگے۔ تو طفیل بن عمرو دوسی نے عرض کیا۔ حضور! میں نے قرآن سننے کے ڈر سے کانوں میں روئی ٹھونسی تھی اب اس کا کفارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اپنے علاقے میں جا کر گلی گلی کوچے کوچے بستی بستی نگری نگری قرآن کا پیغام سناتا پھروں اگر اس فرض کو میں نے ادا کر لیا تو سمجھئے کہ میری زندگی کسی کام آئی۔

نصائح نبویؐ

ایک دن صحابۂ کرام کے اجتماع میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ فجر کی نماز ہو چکی تھی۔ وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کون ایسا شخص ہے جو مجھ سے چند باتیں اچھی طرح سیکھ لے پھر ان پر عمل بھی کرے اور دوسروں کو ان کی تعلیم بھی دے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً کھڑے ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک میں حاضر ہوں مجھے آپ ان باتوں کی تعلیم دیں میں ان پر عمل کروں گا اور لوگوں کو ان کی تعلیم بھی دوں گا۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور پانچ کلمات ارشاد فرمائے۔ فرمایا۔ حرام سے بچنا تم سب سے بڑے عابد بن جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی تمہیں مل جائے اس پر راضی ہو جانا تم سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے۔ اپنے پڑوسی سے حسن سلوک کرنا تم حقیقی معنوں میں مومن بن جاؤ گے۔ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرنا تم سچے مسلمان بن جاؤ گے۔ زیادہ نہ ہنسنا ورنہ تمہارا دل مردہ ہو جائے گا۔ ترمذی شریف کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان باتوں کو سُنا پھر لوگوں تک پہنچایا۔ عبادات کے دو پہلو ہیں۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ مثبت پہلو تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر پورے خلوص سے عمل کیا جائے اور اس کی جزا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کی جائے اور منفی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے کامل پرہیز کیا جائے۔

عبادت نور ہے اور حرام تاریکی۔ نور اور تاریکی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونا بھی کمال کی دلیل ہے۔ ساتھ ہی طمانیت قلب کا سامان۔ اس لیے کہ دنیا کی کوئی طاقت اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کی قضا کے نفاذ کو روک سکتی ہے نہ ٹال سکتی ہے۔ اس لیے اس کا حل صرف اس میں ہے کہ تقدیر الٰہی سے موافقت اختیار کی جائے اور اس کی تقسیم پر راضی رہا جائے۔ یہ رضا بالقضاء انسان کو توکل اور قناعت کا سبق دیتی ہے اور پھر اسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز بنا دیتی ہے۔ پڑوسی کے حقوق کی اہمیت کا اندازہ تو اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے پڑوسی سے نیک سلوک کرنے کی مجھے اتنی مرتبہ تاکید کی کہ مجھے تو خیال ہونے لگا تھا کہ شاید پڑوسی کو وراثت میں حصہ مل جائے گا اور یہ جو مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لیے بھی پسند کیا کرو اس میں بھی وہی اخوت و محبت اور باہمی ہمدردی و مواسات کے پاکیزہ جذبات کو پروان چڑھانے اور اسے مسلم معاشرے میں عام کرنے کی حکمت و مصلحت پوشیدہ ہے۔ جو اسلام کا مقصود اوّلیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں سب سے بڑی عبادت دلوں کو جوڑنا۔ پیار اور محبت کی تبلیغ کرنا اور امت مسلمہ کے افراد کے درمیان اخوت و محبت پیدا کرنا ہے اور سب سے بڑا گناہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے جدا کرنا۔ دلوں میں تفریق پیدا کرنا۔ فرقہ بندی اور دھڑے بازی کو فروغ دینا ہے۔ اسی لیے تفرقہ بازی کو قرآن کریم میں مشرکوں کا عمل کہا گیا ہے۔ اگر واقعتہً ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لیے وہی پسند کرنے لگے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو مسلم معاشرہ صحیح معنوں میں امن کا گہوارہ بن جائے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت میں آخری بات یہ بتلائی گئی ہے کہ زیادہ ہنسا نہ کرو ورنہ تمہارا دل مردہ ہو جائے گا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے اہم مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ آفاق و انفس اور اقوام و ملل کے حالات و تغیرات پر اگر غور کیا جائے تو انسان کو ہنسنے اور لہو و لعب میں مبتلا ہونے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ خوش

دلی اور خوش باشی ترک کی جائے البتہ کسی بھی صورت میں وقار کا دامن ہاتھوں سے چھوڑنا نہ چاہیئے۔

تسبیحاتِ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا

خاتون جنت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی لاڈلی بیٹی تھیں۔ آغوش نبوت کی تربیت یافتہ۔ ادب پروردۂ صبر و رضا۔ جب کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتیں تو صحیح بخاری شریف میں ہے کہ آپ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ ان کے سر کو بوسہ دیتے اور اپنی نشست گاہ پر بٹھلاتے۔ ایک دن سرکار کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ نے حسب عادت اکرام کیا۔ بہت سے اعزاء جمع تھے۔ تھوڑی دیر تک بیٹھی رہیں پھر واپس چلی گئیں۔ دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ شرم مانع تھی۔ عرض مدعا نہ کر سکیں۔ گھر پہنچیں تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا۔ عرض کیا۔ کہنے تو گئی تھی لیکن سب کے سامنے درخواست پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر دیکھا جائے گا۔ رات ہو گئی۔ خاتون جنت سونے کی تیاری کر رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی اٹھیں اور دروازہ کھولا۔ دیکھا تو آقائے نامدار سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف فرما ہیں۔ اندر بلا لیا۔ رخ انور کی ضیا پاشی سے حجرۂ فاطمہ بقعۂ نور بن گیا۔ دریافت فرمایا بیٹی! آج شاید تم کچھ کہنے گئی تھیں اور بلا عرض مدعا کے واپس آ گئیں۔ کیا بات ہے؟ فاطمہ! شرما گئیں۔ شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فاطمہ سے کہا۔ کہہ جو کہنا ہے تمہارے والد ہیں۔ رحمۃ للعالمین ہیں۔ دکھیاروں کے دردمند۔ بے کسوں کے دستگیر۔ جناب فاطمہ نے عرض کیا۔ ابا جان! میری جان آپ پر قربان۔ آپ کی بیٹی ہوں۔ چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے۔ پانی بھرتے بھرتے شانوں داغ ہو گیا۔ مکان میں جھاڑو دیتی ہوں۔ روٹی پکاتی ہوں۔ کپڑے دھوتی ہوں۔ تھک جاتی ہوں۔ سنا ہے کہ مال غنیمت میں بہت سے غلام اور باندیاں آئی ہیں۔ اگر ایک لونڈی مجھے بھی عنایت ہو جائے میں اس مشقت سے بچ جاؤں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کی عرض داشت کو صبر و تحمل سے سُنا۔ پھر ارشاد فرمایا۔ بیٹی!

تم نے اپنی تکلیف بیان کی میں نے سب کچھ سُنا۔ لیکن مجھے تم سے زیادہ شہدائے اُحد کے یتیموں کا خیال ہے۔ میں ان پر تمہیں ترجیح نہیں دے سکتا۔ بیٹی! تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ تعالیٰ کے فرائض ادا کرو۔ گھر کے کام کاج کرو۔ میری رضا اسی میں ہے۔

اور ہاں بیٹی! میں تمہیں خادم سے بہتر ایک چیز کیوں نہ بتا دوں۔ جب سونے کے لیے بستر پر جایا کرو تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔

سیدۃ نساء اہل الجنتہ فاطمتہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے سر جھکا دیا اور فرمایا میں اللہ اور رسول کی ہر بات پر راضی ہوں۔

امانت و دیانت کے ماہ تمام

یہ قافلہ ربذہ سے آیا تھا تاکہ مدینہ منورہ سے کھجوریں خرید کرے۔ چونکہ شام ہونے والی تھی اس لیے اہل قافلہ نے کہا کہ فی الحال مدینہ کے نواحی علاقے میں قیام کیا جائے۔ صبح غسل کر کے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد شہر میں جائیں گے۔ زرقانی شرح مواھب اللدنیہ میں ہے کہ اہل قافلہ کے پاس نقدی اور اسباب کے علاوہ ایک سرخ اونٹ بھی تھا جسے نکیل ڈالی ہوئی تھی۔ ابھی اہل قافلہ اپنا سامان اتار ہی رہے تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ سلام کیا اور دریافت کیا۔ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟ ہم نے بتلایا ربذہ سے۔ پوچھا ارادہ کہاں کا ہے؟ ہم نے بتایا۔ مدینہ طیبہ کا۔ دراصل ہم لوگ کھجوروں کی خریداری کرنے آئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے سرخ اونٹ کو دیکھ کر فرمایا۔ اسے تم میرے ہاتھ فروخت کرنا پسند کرو گے؟ ہم نے کہا۔ ہاں اتنے صاع کھجوریں لیں گے۔ فرمایا منظور ہے۔ اونٹ کی نکیل تھامی اور اسے لے کر چلے گئے۔ جب وہ مدینہ کے نخلستان کی اوٹ میں چلے گئے تو ہم نے

کہا۔ یہ ہم نے کیا کیا؟ نہ جان نہ پہچان ہم نے اونٹ ان کے حوالہ کر دیا اور قیمت بھی نہیں لی۔ اب قیمت نہ ملی تو کیا ہوگا؟ ہمارے قافلے کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی۔ اس نے ہماری پریشانی دیکھ کر کہا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے اونٹ کی قیمت کی ضامن ہوں۔ خدا کی قسم میں نے ایسا شخص دیکھا ہے جس کا چہرہ چودھویں کے چاند سے زیادہ روشن و منور تھا۔ ان کا نورانی چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ دھوکہ نہیں دیں گے۔ میں نے آج تک ایسا حسین چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ بھلا ایسے چہرے والا شخص خیانت کر سکتا ہے۔ ابھی ہم لوگ یہی گفتگو کر رہے تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور بتایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے۔ یہ تمہاری کھجوریں ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ پہلے آپ لوگ ان کھجوروں میں سے پیٹ بھر کر کھا لیں اس کے بعد ماپ کر اونٹ کی قیمت وصول کر لیں۔ اس خاتون نے کہا میں نا کہہ رہی تھی کہ وہ چہرہ کسی معمولی انسان کا چہرہ نہیں تھا۔ خدا کی قسم واقعتہً وہ خدا کے رسول ہیں۔ قول کے صادق۔ وعدے کے پکے۔ امانت و دیانت کے ماہ تمام۔ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وبارک وسلم۔

باب سوم

عبادات

نماز، آنکھوں کی ٹھنڈک

محبت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ محبوب سے ملاقات کا شوق دامن گیر ہے۔ اگر شوق ملاقات دامنگیر نہیں تو سمجھ لیجئے کہ محبت میں کھوٹ ہے۔ جو دنیا کے بازار میں چل جائے تو چل جائے۔ عالم الغیب رب السموات والارض کی بارگاہ میں ہرگز ہرگز نہیں چل سکتا۔ اللہ تعالیٰ سے بندے کی ملاقات کی بہترین صورت نماز ہے۔ شب معراج میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقام قاب قوسین پر فائز ہوئے اور قربت کے محل میں پہنچے تو مشاہدہ حق میں اس قدر محو ہوئے کہ آپ کی قوتِ طبعی نیست ہو گئی۔ بے اختیار ہو کر آپ نے عرض کیا۔ بارِ الٰہا! مجھے تو اسی محل قرب میں رکھ لے اور دوبارہ مجھے مصیبت کے گھر دنیا کی طرف نہ لوٹا۔ جواب ملا نبی آپ پر صلوٰۃ وسلام ہمارا فیصلہ تو یہی ہے کہ آپ کو واپس جا کر دنیا میں میری شریعت کو قائم کرنا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو جو کچھ یہاں ملا ہے وہی دنیا میں آپ کو نماز میں ملے۔ سو اس کا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے۔ اور جب نماز کا وقت آتا تو آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرماتے بلال! نماز کے لیے اذان دے کر مجھے راحت پہنچاؤ۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک عابدہ عورت کو دیکھا کہ حالت نماز میں ایک بچھو نے تقریباً چالیس مرتبہ اسے ڈنک مارا۔ بچھو جب ڈنک مارتا تو تکلیف سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا مگر اس نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔

جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے اس سے دریافت کیا ماں! آپ نے بچھو کو کچھ سے الگ کیوں نہ کیا۔ اس نے کہا بیٹا! تم ابھی بچے ہو اس لیے ایسی بات کرتے ہو۔ "خدا کے کام میں بھلا میں اپنا کام کیسے شروع کر دیتی"؟

محویّت نماز

جمادی الاوّل ۴ھ ہجری میں غزوۂ ذات الرقاع سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھاٹی میں قیام فرمایا۔ اور اسلامی لشکر کی حفاظت کے لیے حضرت عبّاد بن بشر اور عمار بن یاسر کو ایک درے پر مامور فرمایا۔ چاندنی رات تھی۔ دونوں حضرات نے طے کیا کہ اوّل شب میں عبّاد اور آخر شب میں عمار جاگیں تاکہ دونوں کو تھوڑے تھوڑے آرام کا موقع مل جائے۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے ہیں۔ چاندنی پہاڑی کی پیشانی پر لوٹ رہی ہے۔ ٹھنڈی مشک بیز ہوا کے جھونکوں نے عمار بن یاسر کو جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ اب جاگنے والوں میں عبّاد تنہا تھے۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا ہے۔ کبھی کبھی ہوا چلتی ہے تو جھاڑی کے پتے کھڑک جاتے ہیں ورنہ مکمل خاموشی ہے۔ ایسے میں بندے کا دل مچل اٹھا کہ اپنے مولا سے راز و نیاز کا آغاز کر دینا چاہیے با وضو تھا ہی۔ فرش سبزہ پر اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی۔ اور کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد قرآن کریم کی آیات روح کا ارتعاش بن کر عباد بن بشر کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگیں۔ اور عباد کا باطن بقعۂ نور بن گیا۔ لگتا جیسے عباد کے دل پر نزول کتاب ہو رہا ہے۔ ایک عجیب ہی کیف آگیں اور روح پرور وقت تھا۔ معلوم ہوتا کہ شجر و حجر چرند و پرند زمین و آسمان پر عالم محویت طاری ہے۔ اور ہر مخلوق کان لگائے عباد بن بشر کی تلاوت سن رہی ہے۔ لہجے کی حلاوت۔ دل کے خلوص، جذبے کی صداقت، ماحول کی سکینت اور آیات قرآنی کے اعجاز نے مل کر ایک عجیب ہی سماں پیدا کیا ہے۔ کہ دور سے ایک کافر نے تاکا اور فوراً پہچان گیا کہ کوئی مسلمان پاسبان ہے۔ جو لشکر کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے میں مصروف

ہے۔ جھٹ ترکش سے تیر نکالا۔ چلہ پر چڑھا کر ایسا مارا کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ تیر عباد کے جسم میں پیوست ہو گیا اور عباد لہو لہان ہو گئے۔ مگر تلاوت جاری رہی اور نماز عشق ادا ہوتی رہی۔ عباد کو ذرا سی خلش کا احساس ہوا تیر نکال کر پھینک دیا۔ تاہم نیت توڑی نہ سلسلہ تلاوت منقطع کیا۔ اس لیے کہ ایمان و احسان کی حلاوت دل میں اُتر چکی تھی۔ کافر حیران رہ گیا۔ اس نے دوسرا تیر چلایا اور وہ بھی اس مرد خود آگاہ خدامست کے سینے میں پیوست ہو گیا مگر تلاوت تھی کہ جاری تھی۔ نماز تھی کہ ادا ہو رہی تھی۔ خون کا دوسرا فوارہ پھوٹ پڑا۔ جلوۂ ربانی کا مشاہدہ کرنے والے نے ہاتھ بڑھایا اور اس تیر کو بھی نکال کر پھینک دیا۔ کافر سوچنے لگا نہ جانے یہ انسان کس چیز کا بنا ہے کہ تیر پیوست ہوئے جا رہے ہیں اور اسے احساس تک نہیں۔ اُسے کیا پتہ تھا کہ خمخانہ رسالت کے بادہ کشوں کا نشہ وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اتار دے۔ عشق جب دل و جاں میں سما جاتا ہے تو انسان کو دنیا و ما فیہا سے بے نیاز اور فکر فردا سے مستغنی کر دیتا ہے۔ اس نے تیسرا تیر بھی چلا دیا اور وہ تیر بھی نشانے پر بیٹھ گیا۔ اب یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں اپنی دشمن کمین گاہ سے لشکر پر حملہ نہ کر دے۔ عباد نے نماز پوری کی اور جب السلام علیکم و رحمت اللہ کہا تو شاید ملک و ملکوت نے یک زبان ہو کر و علیکم السلام و رحمتہ اللہ و برکاتہ، کہا ہوگا۔

عباد نے عمار بن یاسر کو بیدار کیا تو عمار یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ عباد لہو لہان ہیں اور زمین ان کے گرم گرم خون سے رنگین ہے۔ پوچھا یہ کیا ہوا۔ عباد نے جواب دیا کہ کافر نے نشانہ بنایا ہے۔ کافر یہ دیکھ کر کہ دونوں حضرات جاگ اُٹھے ہیں۔ فرار ہو گیا۔ عمار نے پوچھا۔ تم نے پہلے ہی تیر میں مجھے کیوں نہ جگا دیا۔ تم تو زخموں سے چور ہو۔ عباد نے کہا۔ کیا بتاؤں عمار! میں قرآن کریم کی ایک طویل سورت کی تلاوت میں مصروف تھا۔ اس کی حلاوت اور نغمگی نے مجھے اس قدر مسحور کر رکھا تھا کہ درمیان سے قطع کرنا مجھے گوارا نہ ہوا۔ جب پے در پے تیر لگے اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں بہت سے دشمن کمین گاہ سے نکل کر سونے والوں پر وار نہ کر دیں تو تمہیں جگا دیا خدا کی قسم اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا خیال نہ ہوتا تو عمار! سن لو، کہ نماز ختم ہونے سے پہلے میری جان ختم ہو

جاتی۔ جان چلی جاتی تو چلی جاتی ہیں قرآن کریم کی تلاوت سے باز نہ آتا۔ ہیں نے تو اس وقت فرض کی پکار پر لبیک کہا ہے۔ عشق کا تقاضا تو یہی تھا کہ ؎

رہے نہ جان تو قاتل کو خون بہا دیجئے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیئے

نماز اور تعلق باللہ

اسلام کے پانچ ارکان میں سے نماز اہم ترین رکن اور ایسا فریضہ ہے جو پابندئ وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔ اس کی کچھ شرائط بھی ہیں اور اولین شرط طہارت ہے یعنی جسم کی طہارت ظاہری نجاست سے اور باطنی طہارت نفس کی غلامی اور غیر اللہ کی محبت سے۔ کپڑے ظاہری نجاست سے پاک ہوں حلال کمائی سے بنائے گئے ہوں جگہ پاک ہو۔ ظلم یا غصب کے ذریعہ حاصل نہ کی گئی ہو۔ بندے کا رُخ کعبہ کی طرف ہو اور اس کا دل عرش الٰہی کی طرف متوجہ ہو۔ پھر اللہ کے حضور کھڑا ہو اور یہ سمجھے کہ وہ اپنے ایسے مالک کے روبرو ہے۔ جو اس کائنات ارضی و سماوی کا بلا شرکت غیرے مطلق العنان حکمران ہے۔ یہ تصور انسان میں عاجزی و انکساری پیدا کرتا ہے۔ جسے قرآن کریم کی اصطلاح میں خشوع و خضوع کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تو آپ کا سینۂ بے کینہ اس طرح جوش مارتا جیسے پکتی ہوئی دیگ جوش کھاتی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تو جب نماز کا ارادہ فرماتے تو آپ کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ کہ اب معبود حقیقی کے حضور حاضری کا وقت آن پہنچا ہے اور جب نماز میں مشغول ہوتے تو ایسا انہماک ہوتا اور خود فراموشی کی ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ جسم مبارک میں چبھا ہوا تیر نکال لیا جاتا اور شیر خدا کرم اللہ وجھہ کو خبر تک نہ ہوتی ایک مرتبہ حضرت حاتم اصم رحمتہ اللہ علیہ سے کسی شخص نے ان کی نماز کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ جب نماز کا وقت آتا ہے تو میں ایک وضو ظاہری کرتا ہوں اور ایک باطنی۔ ظاہری وضو پانی سے

کرتا ہوں اور باطنی توبہ سے پھر مسجد میں آتا ہوں تو نماز کے لیے اس طرح کھڑا ہوتا ہوں کہ مسجد حرام جس طرح میری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ بہشت کو اپنے دائیں طرف اور دوزخ کو اپنے بائیں طرف۔ اور اپنے قدموں کو پل صراط پر دیکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ ملک الموت میری پشت پر کھڑا ہے۔ تکبیر کہتا ہوں تعظیم کے ساتھ قیام کرتا ہوں ادب کے ساتھ قرأت کرتا ہوں ہیبت کے ساتھ۔ رکوع کرتا ہوں خشوع اور تواضع کے ساتھ۔ اور سجدہ کرتا ہوں۔ مقام ابراہیم کو اپنے دونوں ابروؤں کے درمیان سمجھتے ہوئے التحیات میں بیٹھتا ہوں۔ حلم اور وقار کے ساتھ اور سلام پھیرتا ہوں۔ شکر کے ساتھ۔ نماز در حقیقت تعمیل ارشاد کا نام ہے۔ نماز ہی کے ذریعہ بندے کا تعلق اس کے رب کے ساتھ استوار ہوتا ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے"! جب نماز کا وقت آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرماتے۔ "بلال! نماز کے لیے اذان دے کر ہمیں راحت پہنچاؤ۔

صدقہ وزکوٰۃ کی برکت

یہ زمین تو والا نتہ تمہارے والد کی طرف سے تم تک پہنچی ہے یا پھر تم نے اسے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے خریدا ہے۔ تم نے اس میں ہل اور ٹریکٹر چلایا نہروں اور ٹیوب ویلوں کے پانی سے سینچا۔ پھر بیج ڈالے۔ سردی گرمی برداشت کی موسم کی چیرہ دستیوں کو جھیلا۔ کیڑے مار دوائیں چھڑکیں۔ تب جا کر یہ فصل تیار ہوئی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ تمہیں یہ حکم دے رہا ہے کہ اپنی فصل کا حق فصل کاٹتے ہی ادا کر دو۔ اور پیداوار کا دسواں حصّہ بارانی زمین ہونے کی صورت میں اور بیسواں حصّہ نہری زمین ہونے کی صورت میں اپنے غریب اور محروم المعشیت بھائیوں کو دیدو۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے ایسا نہ کرو ورنہ تمہارا غلہ کم ہو جائے گا۔ پتہ نہیں اگلے سال ایسی فصل ہو گی کہ نہیں۔ کچھ اپنے بال بچوں کے لیے بھی کیا کرو۔ یہ وہ سرگوشیاں ہیں جو

فصل کٹتے ہی شیطان کسان کے کانوں میں شروع کردیتا ہے۔ شیطان کی انہی سرگوشیوں کی طرف اللہ تعالیٰ نے سورہ واقعہ میں ارشاد فرمایا ہے اور اس کی پُرزور تردید کی ہے۔
ترجمہ:۔ اچھا یہ تو بتاؤ جو کچھ تم بوتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا اس کے اگانے والے ہم ہیں اگر ہم چاہیں تو اس پیداوار کو چورچورا کر کے تباہ کر دیں۔ پھر تم حیرت زدہ ہو کر کہنے لگو گے کہ ہم پر تو تاوان پڑ گیا۔ ہم تو بالکل ہی محروم ہو گئے اچھا پھر یہ تو بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اسے بادل سے تم برساتے ہو یا اس کے برسانے والے ہم ہیں سو اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا کر ڈالیں۔ تو تم شکر کیوں نہیں کرتے۔ تم مجھ سے دریافت کرو گے کہ شکرادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ سو اس کا طریقہ ہے کہ میرے حکم کے مطابق اپنے مال اور پیداوار کی زکوٰۃ نکال دو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو میں تمہارے مال اور زرعی پیداوار کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میری راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے وہ سب تم کو پورا پورا لوٹا دیا جائے گا اور تم پر ذرا بھی زیادتی نہ کی جائیگی میں تو یہاں تک وعدہ کرتا ہوں کہ ایک کے بدلے سات سو بلکہ اس سے بھی زیادہ دوں گا۔ اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک دن ایک شخص میدان میں جارہا تھا کہ اس نے بادل میں سے ایک آواز سنی کہ فلاں شخص کے باغ کو سیراب کر آؤ۔ آواز کا آنا تھا کہ بادل اپنی جگہ سے چل پڑے اور ان کے ساتھ ساتھ آواز سُننے والا بھی چل پڑا۔ اس نے کیا دیکھا کہ بادلوں نے جاکر سارا پانی ایک باغ میں انڈیل دیا اور باغ کے بیچ میں ایک شخص کھڑا اپنے باغ کو کھینچ رہا ہے۔ اس شخص نے باغ والے سے اس کا نام دریافت کیا اور جب اس نے وہی نام تبلایا جو اس نے بادل والے سے سنا تھا تو حیران رہ گیا۔ اس کی حیرانی دیکھ کر باغ کے مالک نے وجہ دریافت کی تو اس نے سارا واقعہ من وعن سنا دیا۔ اور باغ والے سے کہا کہ بندۂ خدا! آپ کونسا کام کرتے ہیں جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی عنایت آپ پر ہوئی ہے؟ باغ والے نے کہا کہ آج تک یہ راز راز ہی تھا لیکن اب جبکہ آپ کو سب

کچھ معلوم ہی ہو گیا ہے تو سنیئے۔

اس باغ میں سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے میں اس کے تین حصّے کرتا ہوں۔ ایک حصّہ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتا ہوں۔ ایک حصّہ میرے بال بچے اور میں کھاتا ہوں اور ایک حصّہ بیج اور دیگر اخراجات پر صَرف کر دیتا ہوں۔ اسی باغ میں لوٹا دیتا ہوں۔ ابرِ کرم کی جو بارش تم نے دیکھی ہے سب کچھ شاید اسی کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنے خالق و مالک کے وعدے پر اعتماد کیا۔ میرے مالک نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ اس کے کہنے پر خرچ کرتا ہوں اور وہ کبھی بھی کمی نہیں ہونے دیتا۔

انفاق فی سبیل اللہ

عامل زکواۃ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے زکواۃ میں اونٹنی قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر صحابی کو اصرار تھا کہ جب میں اپنی مرضی سے ایک سالہ اونٹ کے بچے کی بجائے زکواۃ میں اونٹنی دے رہا ہوں تو آخر اسے قبول کر لینے میں قباحت ہی کیا ہے۔ حضرت ابی بن کعب نے فرمایا "بھائی! بات یہ ہے کہ زکواۃ کا معاملہ الل ٹپ نہیں ہے۔ اس کا ایک خاص نصاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر کردہ ہے۔ ہم تو حکم کے پابند ہیں۔ صحابی نے کہا۔ یہ تو آپ ٹھیک فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق میرے اوپر زکواۃ میں ایک سالہ اونٹنی ہی واجب ہے لیکن ایک سال کا بچہ کس کام کا؟ نہ اس پر سواری کی جا سکتی ہے۔ نہ اس کے دودھ سے ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایک سالہ بچہ لے جا کر آپ کیا کریں گے۔ جب مجھے اللہ کے راستے میں زکواۃ ادا کرنی ہے تو میں کیوں نہ بہتر سے بہتر مال نذر کروں؟ میں جو موٹی تازی اونٹنی دے رہا ہوں یہ دودھ بھی دیتی ہے اور اگر کوئی شخص سواری کے لیے استعمال کرنا چاہے تو استعمال بھی کر سکتا ہے۔ ابی بن کعب نے کہا۔ مجھے تو جو حکم دیا گیا ہے میں اس کی خلاف نہیں کر سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر سرکار کی خدمت

میں جاکر آپ کو صحیح صورت حال سے مطلع فرمادیں اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں گے تو خود قبول فرمالیں گے یا پھر آپ مجھے حکم دیں گے اس وقت میں قبول کرسکوں گا۔

صحابی نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ہمراہ لیا وہ اونٹنی بھی لی اور بارگاہ نبوت میں حاضر ہوگئے۔ صحابی نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک! میرے پاس آپ کا بھیجا ہوا عامل زکواۃ آیا تھا اس نے میرے مویشیوں کا حساب کرکے میرے اوپر یک سالہ اونٹنی کا بچہ عائد کیا لیکن یہ سوچ کر کہ یک سالہ اونٹنی کا بچہ کس کام کا؟ میں انہیں ایک موٹی تازی اونٹنی دے رہا ہوں لیکن یہ لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اونٹنی جو میں دے رہا تھا حاضر ہے۔ اب آپ فیصلہ فرمائیں کہ کیا ہونا چاہیئے؟

مسند امام احمد اور ابوداؤد شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "دیکھو! تمہارے اوپر حساب کے مطابق تو اونٹنی کا یک سالہ بچہ ہی واجب ہے تاہم اگر تم اس کے بجائے مکمل اونٹنی ہی دینا چاہتے ہو تو یہ بطور نفل کے ہوگی۔ اور اسے میں قبول کرنے کو تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور تمہارے اس کار خیر کو قبول فرمائے۔ صحابی نے اونٹنی آگے بڑھادی۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمالیا اور صحابی کے لیے برکت کی دعا فرمائی۔ زکواۃ میں خیر اعمال ادا کرنے کا مقدس جذبہ بلاشبہ اس قابل تھا کہ سرور کونین فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم اس جذبے والے کے حق میں دعائے خیر فرماتے۔

صدقۂ جاریہ

نیک اعمال کا یہ سارا سلسلہ صرف زندگی سے وابستہ ہے۔ آدمی زندہ ہے تو نماز پڑھ سکتا ہے۔ روزہ رکھ سکتا ہے۔ تلاوت کرسکتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرسکتا ہے۔ اپنے مال سے اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرسکتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ کے حضور اپنے گناہوں سے توبہ کرسکتا ہے۔ کافر ہو گبر و بت پرست ہو محض ایک لمحے کی شرمندگی۔ ایک لحظے کا احساس ندامت اور رجوع الی اللہ کافی ہے۔ قرآن کریم میں

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم توبہ کرکے میری طرف رجوع ہو جاؤ گے تو تمہاری زندگی کے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک کے لیے ہے کہ وقت آخر نہ آن پہنچے۔ جب وقت آخر آگیا اور عالم نزع طاری ہو گیا تو پھر نہ رجوع الی اللہ ہے اور نہ توبہ۔ موت کے بعد سارے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں اب بندہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ نہ روزہ رکھ سکتا ہے۔ نہ اپنی جمع شدہ دولت کو خرچ کر سکتا ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مگر چند ایسے اعمال ہیں جن کا ثواب مرنے کے بعد انسان کو ملتا رہتا ہے۔ مثلاً صدقہ جاریہ۔ کہ کسی نے نہر کھدوا دی۔ کنواں بنوا دیا یا مسافروں کے لیے سرائے تعمیر کرا دی۔ یا راستے پر درخت لگوا دیئے مسجد بنوا دی یا کسی دینی درسگاہ میں کتابیں وقف کر دیں۔ یہ ایسے کام ہیں کہ جب تک لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اسے اس کا ثواب ملتا رہے گا۔ یا مثلاً اس نے کوئی کتاب تصنیف کر دی۔ یا لوگوں کو علم دین سکھایا۔ یا تبلیغ کے ذریعہ گمراہوں کو راہ ہدایت دکھلائی تو تعلیم دین اور رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ جب تک جاری رہے گا اسے ثواب ملتا رہے گا۔

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور تیسری نیکی یہ ہے کہ انسان صالح اولاد چھوڑ کر دنیا سے جائے۔ جو وفات کے بعد اپنے والدین کی مغفرت کے لیے دعا کرتا ہے چونکہ والدین نے اپنی اولاد کو متقی بنانے کی کوشش کی تھی اس لیے جب تک وہ لڑکا زندہ رہے گا اس کی نیکیوں کا ثواب اس کے والدین کو ملتا رہے گا۔ اس حساب سے اگر دیکھیں تو صالح اولاد بھی ایک قسم کا صدقۂ جاریہ ہے۔ اور اس کا سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ عبادات کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ صدقہ جاریہ اور موت کے بعد بھی کام آنے والی نیکیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ لازماً ایک ایسا دن آنے والا ہے جس دن ہم منوں مٹی کے نیچے ہوں گے اور دنیا کا یہ کھیل تماشہ جاری رہے گا۔

استقبالِ رمضان

ماہ شعبان اپنی آخری منزلیں طے کر رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ وہ ماہ مبارک قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا جو رحمت و مغفرت کا مہینہ ہے۔ جس ماہ مبارک میں شیطانی قوتیں مغلوب اور نیکی و پرہیزگاری کی فضا غالب آ جاتی ہے۔ کہ ایک دن سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم منبر مبارک پر جلوہ افروز ہوئے اور ارشاد فرمایا لوگو! تمہارے اوپر ایک ایسا عظمت و برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے جس کی ایک رات ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس ماہ مبارک میں اللہ تعالیٰ نے دن کے وقت روزہ تمہارے اوپر فرض کیا ہے اور رات کو عبادت میں بسر کرنا اسے پسندیدہ ہے۔ جو شخص اس مہینے میں نفل عبادت کرے گا اسے فرض عبادت کا ثواب ملے گا اور جو فرض عبادت ادا کرے گا اسے ستر فرض ادا کرنے کا ثواب ملے گا۔ لوگو! یہ مہینہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا اجر جنت ہے۔ یہ ماہ مبارک باہمی ہمدردی اور خیر خواہی کا متقاضی ہے۔ اس مہینے میں مومن کے رزق میں برکت دی جاتی ہے سو جو شخص کسی روزہ دار کو افطار کرائے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اس کی گردن عذاب جہنم سے آزاد ہو جائے گی اور کسی روزہ دار کو افطار کرانے والے کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ روزہ دار کو ملتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ثواب میں کمی ہو۔ راوی حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک ہر آدمی میں تو افطار کرانے کی استطاعت نہیں ہوتی آپ نے ارشاد فرمایا ایک گھونٹ دودھ پلا دینا۔ ایک کھجور کھلا دینا۔ کچھ نہیں تو تھوڑا سا پانی پلا دینا بھی تمہیں ثواب کا مستحق بنا دے گا۔ جو شخص کسی روزہ دار کو کھانا کھلائے گا روز قیامت اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض کوثر سے ایسا شربت پلائے گا کہ پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔ یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ لوگو! یہ وہ ماہ مبارک ہے کہ اس کا پہلا عشرہ رحمت۔ درمیانہ عشرہ مغفرت اور آخری عشرہ جہنم سے مکمل آزادی بخشنے والا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں اپنے خادموں اور ملازموں پر

نرمی کرے گا اور ان سے کام لینے میں تخفیف کرے گا اللہ تعالیٰ اسے جہنم کے عذاب سے
محفوظ رکھے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اصل روزہ دار وہ ہے
جو گالی گلوچ لڑنے جھگڑنے اور معصیت سے خود کو بچائے رکھے کہ وہی روزہ دار ہے۔

روزے کی حکمتیں

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں روزے کی تین قسمیں بتلائی ہیں۔
عام روزہ۔ خاص روزہ۔ اخص الخواص روزہ۔ عام روزہ تو معروف ہے کہ طلوع صبح صادق
سے نیت صوم کے ساتھ غروب آفتاب تک کھانے پینے اور اختلاط سے پرہیز کیا جائے۔
خاص روزہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ کانوں کو ناجائز باتوں کو سننے سے۔ آنکھوں کو
ناجائز چیزوں کو دیکھنے سے۔ زبان کو فحش گوئی۔ جھوٹ۔ بہتان اور غیبت سے۔ ہاتھوں
کو ناجائز چیزوں کو چھونے یا کسی پر ظلم کرنے سے اور پیروں کو ناجائز مقامات پر جانے
سے روکا جائے یہی نہیں بلکہ تمام اعضاء اور جوارح کو نامشروع کاموں کے ارتکاب سے
باز رکھا جائے۔ اور اخص الخواص روزے کا تعلق انسان کے قلب ونظر اور خیالات و
احساسات سے ہے۔ یہ روزہ انبیاء و اکابر اولیاء اللہ کے ساتھ خاص ہے یعنی قلب
کو ہر قسم کے گھٹیا خیالات سے پاک رکھنا امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس طرح کا روزہ
رکھنے والوں کا ذہن اگر ایک لمحے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جائے اور ان
کے دل میں دنیوی مفادات کا خیال آجائے تو یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا روزہ فاسد
ہو گیا۔ یہ روزہ بڑے اونچے مرتبے والوں کا حصہ ہے۔

انسان دو طرح کی قوتوں سے مرکب ہے ایک بہیمیت اور دوسری ملکیت۔
بہیمیت انسان میں حرص و ہوس۔ ظلم و تعدی۔ حسد و عداوت۔ غصہ اور سفلی جذبات
پیدا کرتی ہے اور ملکیت اعلیٰ جذبات اور اخلاق فاضلہ پیدا کر کے انسان کو اس قابل
بناتی ہے کہ اس کا رابطہ عالم ملکوت سے قائم ہو اور اسے وہ منصب خلافت الٰہی ہے
جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے روز ازل ہی منتخب فرما لیا تھا بہیمیت و ملکیت کا یہ

تصادم انسان کے باطن میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ ساری دنیا کے عقلاء اور ہر مذہب وملت کے ماننے والے اس بات پر متفق ہیں کہ بہیمیت کی شکست ومغلوبیت میں روزے کو بہت کچھ دخل ہے۔

روزہ بہیمی قوتوں کو مغلوب کرتا اور ملکیت کو ترقی دے کر انسان میں اخلاق فاضلہ پیدا کرتا ہے۔ بشرطیکہ انسان روزے کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کرے۔ ماہ رمضان رحمت ومغفرت کا مہینہ اسی لیے قرار پایا کہ یہ روحانی تربیت اور ملکوتی بہار کا مہینہ ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس ماہ مبارک کی رحمتوں اور برکتوں سے بہرۂ وافر حاصل کریں۔

حج

ہر عاقل بالغ مسلمان صاحب استطاعت پر حج فرض ہے۔ حج کا مقصود یہ ہے کہ آدمی کامل طور پر خود کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے جس طرح کعبہ کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود کو تابع فرمان خداوندی بنا لیا تھا۔ جبکہ ان کے رب نے ان سے کہا کہ تم پوری طرح میرے تابع فرمان بن جاؤ اور انہوں نے جواب دیا کہ میں سرتاپا پروردگار عالم کا تابع فرمان بن گیا۔ نمرود نے منجنیق میں ڈال کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا نیچے آگ تھی اور اوپر ابراہیم کہ جناب جبریل علیہ السلام نے ان سے دریافت کیا ابراہیم! آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے مڑ کر جبریل کو دیکھا اور فرمایا مدد کی ضرورت تو ہے لیکن تمہاری مدد کی نہیں اپنے رب کی مدد کی ضرورت ہے جناب جبریل نے بے قرار ہو کر کہا تو پھر اپنی حاجت خدا سے مانگیے عاشق صادق علیہ السلام نے جواب دیا " اسے میرے حال کا علم ہے۔ اگر وہ مدد کرنا چاہے گا تو کرے گا سوال کی ضرورت نہیں۔ بیک وقت جبریل اور آگ دونوں کو وحی کی گئی۔ جبریل علیہ السلام سے کہا گیا کہ تم میرے اور میرے خلیل کے درمیان سے ہٹ جاؤ اور آگ کو حکم دیا گیا کہ تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈی اور ذریعہ سلامتی بن جا۔ حج کی ساری حقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی کردار میں پوشیدہ

ہے کہ مرکز نگاہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو بنایا جائے اور احرام باندھتے وقت انسان تمام بُری صفات اور خراب عادات سے علیحدگی اختیار کرے۔ ورنہ وہ احرام کے حق کو ادا نہ کر سکے گا۔ حاجی کو چاہیئے کہ وہ میدان عرفات کو میدان حشر تصوّر کرے۔ کہ یہ مقام ذات الٰہی کے مشاہدے کا مقام ہے اس مقام میں بندہ اپنے رب سے جو عہد کرتا ہے ساری زندگی اس عہد کو نباہنا پڑتا ہے۔ عرفات کو عرفات اس لیے کہتے ہیں کہ اسی مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تھی اور حضرت آدم نے حواء کو اور حواء نے آدم علیٰ نبینا وعلیہم السلام کو پہچانا تھا۔ تو عرفات معرفت کا مقام ہے۔ اپنی معرفت اور اپنے رب کی معرفت۔ اس لحاظ سے اگر دیکھیں تو عرفات مغفرت کا بھی مقام ہے۔ کیونکہ معرفت کے بعد مغفرت حاصل ہوتی ہے اور کبھی مغفرت کے بعد معرفت۔ عرفات اور مغفرت کے درمیان اتنا گہرا تعلق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حج تمام سابقہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ جس طرح اسلام زمانۂ کفر کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

باب چہارم

اخلاق و اعمال

سات نصیحتیں

مسند امام احمد میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے محبوب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سات باتوں کا حکم دیا ہے۔ آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ مسکینوں سے محبت کرنا اور ان کے قریب رہنا۔ دنیا کے اعتبار سے ہمیشہ ان لوگوں پر نظر ڈالنا جو دنیوی مال و متاع کے اعتبار سے تم سے کمتر ہوں ان کی طرف نظر نہ کرنا جو اس اعتبار سے تم سے برتر ہوں اپنے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنا خواہ تمہارا کوئی عزیز تم سے سرد مہری کا برتاؤ کرے۔ خبردار اللہ کے سوا کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کرنا۔ ہمیشہ سچی بات کہنا چاہے وہ لوگوں کو کڑوی کیوں نہ لگے۔ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرنا اور آخری بات یہ کہ کثرت سے لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا ورد کرنا کیونکہ یہ جملہ عرش کے نیچے کے خزانے کا ایک حصہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکینوں سے محبت کرنے کا اس لیے حکم دیا ہے کہ اس سے آدمی میں خاکساری اور تواضع پیدا ہوتی ہے جو اللہ کے دربار میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ دنیوی اعتبار سے اپنے سے کمتر لوگوں پر نظر کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ اس سے آدمی میں قناعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بے اطمینانی اور طمع نہیں پیدا ہوتی۔ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ میں غربت کے باعث ننگے پیر بازار میں چلا جا رہا تھا میرے دل میں خیال آیا کہ اتنی صلاحیتوں کے باوجود میں اتنا مفلوک الحال ہوں کہ اس سردی میں ننگے پیر

پھر رہا ہوں جوتے کا ایک جوڑا بھی میسّر نہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میرا نفس اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرنے لگا ابھی دو چار ہی قدم چلا ہوں گا کہ میں نے ایک اپاہج آدمی کو دیکھا جو پیروں سے معذور تھا اور زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کم از کم مجھے پاؤں تو دیئے ہیں جوتے نہیں تو کوئی بات نہیں ہے۔ اگر وہ مجھے اس جیسا بنا دیئے ہوتا تو میں کیا کرتا۔ شکر کی نسیم جاں فزا چلنے لگی اور میرا دل اپنے رب کی رحمت بے پاں کے سامنے سراپا سپاس بن گیا۔ یہی حال اپنے اعزا سے حسن سلوک کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ظرف کے مطابق برتاؤ کرتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کے عمل کو دیکھ کر اپنا معیار نہ گرایا جائے۔ رہا سوال غیر اللہ سے کچھ مانگنے کا۔ یہ تو سراسر گمراہی ہے اس لیے کہ ملک و ملکوت کا ایک ہی مالک ہے۔ سب اس کے محتاج اور اس کی بارگاہ عالی کے سوالی ہیں۔ پھر کیوں نہ مالک الملک کے آگے دست سوال دراز کر کے ساری مخلوق سے انسان مستغنی ہو جائے۔ آخری تین باتیں بھی بڑی ہی اہم ہیں۔ ایک تو صداقت پر استقامت چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش اور دوسری راہ حق میں دلیری و جرأت مندی کے ساتھ آگے بڑھتے جانا۔ اور اس بات کی پرواہ نہ کرنا کہ دنیا کیا کہتی ہے۔ اصل چیز تو رضائے مولا ہے۔ وہ حاصل ہے تو خلق خدا کی ملامت کی کیا وقعت ہے۔ تیسری بات لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا تکرار ہے۔ محض الفاظ کو دہرایا نہ جائے بلکہ معانی کو بھی ذہن نشین کیا جائے کہ حول و قوت خدا کے سوا کسی کے پاس نہیں۔

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہو گا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہو گا تیرے کرم سے ہو گا

مومن کامل

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجلس میں بہت سے لوگ موجود تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مجھ ہی کو مخاطب فرمایا شاید آپ کا مقصد یہ تھا کہ میرے ذریعہ آپ کا فرمان سب تک پہنچ جائے۔ فرمایا۔ اے عبداللہ ابن مسعود! اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان رزق کی تقسیم فرما دی ہے۔ اُسی طرح اخلاق بھی بانٹ دیئے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ رزق سب کو دیتا ہے انہیں بھی جو اسے محبوب ہیں اور انہیں بھی جو اسے ناپسند ہیں۔ البتہ دین پر چلنے کی توفیق صرف ان کو عطا ہوتی ہے جنہیں اللہ محبوب رکھتا ہے۔ یقین رکھو کہ سارے دیندار اور متقی لوگ اللہ کے محبوب بندے ہیں قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل اور اس کی زبان دونوں مسلمان نہ ہوں۔ اور کوئی بندہ اس وقت تک مومن کہلانے کا مستحق نہیں جب تک اس کا ہمسایہ اس کے ظلم و زیادتی اور غضب سے محفوظ نہ ہو۔

ابن مسعود! کان کھول کر سن لو حرام کمائی کمانے والا اللہ تعالیٰ کی برکت سے محروم رہتا ہے۔ اگر وہ اپنی حرام کمائی سے خیرات بھی کرے تو اس کی خیرات رائگاں جاتی ہے۔ اور جو مال وہ چھوڑ کر مرجاتا ہے اس کے لیے جہنم کا توشہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے نہیں بلکہ بھلائی سے مٹاتا ہے۔

ایک مرتبہ ابو رُزین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک) مجھے اس بات کا علم کیسے ہوگا کہ میرا ایمان کامل ہو گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری امت میں کوئی اللہ کا صحیح بندہ ایسا نہیں کہ جب نیکی کرے تو اسے غرور ہو کہ میں نے نیکی کی ہے البتہ اسے اس بات کی اُمید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کا اجر عطا فرمائیں گے لیکن جب کوئی برائی کرے تو اسے محسوس ہو کہ اس نے برائی کی ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے

حضور میں توبہ کرے اور اسے یقین ہو کہ سوائے اس ذات پاک کے کوئی بخشنے والا نہیں جب کسی بندے میں نیکی اور برائی کے بارے میں یہ صفات پیدا ہو جائیں تو سمجھ لو کہ ایسا شخص یقیناً مومن کامل ہے۔

مکافاتِ عمل

مجمع میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا "امام! یہ تو بتلایئے کہ صحیح معنوں میں عارف باللہ کون ہوتا ہے"، فرمایا سائل تو نے بہت اہم سوال کیا ہے۔ میرا جواب بھی سن لے کہ صحیح معنوں میں عارف باللہ وہ ہے جو اہل کلمہ کی زیادہ تعظیم کرے۔ خاکی مخلوق انسان تو زیادہ سے زیادہ خاک کا ایک پتلا ہے۔ البتہ ایمان کا نور جب اس کے سینے میں داخل ہو جائے تو پھر وہی خاک کا پیکر بعض نوریوں سے بھی افضل ہو جاتا ہے۔

جناب بکر بن عبداللہ مزنی نے فرمایا ہے کہ جب تم عمر کے اعتبار سے اپنے کسی بڑے کو دیکھو تو اس کی تعظیم کرو کہ اس نے اسلام قبول کرنے اور نیک اعمال کے انجام دینے میں تم سے سبقت کی ہے۔ اور اگر تم عمر میں اپنے سے کسی چھوٹے کو دیکھو تو اس کی بھی تعظیم کرو اور سمجھو کہ تم نے اس سے پہلے گناہوں کے ارتکاب میں سبقت کی ہے۔ ایک بات کبھی نہ بھولنا کہ جب لوگ تمہاری تعظیم کریں تو خبردار ان کی تعظیم کو دیکھ کر مغرور نہ ہو جا کیونکہ یہ اللہ کے احسان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہمیشہ یہ خیال کرو کہ میں اس تعظیم کا مستحق نہیں تھا یہ خالص اللہ تبارک و تعالیٰ کا احسان و بندہ نوازی ہے کہ اس نے لوگوں کے دلوں میں میری تعظیم کا جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ اصل منقلب القلوب اور دلوں کو پھیرنے والا وہی ہے۔

بکر بن عبداللہ مزنی نے مزید فرمایا کہ اگر لوگ تمہاری توہین کریں تو سمجھو کہ یہ توہین تمہارے کسی گناہ کے باعث ہے۔ کیونکہ اس دنیا کی کوئی مصیبت بے وجہ نہیں آتی۔ حتیٰ کہ کسی شخص کو ایک کانٹا بھی بغیر کسی وجہ کے نہیں چبھتا۔ ایک ٹھوکر

بھی بغیر کسی وجہ کے نہیں لگتی۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان کسی گناہ کا ارتکاب کر کے بھول جاتا ہے جب اس کی پاداش میں اسے کوئی اذیت پہنچتی ہے تو چونکہ اسے اپنا گناہ یاد نہیں رہتا اس لیے اذیت و تکلیف اس پر بھاری ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں نہایت واضح الفاظ میں بتلا دیا گیا ہے کہ جو مصیبت تمہارے اوپر آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہوتی ہے۔ فطرت ناانصاف نہیں ہے تم کھیت میں جو بوتے ہو وہی کاٹتے ہو۔ اگر فطرت تم سے گندم کے بیج لے کر جو نہیں دیتی۔ پھولوں کے بیج لے کر کانٹے نہیں دیتی تو یہ کیسے سمجھتے ہو کہ نیکی لے کر برائی دے گی۔ عذاب قبر کا بھی یہی فلسفہ ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قبر کی آگ۔ سانپ بچھو۔ بدبو کے بھبکے یہ دراصل ہمارے اعمال ہیں جو اس عالم میں یہ شکلیں اختیار کر کے انسان کو ستاتے ہیں۔ انسان کا غرور۔ اس کی بربریت۔ اس کی حرص اس کا بخل۔ اس کا حسد۔ کینہ کپٹ۔ حرام خوری اور قتل و غارت گری یہی وہ عادتیں ہیں جو قبر میں آگ۔ سانپ۔ بچھو بدبو اور اذیت ناک عذاب کی شکل میں متمثل ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ ہر انسان اپنا جہنم اور اپنی جنت اپنے ساتھ لے کر قبر میں جاتا ہے۔

بیمار پرسی

صحیح مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بعض آدمیوں سے دریافت فرمائے گا " اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تھا تو نے میری عیادت نہ کی؟ بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے جہان کا پروردگار ہے میں تیری عیادت کیونکر کرتا۔ جواب ملے گا۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ فلاں وقت میرا فلاں بندہ بیمار ہوا۔ تجھے اس کی بیماری کی اطلاع بھی ملی مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی حالانکہ اگر تو اس کی بیمار پرسی کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے اور عیادت کے آداب بھی سکھلائے ہیں اسلام کا نظریہ ہے

کہ مومن کو دنیوی زندگی میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذابِ شدید سے بچانے کے لیے وہ اس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ گناہوں کی آلائشوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مومن پر دوسرے مومن بھائی کے جو حقوق بیان فرمائے ان میں ایک حق یہ بھی بتلایا کہ اگر کوئی مسلمان بیمار پڑ جائے تو اس کی عیادت کرے۔ ابوداؤد شریف میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے عیادت کرنے والے کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں اور اگر وہ شام کو عیادت کرے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی کسی کی بیمار پرسی کے لیے جائے تو بیمار کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اس کو تسلی اور دلاسا دے اور اس کی شفایابی کے لیے اللہ سے دعا کرے۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی مومن زمانۂ صحت میں کوئی نفلی عبادت کیا کرتا تھا اور بیماری کے باعث اس کی وہ عبادت چھوٹ جائے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس مومن کے نامۂ اعمال میں اس کی نفلی عبادت بدستور لکھی جاتی رہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب مریض کی بیمار پرسی کے لیے جایا کرو تو خود اس کے لیے دعا کرو اور اس سے اپنے حق میں دعا کرایا کرو کیونکہ اس کی دعا فرشتوں کی دعا کی طرح ہوتی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بہترین بیمار پرسی یہ ہے کہ مریض کے پاس شور نہ کیا جائے اور زیادہ دیر تک اس کے پاس نہ بیٹھا جائے، کیونکہ زیادہ دیر تک مریض کے پاس بیٹھنے سے اسے تکلیف اور تنگی ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ مرض کی تکلیف سے تنگ آکر موت کی دعا مانگنے لگتے ہیں۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے کیونکہ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ

کی رحمت سے نااُمید ہونے کے مترادف ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے کہ اللہ کی رحمت سے کافر ہی نااُمید ہوتے ہیں۔ اللہ سے اچھی اُمید رکھنی چاہیئے۔

نومید مشو کہ ناامیدی کفرست

اتحاد اتفاق

اسلام کی آمد سے پہلے مدینہ کے انصار جن کی علاقے میں غالب اکثریت یہودیوں کے بندۂ بے دام بنے ہوئے تھے۔ درآمد و برآمد کا سارا کاروبار یہودیوں کے ہاتھ میں تھا۔ مدینہ میں ان کی بڑی بڑی آڑھتیں تھیں۔ مدینہ کے غریب کسان اور مزدور یہودی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے تسلط میں اس طرح گرفتار تھے کہ اس قید سے رہائی محال نظر آتی تھی۔ سودی کاروبار الگ غریبوں کا خون چوس رہا تھا۔ اوس اور خزرج انصار مدینہ کے دو بڑے بڑے قبائل تھے۔ ان کی اکثریت بُت پرست تھی۔ ان کے مقابلے میں یہودی اہل کتاب تھے۔ اس اعتبار سے بھی یہودیوں کو فوقیت حاصل تھی۔ یہودی سرمایہ دار اوس اور خزرج کو باہم لڑاتے رہتے اور ان کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر انہیں بے وقوف بناتے۔ عین اُسی وقت غار حرا سے خورشید ہدایت طلوع اور جزیرۃ العرب کو اپنی ضیا پاش کرنوں سے منور کرنے لگا۔ پھر وہ لمحہ بھی آیا جب اوّلین و آخرین کے امام رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جلو میں کونین کی دولت سمیٹے شہر یثرب میں داخل ہوئے اور چشم زدن میں شہر یثرب کو مدینۃ الرسول میں تبدیل فرما دیا۔ اگر سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے داخلے کے وقت بچیوں نے چھت پر چڑھ کر طلع البدر علینا کا نغمہ الاپا تھا تو یہ غلط نہیں تھا۔ سچ مچ مدینہ میں چاند طلوع ہوا تھا۔ ایسا چاند جس نے کوہ و دمن اور سہل و جبل سب کو بقعۂ نور بنا دیا۔ اسلام کا مدینہ میں داخلہ یہودیوں کو ایک آنکھ نہ بھایا اور انہوں نے جلدی محسوس کر لیا کہ اب وہ زیادہ دنوں تک مدینے کی غریب آبادی کو بے وقوف نہ بنا سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے جو غریبوں کے والی و وارث تھے اور اوس و خزرج کی صدیوں پرانی دشمنی کو مٹا کر انہیں بھائی بھائی بنایا۔ پھر مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کرائی۔ وہی یثرب جو مدینۃ الرسول بننے سے پہلے نفرت و عداوت۔ جنگ و جدال اور استحصال و استبداد کا مرکز تھا اب پیار اور محبت، اخوت و مساوات، شرافت و انسانیت کا قبلہ گاہ بنا۔ یہودیوں نے فوراً پینترا بدلا اور ان کی ایک جماعت نے اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے روپ میں اسلام کے قلعہ میں نقب لگانا شروع کر دی۔ اس گروہ کو قرآن کریم نے "گروہ منافقین" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور از روئے قرآن اس گروہ کا ٹھکانا جہنم کا سب سے نچلا درجہ ہے۔ اس لیے کہ منافقین کے گروہ نے اسلام کو جو نقصان پہنچایا اس کا عشرِ عشیر بھی اسلام کے کھلے ہوئے دشمن نہ پہنچا سکے۔ منافقین یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی قوت کا واحد راز ان کا اتحاد ہے۔ لہٰذا اگر کسی طرح ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا جائے تو اسلام خود بخود العیاذ باللہ فنا ہو جائے گا۔ اپنے اس ناپاک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ کبھی اوس و خزرج کی پچھلی کینہ آوریوں کو تازہ کرنا چاہتے۔ کبھی مقامی و غیر مقامی کا سوال اٹھا کر مہاجرین و انصار کو باہم ٹکرانے کی کوشش کرتے کبھی نسلی اور علاقائی تعصبات کو ہوا دیتے۔ مگر خیر القرون کے صحابہ کرام جن کی تربیت نگاہ نبوت نے کی تھی۔ بھلا ان فریب کاریوں کے جال میں کب پھنسنے والے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ان کے پیش نظر تھا اور قرآن ان کا امام۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر قیامت تک کفار و مشرکین کی جماعت رہے گی۔ اسی طرح منافقین بھی ہر دور میں رہے ہیں اور ہر دور میں رہیں گے۔ اُس وقت بھی ان کا حربہ نسلی، علاقائی اور لسانی تعصبات کو ہوا دے کر اسلامی اخوت کو پاش پاش کرنا تھا اور آج بھی ان کا حربہ یہی ہے۔ اور قیامت تک اُن کا حربہ یہی رہے گا۔ مگر ایمان والوں کی برادری نے جیسے پہلے ان گھٹیا اختلاف و تعصبات کو اپنے پاؤں سے روند ڈالا تھا آج بھی پامال کر دے گی۔ ان شاء اللہ۔

مقروض کو مہلت دینا

سود خوری انسان سے جوہرِ انسانیت چھین کر اسے سنگ دل بنا دیتی ہے۔ ہمدردی، محبت، مواساۃ اور اخوت کے الفاظ سود خور کے لیے بے معنی ہیں۔ وہ تو صرف مالی فائدہ چاہتا ہے۔ چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔ اسلام سے قبل عربوں کا تو یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص قرض ادا نہیں کر سکتا تھا تو اسے غلاموں کی طرح فروخت کر کے اس کی قیمت سے اپنا قرض وصول کر لیا کرتے۔ یہ صورتِ حال عرب ہی کی نہ تھی اس وقت کی متمدن دنیا کا یہ عام چلن تھا۔ قرآن کریم نے اس ظالمانہ سرمایہ داری نظام پر کاری ضرب لگائی۔ اور حکم دیا کہ اگر کوئی تنگدست تمہارا مقروض ہو تو فراخی تک اسے مہلت دو اور اگر معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ مہلت دینے اور معاف کر دینے کے فوائد کا آج احساس نہیں ہوتا لیکن ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب اپنے پرائے اور یگانے بیگانے ہو جائیں گے۔ جب رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ انسان ہوگا اور قبر کا گمبھیر۔ کبھی نہ ختم ہونے والا اندھیرا نرم و گداز بستر ہونگے نہ اعزاء و اقربا۔

تربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا

اس دن مہلت دینے اور اپنے کسی تنگدست بھائی کو معاف کر دینے کا فائدہ نظر آئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص مقروض کو فراخی حاصل ہونے تک مہلت دے یا اسے معاف ہی کر دے تو یہ ایسا ثواب کا کام ہے کہ اگر اس کے سوا اور کوئی نیکی کا کام نہ بھی کرے تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ بخاری و مسلم شریف میں روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گزشتہ امتوں میں ایک شخص ایسا تھا جو نیکی کا کوئی کام نہیں کرتا البتہ وہ لوگوں کو قرض دیا کرتا

اور جب اس کو کوئی مقروض تنگ دست نظر آتا تو وہ اپنے ملازموں سے کہتا کہ اس سے درگزر کرو شاید اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں سے بھی درگزر کرے۔ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی نیکی کی بدولت اس کے گناہوں کو معاف فرما دیا۔ مسند امام احمد بن حنبل میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے قرض دار کو مہلت دے گا یا اس کا قرض معاف کر دے گا قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ میں ہو گا۔ مسلم شریف کی حدیث میں ہے آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی سختیوں سے نجات دے اسے چاہیئے کہ قرض دار کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے۔ احسان کرنے کے معاملے میں اسلام نے مسلم و غیر مسلم کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ صحابہ کرام میں بہت سے ایسے حضرات بھی تھے۔ جو غیر مسلموں پر صدقہ کرنے کو ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے۔ حکم ہوا کہ ہدایت دینا تمہارا نہیں میرا کام ہے۔ تمہیں بلا امتیاز ہر مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی چاہیئے۔ اور اپنی نیت کو درست رکھنا چاہیئے تمہیں جو بھی اجر و ثواب ملے گا تمہاری نیت کی بنیاد پر ملے گا۔ ایک دن ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک اگر میں کسی کے پاس جاؤں اور وہ میری میزبانی نہیں کرتا تو کیا جب وہ میرے پاس آئے تو میں بھی اس سے اسی طرح کی بداخلاقی کروں؟ ارشاد ہوا نہیں! تم اس کی میزبانی کرو کہ احسان محدود نہیں۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

حسد اور اس کا علاج

رشک و منافست نہ تو بُری چیز ہے اور نہ ممنوع۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو علم۔ صحت اور دولت دے اور دوسرا شخص ان انعامات کو دیکھ کر یہ خواہش کرے کہ ویسا ہی علم اور ویسی ہی صحت و دولت اسے بھی حاصل ہو جائے تو یہ کوئی بُری بات نہیں ہے البتہ اگر کوئی شخص دوسرے شخص کی نعمت کے زوال

کی آرزو کرے تو یہ بُری بات ہے۔ مثلاً یہ خواہش کرنا کہ فلاں شخص جو دولت مند ہے فقیر ہو جائے یا عزت دار ہے تو ذلیل و رسوا ہو جائے یا اللہ تعالیٰ نے اگر اس کو کوئی عہدہ یا منصب دیا ہے تو اس کا عہدہ اور منصب چھن جائے۔ اس چیز کو حسد کہتے ہیں۔ اور حسد تمام گناہوں میں بدترین گناہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ آسمانوں پر سب سے پہلا گناہ حسد تھا کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام پر حسد کیا۔ اور زمین پر بھی پہلا گناہ حسد ہی تھا کہ قابیل نے ہابیل پر حسد کیا تھا۔ حسد کا علاج نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ ہمدردی، غمخواری، محبت، اعانت اور خیر خواہی میں بالکل اپنے نسبی بھائی کی طرح ہو جاؤ۔ صحیح بخاری شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔ نہ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ نہ باہم حسد کرو نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو نہ باہم بغض رکھو بلکہ اے خدا کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔

ابوداؤد شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خبردار حسد کرنے سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ حسد اتنی ناپسندیدہ اور خطرناک چیز ہے کہ قرآن کریم کی سورۂ فلق میں اللہ تعالیٰ نے حاسد کے حسد میں جو شر ہے اس سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔

علامہ ابن رجب حنبلی نے اپنی کتاب جامع العلوم والحکم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ابلیس نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ میں ابن آدم کو دو خصلتوں کے ذریعہ ہلاک کرتا ہوں ایک تو حسد اور دوسری حرص۔ ترمذی اور مسند امام احمد میں حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے اندر بھی آگے چل کر وہ مرض داخل ہو جائے گا جو تم سے قبل کی امتوں میں تھا وہ حسد اور بغض

کا مرض ہے۔ علماء نے اس مرض کو زائل کرنے کی ترکیب یہ بتلائی ہے کہ جس شخص پر حسد ہو اس کے ساتھ احسان کرنا شروع کرے اور اس کے لیے دعا کرے اور اس کی خوبیاں لوگوں کے درمیان بیان کرے اگر یہ عمل بار بار کرے تو انسان کے دل سے حسد خود بخود دور ہو جاتا ہے حاسد کے حسد میں جو شر ہے اس سے بچنے کی ترکیب بھی یہی ہے کہ حاسد کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اور خود کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی سپردگی میں دیدے۔ جو صحت مال عزت اور منصب انسان کو ملتا ہے وہ اللہ ہی کی دین ہے لہٰذا اس کی حفاظت بھی وہی کر سکتا ہے۔ اگر انسان اپنے کمالات کو خدا کا انعام سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے ذمہ اس کی حفاظت کر دے تو اللہ تعالیٰ خود اس کا محافظ ہو جاتا ہے اس وقت حاسد کا حسد اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حاسد کے حسد کے شر سے بچنے کے لیے یہ عمل تجویز کیا ہے کہ روزانہ کچھ نہ کچھ صدقہ کرے۔ صدقے کو ردّ و بلاء میں خاصا دخل ہے۔ اور حاسد کا حسد ایک قسم کی بلا کے سوا اور کیا ہے۔

کینہ اور حسد

نبوت کا دربار ذی وقار سجا ہوا ہے کہ ایک بدو اپنی اونٹنی سے اترا۔ قدم غبار آلود۔ بال پریشان۔ کپڑے گرد غبار میں اٹے ہوئے۔ چہرے پر تکان ہے۔ اونٹنی دروازے پر باندھی اور دربار نبوت میں حاضر ہو گیا۔ اسے اپنی کم عملی کا احساس بھی ہے اور احساس زیاں الگ دامن گیر۔ شرماتے شرماتے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں صرف رمضان کے روزے رکھتا ہوں ان کے علاوہ نفل روزے نہیں رکھتا۔ یہی حال نمازوں کا ہے کہ بس پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں ان کے علاوہ نماز بھی نہیں پڑھتا۔ میرے پاس اتنا مال نہیں کہ زکوٰۃ واجب ہو نہ زاد راہ ہے کہ حج فرض ہوتا۔ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ اگر اس حال میں میں مر جاؤں تو میں کہاں جاؤں گا؟ جنت میں کہ دوزخ میں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بات سن کر مسکرا اٹھے اور ارشاد فرمایا کہ اگر تو

اپنے دل کو کینے اور حسد سے زبان کو غیبت اور جھوٹ سے اور نگاہ کو غیر محرم پر ڈالنے اور لوگوں کے عیوب کو تلاش کرنے سے بچائے رکھے تو یقین رکھ کہ تو اپنے انہیں تھوڑے سے اعمال کی بنیاد پر میرے ساتھ جنت میں داخل ہو گا۔ کینہ دل کو ناپاک اور حسد دل کو سخت اذیت میں مبتلا کرنے والی چیز ہے۔ کہ ایک انسان اس بات کی خواہش نہیں کرتا کہ جو دولت، عزت اور جاہ و منصب محنت اور کوشش سے میرے بھائی نے حاصل کیا ہے میں بھی محنت کر کے اسے حاصل کروں بلکہ حاسد زوال نعمت کا طلب گار ہوتا ہے۔ گویا خدا کی خدائی میں دخل دینا چاہتا ہے حالانکہ عزت و ذلت حیات موت اور رزق میں تنگی و فراخی کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی نافع ہے اور وہی ضار۔ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے زمین کی پیٹھ کا بوجھ اور فلک کے دل کا غبار بنا دے۔ انسان ضعیف انسان معمولی سی قوت و قدرت پا جانے کے بعد اپنے جامے میں نہیں سماتا۔ سر غرور بلند کرتا ہے۔ جسے توڑ کر پامال کر دینا اللہ جل جلالہ نے اپنے اوپر واجب قرار دیا ہے۔ اور قدرت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو اشجار سے سایہ دور ہو جاتا ہے اور چشمے اُبلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ عظمت و کبریائی صرف اسی ذات بے ہمتا کو زیبا ہے جو خالق و مالک اور حی و قیوم ہے۔ اور اس کی نظر میں معزز و مکرم وہ ہے جو عاجزی و خاکساری کا پتلا اور صدق و صفا کا پیکر ہو۔ وہی ہو گا جو کل قیامت کے دن سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی تھامے پہلے جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور بڑے بڑے منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

عمل صالح

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک سب سے اچھا کون آدمی ہے آپ نے ارشاد فرمایا جس کی عمر طویل ہو

اور عمل بہتر ہو۔ اس نے عرض کیا اور سب سے خراب آدمی کون ہے؟ ارشاد ہُوا جس کی عمر طویل ہو اور عمل خراب ہو۔ اعمال صالحہ کے ساتھ طویل عمر بھی اللہ کے انعامات میں سے ایک انعام ہے۔ لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے طویل عمر دے اور وہ اس کے اس انعام کی ناقدری کرے اس کے عائد کردہ فرائض ادا نہ کرے ایسا شخص بڑا ہی بدنصیب ہے کہ اسے مواقع بھی میسّر ہوئے لیکن اس نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا جامع الترمذی میں حضرت ابوکبشہ انماری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آج میں تین باتیں موکد بقسم کہوں گا اور ایک ایسی بات بیان کروں گا جسے تم لوگ ہمیشہ یاد رکھنا۔ وہ تین باتیں یہ ہیں کہ جو بندہ صدقہ خیرات کرے گا اس کا مال کبھی کم نہ ہو گا۔ یعنی صدقات و زکواۃ کی ادائیگی سے مال ہمیشہ بڑھتا ہی جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ اگر کسی بندے پر کوئی شخص ظلم کرے اور وہ بندہ صبر کر لے تو اللہ تعالیٰ اس مظلوم کی عزت بہت جلد دوبالا کر دے گا۔ اور تیسری بات یہ کہ جو مانگنے کا دروازہ کھولے گا اللہ تعالیٰ اس پر فقر و مفلسی کا دروازہ کھول دے گا۔ اس طرح وہ شخص ہمیشہ مانگتا رہے گا اور اس پر افلاس مسلط ہو جائے گا۔ اور وہ بات جسے میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ ہمیشہ یاد رکھو یہ ہے کہ یہ دنیا چار قسم کے آدمیوں کے لیے ہے۔ ایک تو وہ آدمی جسے اللہ نے مال بھی دیا اور علم بھی دیا۔ اور اس نے اپنے علم کے ذریعہ تقویٰ اختیار کیا اور اپنے مال سے اپنے عزیز و اقربا کی مدد کی اس طرح اس نے مال اور علم دونوں کے حقوق اللہ کے لیے ادا کیے۔ اس طرح کا شخص سب سے اونچے درجے کا شخص ہے۔ دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے علم تو دیا لیکن مال نہیں دیا وہ تقویٰ شعار تو رہا لیکن ہمیشہ یہ خیال کرتا تھا کہ اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی اسی طرح اس مال کے ذریعہ اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرتا۔ یہ دونوں قسم کے لوگ مرتبے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اس لیے کہ دوسرا اپنی نیت میں سچّا تھا۔ تیسرا وہ آدمی ہے جسے اللہ نے مال تو دیا لیکن علم نہیں دیا۔ اور اس نے اپنے مال کو نفسانی خواہشات کی تکمیل اور

لھو ولعب میں اڑا یا۔ اس نے خدا کا خوف کیا نہ اپنے مال سے اپنے غریب رشتہ داروں کی مدد کی اور نہ مال کے حقوق ادا کیے ایسا شخص بدترین درجے میں ہو گا اور چوتھا وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نہ مال ہی دیا نہ علم۔ مگر وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں اُسے اُسی طرح عیاشیوں میں اُڑاتا جس طرح فلاں شخص اُڑا رہا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی بدنیتی کے سبب بدترین آدمی قرار دیا جائے گا۔

علم و عمل

ایک عالم شخص شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔ اور عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کو دیگر ستاروں پر کیونکہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء کی وراثت درہم و دینار نہیں۔ علم ہے۔ جو اسے سنبھال لے وہی درحقیقت وارث انبیاء ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا انبیاء کی میراث نہ دینار تھا اور نہ درہم بلکہ ان کی میراث علم تھی۔ سو جس نے وہ حاصل کیا اس نے بہت کچھ حاصل کر لیا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے کہ علم ہر کس و ناکس کو نہ دیدیا کرو۔ یہ بڑی قیمتی متاع ہے۔ اس لیے بغیر قیمت لیے کسی کو نہ دینا۔ لوگوں نے پوچھا جناب! علم کی کیا قیمت ہے؟ فرمایا اس کا ایسے شخص کے پاس رکھنا جو خوبی کے ساتھ اس کا بار اٹھالے اسے باحفاظت رکھے اور اسے ضائع نہ کر دے علم کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ عالم بے عمل اس نابینا کی مانند ہے جس کے ہاتھ میں چراغ ہو دوسرے تو اس سے فائدہ اٹھا رہے ہوں اور وہ خود چراغ کے فوائد سے محروم ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی دو قسمیں بتلائی ہیں۔ ایک علم نافع دوسرا علم غیر نافع۔ علم نافع اسے کہتے ہیں جو خالق کی معرفت عطا کرے۔ اور انسان کی توجہات کو خلق سے خالق کی طرف ملتفت کرے۔ جو انسان کو بتلائے کہ اس کارگہ حیات اور کائنات ہست و بود میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ وہ کیوں پیدا کیا گیا؟ اسے اس دنیا میں کیا کردار ادا کرنا چاہیئے؟ اسے خلق و خالق کے حقوق کس

طرح ادا کرنے چاہئیں؟ یہ وسیع و عریض کائنات۔ یہ گہرے سمندر۔ یہ اونچے اونچے پہاڑ۔ یہ محفل انجم یہ چرخ نیلگوں۔ یہ دو خورشید۔ باد نسیم کے یہ جھونکے۔ پھولوں بھرا یہ صحن گلستاں صبح کا یہ چہرہ خنداں۔ شام کا یہ جلوۂ محجوب۔ لیل و نہار کی یہ گردش ہوا کے دوش پر سوار ہو کر بادلوں کا یہ آنا اور چشم زدن موتی بکھیر دینا پیاسی زمین کو سیراب کرنا۔ چڑیوں کا یہ چہچہانا۔ وحشی جانوروں کی جنگلوں میں یہ کلبلیں۔ پھولوں کی یہ مہک اور غنچوں کی یہ چٹک یہ سب کیوں ہے؟ آخر قدرت چاہتی کیا ہے۔ مخلوقات میں حسن و زیبائش کے یہ سارے کرشمے کسی محبوب حقیقی اور خالق کل کے عکس رُخ تو نہیں؛ اگر یہ پہچان لیا تو علم علم نافع ہے۔ ذریعہ نجات اور وسیلہ شرف و فضیلت ہے۔ ورنہ ابلیس سے بڑھ کر کون عالم ہو گا۔ وہ تو معلم الملکوت تھا۔ فرشتوں کا بھی استاد۔ مگر اس کا علم ہی اُس کے لیے سامانِ لعنت بنا۔ اس لیے کہ کبر و نخوت نے اس کے علم کے چشمہ صافی کو آتش سیال بنا دیا تھا۔ جس نے لمحے بھر میں سب کچھ جلا کر بھسم کر دیا۔ علم چاہے دینی ہو یا دنیوی اس وقت تک نافع ہے جب تک وہ انسانیت کے لیے مفید راحت رساں اور سکون بخش ہے۔ لیکن وہی علم جب غیر نافع بن جاتا ہے تو پھر ہیروشیما اور ناگا ساکی کی داستانیں دہرائی جانے لگتی ہیں، بیروت کی سرسبز پہاڑیاں جہنم کدہ اور افغانستان کے خوبصورت مرغزار گور غریباں اور گنج شہیداں کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں اسی لیے رحمۃ للعالمین ﷺ نے علم غیر نافع سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔

خوش اخلاقی

شرح السنۃ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان اپنے کسی مسلمان بھائی کی عزت کی حفاظت کرے اور اس کی غیبت کرنے والے کو غیبت سے روکے تو اللہ تعالیٰ کا

یہ وعدہ ہے کہ وہ قیامت کے دن اس مسلمان کو جہنم کی آگ سے بچائے گا۔ عرب کے لوگ زمانۂ جاہلیت میں اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت عُقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو مسلمان کسی مسلمان کے گناہ کو دیکھے اور اس پر پردہ ڈال دے وہ ایسا ہی ہے جیسے کہ اس نے کسی زندہ درگور کی جانے والی بچی کو قبر سے نکال لیا ہو۔ مسلمان تو مسلمان کے لیے آئینے کے مثل ہوتا ہے۔ جب تم اپنا چہرہ آئینے کے سامنے کرتے ہو تو آئینہ تمہیں بتا دیتا ہے کہ تمہارے چہرے پر کس جگہ داغ یا دھبہ ہے اور تم آئینہ دیکھ کر اس دھبے کو مٹا ڈالتے ہو لیکن وہ آئینہ تمہارے چہرے کے عیب کو کسی دوسرے شخص پر ظاہر نہیں کرتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین شخص وہ ہے جو اپنے دوست احباب کے لیے بہترین ہو اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بہتر برتاؤ کرے۔ شعب الایمان میں بیہقی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک دن حضور کی خدمت میں ایک صحابی نے ایک عورت کی عبادت و ریاضت اور کثرت سے نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے کا تذکرہ کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود وہ عورت اپنی بدزبانی سے اپنے پڑوسیوں کو ستاتی ہے۔ آپ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ وہ عورت جہنمی ہے صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک مگر میرے قریب ہی ایک اور عورت رہتی ہے وہ صرف پنج وقتہ نماز پڑھتی ہے اور فرض روزے رکھتی ہے نہ تو کثرت سے نوافل پڑھتی ہے نہ نفل روزے رکھتی ہے البتہ زبان کی بڑی میٹھی ہے۔ اپنے پڑوسیوں کو ستاتی نہیں آپ نے فرمایا وہ جنتی ہے۔

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا میٹھا بول بھی صدقے میں شمار ہوتا ہے یعنی اگر تم مال و دولت سے ہاتھ اور پاؤں سے کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں تو نہ

سہی۔ ایک میٹھی بات تو کہہ سکتے ہو۔ زبان سے کسی کو دلاسا تو دے سکتے ہو دلاسا ہی دیدو۔ شرافت اور ہمدردی سے کسی سے گفتگو کر لو یہ بھی عبادت میں داخل ہے۔ کیونکہ اللہ کی مخلوق اللہ کے کنبے کے مثل ہے۔

عصبیّت

اُحد پہاڑ کے دامن میں گھمسان کا رن پڑا ہوُا تھا۔ تلواروں سے تلواریں اور نیزوں سے نیزے ٹکرا رہے تھے۔ تیروں کی بارش الگ تھی۔ ایک مُشرک ابو عُقبہ مولیٰ فارسی کی طرف بڑھا۔ اور تلوار کا وار کیا۔ ابو عقبہ معمولی جوان نہ تھا۔ وار سنبھالا اور بڑھ کر جوابی حملہ کیا۔ تلوار چلاتے وقت ابو عقبہ کی زبان سے ایک جُملہ نکل گیا۔ "اچھا تو لے سنبھال اس فارسی غلام کا وار" اس طرح کے جملے اُس دور میں عموماً تیغ آزما کہہ دیا کرتے تھے۔ کہ ذرا جذبہ بھی بیدار ہو اور دشمن بھی مرعوب۔ مگر ابو عقبہ کو کیا خبر تھی کہ اس پر نبی رحمت ﷺ کی تیز و تند نگاہیں مرتکز ہیں۔ مڑ کے دیکھا تو رحمت مجسم غضب آموز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ابو عقبہ حیران رہ گئے۔ میں نے ایسا کونسا جرم کر دیا۔ کونسی غلط بات میرے منہ سے نکل گئی کہ آپ اس طرح غصّے سے گھور رہے ہیں ابو داؤد شریف میں ہے کہ سرکار ﷺ اسی گھمسان کی لڑائی میں ابو عقبہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا "تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ اس انصاری غلام کا وار سنبھال" ابو عقبہ اعربی عجمی خطِ امتیاز نہیں کفر و اسلام اور انصار و مہاجر اصل میں مابہ الامتیاز عناصر ہیں۔

سراقہ بن مالک بن جُعشم سے روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص عصبیت کی طرف دعوت دے یا عصبیت کی بنیاد پر قتال کرے یا بر بنائے عصبیت اس کی موت واقع ہو وہ میری جماعت سے خارج ہے۔ اس لیے کہ عصبیت خواہ کسی قسم کی ہو نسلی ہو، علاقائی ہو، لسانی ہو، برادری کی ہو اسلامی قومیت کی جڑ کو کاٹ دینے والی چیز ہے۔ اسلام نے رنگ۔ نسل

ذات پات ۔ زبان و تمدن ۔ وطن اور علاقے پر قسم کی عصبیت کو مٹا کر صرف ایک شناخت کو باقی رکھا ہے اور وہ ہے الاسلام ملۃ واحدۃ والکفر ملۃ واحدۃ اور اس طرح ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کی جس کے افراد ایک ہی دستر خوان پر کھاتے ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ایک ہی مدرسے میں ہم زانو ہو کر بیٹھتے اور علم حاصل کرتے چاہے خطاب کے بیٹے عمر تھے یا حبش کے بلال روم کے صہیب اور فارس کے سلمان ۔ سب ایک ہی کنبے کے فرد اور ایک ہی خوان نعمت کے پروردہ تھے۔

ایک دن واثلہ بن اسقع نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک عصبیت کہتے کسے ہیں فرمایا ، عصبیت یہ ہے کہ تو اپنے قبیلے کے آدمی کی محض ہم قبیلہ ہونے کی وجہ سے ظلم کے کاموں میں مدد کرے۔

ابن ماجہ میں ہے کہ ایک شخص نے ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا اپنے قبیلے کے لوگوں سے محبت کرنا بھی عصبیت میں داخل ہے ؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں ۔ عصبیت تو یہ ہے کہ اپنے قبیلے کے آدمی کے ساتھ ظلم کے کاموں میں بھی تعاون کیا جائے ۔ معلوم ہوا کہ صحیح مومن وہ ہے جو حق کا ساتھ دے اور باطل کی مخالفت کرے ۔ وہ حق اگر باپ کے قاتل کے ساتھ بھی ہے تو پھر حق کی حمائیت کی جائے اور اگر اپنے حقیقی بھائی کا مؤقف باطل ہے تو ہرگز ہرگز اس کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔

دین کا رشتہ اور مولائے کائنات علیہ السلام کا طوق غلامی ہر رشتے اور ہر تعلق سے افضل ، پائیدار اور نجات دہندہ ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

دو جماعتوں نے مل کر ایک جہاز کرایہ پہ لیا ۔ جہاز کی دو منزلیں تھیں ۔ بالائی منزل پہ اچھے اور شریف لوگ سوار ہو گئے ۔ وہاں ہر قسم کی آسائشیں میسر تھیں۔

پانی کا ذخیرہ تھا۔ شور و شغب بھی نہیں تھا۔ لوگ بھی بڑے پاک نہاد اور پاک باز تھے۔ ہر شخص فکرِ آخرت میں غرق اور آخرت میں سرگرداں۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ سارے کے سارے باجماعت نماز ادا کرنے والے۔ کوئی کسی کی غیبت بھی نہیں کرتا۔ عیب چینی نہیں کرتا۔ کسی کا حق نہیں مارتا۔ حرام نہیں کھاتا۔ کوئی کسی پر ظلم کرتا ہے نہ ایذا رسانی پاکیزہ ماحول اور پُرسکون سفر ہے۔ اس کے برخلاف جہاز کے نچلے حصّے میں جو لوگ ہیں بات بات پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ مار کٹائی ان کا شیوہ ہے۔ ان کی اکثریت اسلامی اخلاق سے عاری ہے۔ حرام و حلال کی کوئی تمیز نہیں۔ بڑے نہ چھوٹوں پر شفقت کرتے ہیں نہ چھوٹے بڑوں کا ادب۔ کسی کو بھی حقوق و فرائض کا خیال ہے نہ شرافت و شائستگی کا۔ اپنی اپنی دھن میں مگن ہیں۔ نتائج سے بے خبر۔ کل کیا ہوگا؟ ہماری بداعمالیاں کیا گُل کھلائیں گی، اس کی کسی کو خبر نہیں۔

جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔ کسی نے بالائی منزل والوں سے کہا کہ ان لوگوں کو منع کرو۔ انکی بداعمالیاں رنگ لاکر رہیں گی۔ ان پاکبازوں نے ناک پر رومال رکھ لیے۔ ان کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔ ہمیں کیا۔ یہ جو کرتے ہیں اس کا بدلہ پائیں گے۔ ہمیں تو اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ بس اپنی اپنی فکر ان گندے لوگوں سے دور ہوکر کہیں ہمارے وجود میں بھی بدی کے جراثیم داخل نہ ہو جائیں۔ البتہ ان لوگوں کو ایک بات کی پریشانی تھی۔ وہ یہ کہ پانی کا ذخیرہ بالائی منزل میں تھا۔ نچلی منزل کے لوگ اوپر پانی لینے آتے کچھ پانی بھرتے اور کچھ گراتے اس طرح جہاز کی بالائی منزل کا ستیاناس ہو جاتا۔ ہر آدمی انہیں دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتا۔ ایک دن نہ رہا گیا تو اُوپر والوں نے نیچے والوں سے کہا کہ تم اپنا ناپاک وجود لے کر اُدھر کا رُخ نہ کیا کرو۔ کل سے اُوپر نہ آنا۔ ہم لوگوں کو تمہارے آنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ تمہارے منحوس چہرے دیکھ کر ہمیں کراہت ہوتی ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ نچلی منزل کے لوگوں نے مشورہ کیا۔ پانی کے بغیر تو ہم

رہ بھی نہیں سکتے۔ چند سر پھرے اُٹھے کلہاڑیاں ہتھا لیں اور جہاز کے نچلے حصے کے تختے نکالنے لگے۔ اُوپر کے صالحین کو جو پتہ چلا تو ہڑبڑا کر نیچے اُترے۔ دیکھا کہ تنومند اور تند خو نوجوان کلہاڑیاں لیے جہاز کا تختہ الگ کرنے میں مصروف ہیں۔ خدایا خیر! اب کیا ہوگا۔ اگر ان دیوانوں کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے اور یہ تختہ نکالنے میں کامیاب ہوجائیں تو سمندر کا پانی جہاز میں داخل ہوجائیگا پھر کیا یہی ڈوبیں گے؟ ہم بچ جائیں گے ایسا تو نہیں ہوگا۔ ان کے ساتھ ہم بھی ڈوب کر ہلاک ہوجائیں گے۔ لہذا بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لینا چاہیئے ان کی بقا اور سلامتی کی خاطر نہیں بلکہ اپنی سلامتی کے لیے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے نیک لوگوں اور بروں کا یہی حال ہے۔ کہ سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں لہذا اگر صالحین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملے میں سستی برتیں گے تو دونوں ہلاک ہونگے۔ سب کو مل جل کر بدی کو مٹانا اور نیکی کو پروان چڑھانا ہوگا۔ تب کہیں جاکر یہ کشتی ساحل مراد پر پہنچے گی۔

بیٹی کی عظمت

ظہورِ اسلام سے قبل اہلِ عرب لڑکی کی ولادت کو باعث ننگ و عار سمجھتے تھے چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصّہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے وہ اس خوش خبری کے رنج میں لوگوں سے منہ چھپائے چھپائے پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس بچّی کو ذلت اٹھا کر اپنے پاس رکھے یا کہیں لے جاکر زندہ دفن کردے۔ اس طرح ہزاروں لڑکیاں زندہ دفن کردی جاتیں ان کا کوئی والی و وارث تھا اور نہ کوئی ان کی فریاد سُننے والا۔ کہ وہ ظاہر ہوا جو دنیا جہان کے دکھیاروں کا والی و وارث۔ ہمدرد و غم گسار سب کو سہارا دینے والا۔ اپنے دامانِ رحمت میں سب کو پناہ دینے والا۔ رحمۃ للعالمین سیّد الاوّلین والآخرین تھا۔ جو آیا ہی اسی لیے تھا کہ گرتوں کو سنبھالا دے بھٹکے

ہوؤں کو راہ دکھائے بیمار روحوں کو صحت بخشے۔ جس کا دل سب کے لیے تڑپتا تھا۔ جو اس کے راستے میں کانٹے بچھاتے وہ ان پر پھولوں کی بارش کرتا۔ بھلا انسانیت کے اس مظلوم طبقے پر ہونے والے مظالم کو کیسے برداشت کر سکتا تھا چنانچہ آپ اسلام قبول کرنے کے بعد ہر شخص سے بیعت لیتے کہ اولاد کو قتل نہ کریں گے قرآن کریم میں اعلان کیا گیا کہ "قیامت کے دن زندہ دفن کی جانے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی" اس دن اگر تم نے اپنی اولاد کو قتل کیا ہے تو جواب دینا پڑے گا۔ دارمی میں ایک مرفوع روایت ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیک، ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں بتوں کو پوجتے تھے۔ اور اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے ایک واقعہ تو مجھے بھلائے نہیں بھولتا کہ میری ایک نہایت ہی بھولی بھالی خوبصورت سی بچی تھی۔ میں جب بھی اسے بلاتا وہ بابا بابا کہہ کر دوڑتی ہوئی میرے پاس چلی آتی۔ ایک دن میں نے اسے بلایا وہ حسب عادت خوشی خوشی دوڑتی میرے پاس آئی تو میں آگے بڑھنے لگا وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی میں آگے ہی بڑھتا چلا گیا اور وہ پیچھے پیچھے چلتی رہی یہاں تک کہ میں ایک کنویں کے قریب پہنچ گیا۔ اور جب وہ میرے پاس آئی تو میں نے اسے اٹھا کر کنویں میں ڈال دیا۔ وہ ابا ابا پکارتی رہی یہاں تک کہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ یہ واقعہ بیان کر کے جب اس نے رحمت کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا تو آپ اشک بار تھے اور آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر تھی۔ ایک صحابی نے اس کو ڈانٹا کہ تم نے رسول اللہؐ کو غمگین کر دیا تو آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو اس پر جو مصیبت پڑی ہے وہ اس کا علاج دریافت کرنے آیا ہے۔ پھر فرمایا۔ اے شخص جا اور نئے سرے سے عمل شروع کر جاہلیت کے گناہ اسلام قبول کرنے کے بعد معاف ہو گئے۔ آپ نے لڑکی کو جو پہلے عار و شرم کا باعث تھی عزت و سعادت کا وسیلہ بنا دیا اور ارشاد فرمایا جسے اللہ لڑکی دے اور وہ

اس سے محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ بچی اسے دوزخ کے عذاب سے بچا لے گی اور اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی۔ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت کے دن وہ میرے قریب اس طرح ہو گا جیسے میری یہ دو انگلیاں۔

اچھا طریقہ رائج کرنے کی فضیلت

حضرت جریر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ مسجد نبوی میں صبح کے وقت جب قبیلہ مضر کا وفد داخل ہوا تو حضور ﷺ کا چہرہ مبارک وفد کے ارکان کو دیکھ کر زرد پڑ گیا۔ سب کے سب مضری تھے۔ ملبے تڑنگے۔ تلواریں باندھے ہوئے موٹے موٹے کمبل لپیٹے۔ نیم برہنہ۔ غربت و افلاس کے سبب انہیں اتنے کپڑے بھی میسر نہ تھے کہ پوری طرح اپنا تن ڈھانکتے ان کا یہ افلاس اور بوسیدہ حالی دیکھ کر رحمۃ للعالمین ﷺ اداس ہو گئے۔ کبھی گھر میں جاتے کبھی باہر آتے۔ مگر کاشانۂ نبوی میں بھی سوائے نام خدا کے کچھ نہ تھا ———

اتنے ہی میں نماز کا وقت آ گیا۔ اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسجد نمازیوں سے بھر گئی، سرکار دو عالم ﷺ نے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد آپ نے قرآن کریم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا "لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے مضری بھائیوں کی مدد کے لیے صدقہ دیں۔ دینار ہو۔ درہم ہو۔ کپڑے ہوں کہ ایک صاع گیہوں ہی ہو۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے پاس کھجور کا آدھا ٹکڑا ہو تو وہی دیدے سید دو عالم ﷺ نے یہ الفاظ کچھ ایسی دردمندی اور شفقت سے فرمائے کہ لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ انصار کا ایک آدمی اٹھا اور ایک تھیلی پیش کی جو درھموں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے لوگوں نے اٹھ اٹھ کر صدقہ دینا شروع کیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں غلے۔ کھجوروں۔ نقدی اور کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اب حضور ﷺ کا وہی چہرۂ

مبارک جو تھوڑی دیر پہلے قبیلہ مضر کے وفد کی غربت اور بدحالی کو دیکھ کر زرد پڑ گیا تھا۔ کندن کی طرح چمکنے لگا ایسا لگتا کہ آپ کے چہرۂ انور پر سونے کا پانی چڑھا دیا گیا ہو۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ

جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ رائج کرنے میں پہل کرتا ہے اس کو اس کے عمل کا اجر تو ملے گا ہی ان لوگوں کے اجر کے برابر بھی اسے اجر ملے گا جو آئندہ اس پر عمل کریں گے اور جس نے اسلام میں کسی بڑے طریقے کو جاری کیا اسے اس کا گناہ تو ہوگا ہی اس کے بعد بھی جو لوگ اس گناہ کا کام کریں گے اُن کا گناہ بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا بغیر اس کے کہ اُن کے گناہ میں کمی ہو۔ اشارہ تھا اس انصاری کی طرف جس نے درھموں کی تھیلی سے صدقے کا آغاز کیا تھا۔

آداب کی حقیقت

بزرگوں نے کہا ہے کہ طریقت سرتاسر ادب ہی ادب ہے۔ اگر اس راہ کے آداب کو ملحوظ رکھا جائے تو راستہ خود بخود کھلتا چلا جاتا ہے۔ برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام دنوں میں پورا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور بہت ہی اچھا ادب سکھایا۔ غرض کہ کوئی کام ہو۔ دنیا کا یا دین کا اوّلین شرط اس کے آداب کی نگہداشت ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف مومن و کافر، موحد و ملحد سب کو ہے۔ اور سب مانتے ہیں کہ معاملات و تعلقات میں پاس ادب بہت بڑی خوبی کی چیز ہے۔ بندے کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ اپنے خدا کا ادب کرے اور خدا کا ادب یہ ہے کہ اس کے احکام کی تعظیم و تکریم کرے اور اسے بجا لانے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دے اور جب اس کی نافرمانی کا ارادہ دل میں پیدا ہو تو اس حاضر و ناظر رب

سے حیا کرے۔ کہ اس کی نگاہ سے کون و مکان کا کوئی ذرہ بھی پنہاں نہیں۔ جو دلوں کے راز جاننے والا اور نیتوں کے کھوٹ سے بخوبی واقف ہے۔ خدا کا دوسرا اہم ترین ادب یہ ہے کہ اس کے شعائر کا احترام کیا جائے۔ اس کی کتاب۔ اس کے کعبہ۔ اس کی عائد کردہ نماز اور حج و عمرہ کو کمال اخلاص سے ادا کیا جائے۔ اور تیسرا اہم ترین ادب یہ ہے کہ اس کے بندوں حتیٰ کہ اس کے پیدا کیے ہوئے جانوروں کو بھی دکھ نہ دیا جائے کیونکہ مصور کو اپنی بنائی ہوئی ہر تصویر عزیز ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ادب یہ ہے کہ جان و دل سے آپ کی عظمت کا احترام کیا جائے اور آپ کی سنت کی حفاظت کی جائے۔ یاد رکھیے سنت کی راہ کے سوا کوئی راہ اللہ تک پہنچانے والی نہیں ہے۔ اس لیے چھوٹی سے چھوٹی سنت کو بھی ترک نہ کیا جائے اتباع سنت ہی سے حضور ﷺ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ خلق خدا کا ادب یہ ہے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے ان سے مروت سے پیش آیا جائے ان کے دکھ سکھ میں شرکت کی جائے۔ اور انسان ہمہ وقت سب کا خیر خواہ بنا رہے۔ بعض غریب صحابہ نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ ہم کسی کی مدد کس طرح کریں ہم تو خود غریب و محتاج ہیں سرکار مولائے کل ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اور کچھ نہیں تو ایک میٹھا بول بول دو کہ میٹھا بول بھی صدقہ ہے۔

بغض و کینہ کی حقیقت

نبی ﷺ کے خادموں میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ دس برس تک مسلسل سردار انبیاء ﷺ کی خدمت کرتے رہے۔ اسی لیے آپ اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ صحیح مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ ایک دن حضور ﷺ نے جناب انس سے فرمایا" میرے پیارے بیٹے! اگر تجھ سے ہو سکے تو ایسی زندگی بسر کرنا کہ صبح سے شام اور شام سے صبح

ہو جائے اور تیرے دل میں کسی کی بدخواہی نہ ہو۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا میرے بیٹے! یہی میرا طریقہ اور سنت ہے۔ اور جس نے میری سنت سے محبت کی بلاشبہ اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا۔

ایمان کا نور اور کینہ ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی میں ایسی بہت سی باتیں ہو جاتی ہیں کہ انسانی فطرت کے تحت آدمی ان سے متاثر ہوتا ہے۔ دل کا آبگینہ تو نازک ترین آبگینوں میں سے ہے۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ کسی کے دل کو دکھانے سے بچو کہ دکھی دل کی آہ جب آسمان کی طرف بڑھتی ہے تو باری تعالیٰ کی قبولیت خود اس کے استقبال کے لیے اُتر پڑتی ہے۔ یعنی ہر دعا قبولیت کی طرف بڑھتی ہے لیکن دکھی دل سے نکلی ہوئی آہ کی طرف قبولیت خود بڑھ کر آتی ہے۔ مومن کا قلب تو اللہ کا عرش ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایمان کا نور اور معرفت کا جمال مومن کے قلب ہی میں قائم ہوتا ہے۔ تاہم اگر کوئی ایسی بات ہو جائے جس سے دل کو چوٹ پہنچے تو اسے دل کا روگ نہیں بنا لینا چاہیئے۔ بلکہ آنحضرت ﷺ کی سنت یہ ہے کہ معاف کر کے دل کو صاف کر لینا ہی مومن کا اصل کردار ہے۔

ایک حدیث میں ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دین تو سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔ چونکہ دل کا سکون و اطمینان کڑھنے اور جلنے میں نہیں بلکہ اس کا نشاط و انبساط کسی کے قصور کو معاف کر دینے اور اسے گلے لگا لینے میں ہے۔ اس لیے سنت انبیاء یہی ہے کہ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی معاف کر دیا جائے اور فیصلہ اس مالک الملک کے حوالے کر دیا جائے۔ جس کی نگاہ سے دلوں کے ارادے چھپ سکتے ہیں نہ چشم و ابرو کے اشارات۔

جناب عمرو بن مقدام نے بیان کیا کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ کے چہرۂ مبارک پر نظر پڑتے ہی اندازہ ہو جاتا کہ یہ اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہیں ۔ چہرے پر بے پناہ نور۔ خشوع و خضوع کے ساتھ گفتگو فرماتے ۔ ان کی مجلس پُروقار تھی ۔ اکثر مشاہیر علماء ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے ۔ ایک مرتبہ مجلس برخاست ہو گئی مگر ایک شخص بیٹھا رہ گیا ۔ یہ آدمی کوئی معمولی آدمی بھی نہ تھا ۔ حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ تھے ۔ انہوں نے امام جعفر صادق سے عرض کیا حضور والا! آج تو میں اس وقت تک اس دروازے سے نہیں اٹھونگا جب تک آپ مجھے کوئی خاص نصیحت نہیں فرمائیں گے ۔ امام نے فرمایا سفیان! میں تمہیں چند کام کی باتیں بتلاتا ہوں لیکن یاد رکھنا کہ بات سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے ۔ باتیں کم کیا کرو عمل پر زیادہ زور دیا کرو ۔ پہلی بات تو یہ سنو کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اُوپر کوئی انعام کرے اور تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا وہ انعام باقی رہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کثرت سے زبان و عمل کے ذریعے اس کا شکر ادا کیا کرو ۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ اگر کوئی بندہ اس کی نعمت کو پانے کے بعد اس کا شکر یہ ادا کرے تو وہ اس پر اور زیادہ انعام کرے گا ۔ اور سفیان! تم تو جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

دوسری بات یہ کہ اگر کبھی تم اپنے رزق میں تنگی پاؤ تو کثرت سے توبہ استغفار کیا کرو ۔ کیونکہ یہ ترکیب بھی اللہ تعالیٰ ہی نے قرآن کریم میں بتلائی ہے روزی کی تنگی میں اعمال کی خرابی کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے ۔ انسان کو اپنے عمل کی خرابی اور نافرمانی تو یاد نہیں رہتی جب اس کے نتیجے میں روزی تنگ ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی شکایت کرنے لگتا ہے۔

امام جعفر صادق نے فرمایا سفیان ثوری! اگر کسی حاکم یا کسی ظالم سے تمہیں

نقصان پہنچنے کا ڈر ہو تو کثرت سے لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھا کرو کیونکہ یہ کلمہ کشائش کی کنجی اور جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ تم دیکھ لوگے کہ یہ کلمہ کس طرح تمہیں ظالم کے ظلم سے محفوظ کرتا ہے۔ یہ سن کر حضرت سفیان ثوری نے مٹھی باندھ لی اور کہا امام آپ کی ان تین نصیحتوں کو کبھی فراموش نہ کروں گا۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ثوری! اگر تو میری ان باتوں پر عمل کرے گا تو ہمیشہ نفع میں رہے گا۔ اللہ تیرا حافظ و ناصر اور حامی و مددگار رہے۔

بیمار پرسی کی فضیلت

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صرف ایک لفظ میں اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ بیان کر دو۔ تو وہ صرف ایک لفظ ہے "محبت" یعنی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ۔ محبت مومنوں کے ساتھ۔ محبت انسانوں کے ساتھ وطن کے ساتھ۔ حیوانوں کے ساتھ۔ غرض اسلام سراسر محبت ہے۔ جس کے دل میں محبت نہیں اس میں ایمان کا نور نہیں محبت انسان کو اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کرتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ اس کی بارگاہ میں مقبول ٹھہرتا ہے۔ محبوب الٰہی سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے امام ضحاک کے حوالے سے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے غریب اور حاجت مند رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے اور اس کی عمر کے تین سال باقی رہ گئے ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی عمر میں تیس سال کا اضافہ کر دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمان کا فرض ہے کہ اگر اس کا کوئی مسلمان بھائی بیمار پڑ جائے تو تین روز کے بعد اس کی بیمار پرسی کو جائے۔ اور جب بیمار کے پاس جائے تو اسے تسلی دے اور نصیحت کرے کہ اللہ تعالیٰ جس بندے کو دوست نہیں رکھتا اسے بیماری بھی نہیں دیتا۔ بیماری تو [illegible] اکثر و بیشتر اپنے دوستوں ہی کو دیتا ہے اس لیے کہ بیماری ہزاروں گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔ بندہ جب دکھ درد میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو وہ رب جو

گناہوں کو بخشنے والا ہے اس کی ایک ایک پکار کے بدلے اس کے بے شمار گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ صلوٰۃ مسعودی میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیمار پرسی کے لیے جاتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں ہزاروں نیکیاں درج کی جاتی ہیں۔ اس کے ہزاروں گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں۔ اور ہر قدم کے عوض ایک سال کی عبادت کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے۔ حضرت محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بیمار سے کہا کرو کہ صدقہ دے کیونکہ صدقہ بلاؤں کو رد کر دیتا ہے۔ اور غضب الٰہی کو فرو کرتا ہے۔ شیخ الاسلام خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ صدقہ دے کر بیماری کو رد کیا کرو کیونکہ صدقہ سے بہتر کوئی دوا نہیں ہے۔

زکوٰۃ مال کی محافظ ہے اور صدقہ جان کا۔ زکوٰۃ دینا گویا مال کو قلعہ بند کرنا ہے اور صدقہ دینا جان کو قلعہ بند کرنے کے مترادف ہے۔

کینہ کی مذمت

انسانی قلب کو سب سے زیادہ ناپاک کرنے والی چیز بغض اور کینہ ہے۔

آئینِ ماست سینہ چوں آئینہ داشتن
کفر ست در شریعت ما کینہ داشتن

کینہ ایسی بری چیز ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں چنانچہ سورۂ حشر میں ارشاد باری ہے کہ مومن بندے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے آگے دولت ایمان سے مشرف ہوئے معاف فرما دے اور ہمارے دلوں کو ایمان والوں کے کینے سے پاک رکھ اے ہمارے پروردگار تو بے شک نرمی کرنے والا مہربان ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو۔ ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو۔

ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ ایک دوسرے کا عیب نہ تلاش کر بلکہ آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔ کسی بھائی کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دنوں سے زیادہ جدائی رکھے۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے بخاری و مسلم میں روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دنوں سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی کو چھوڑے کہ جب ان دونوں کا آمنا سامنا ہو تو یہ اُس سے منہ پھیر لے اور وہ اِس سے ان میں سے جو بھی سلام کرنے میں پہل کرے گا وہ افضل اور بہتر ہے۔ اگر کسی وجہ سے دو مسلمان بھائیوں میں ناراضگی ہو جائے تو صرف تین دنوں تک بول چال بند کرنے کی اجازت ہے۔ ابوداؤد شریف میں ہے کہ جب تین دن گزر جائیں تو ان میں سے ہر ایک کو چاہیئے کہ اپنے بھائی سے آکر ملے پھر سلام کرے اگر دوسرے سے جواب دے دیا تو دونوں کو ثواب ملا اور اگر دوسرے نے جواب نہیں دیا تو وہ اپنے سر پہ گناہ لاد کر لوٹے گا۔ ترمذی شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر پیر اور جمعرات کو بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں تو جس نے خدا کے ساتھ شرک نہیں کیا اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتے ہیں۔ لیکن جن دو آدمیوں کے درمیان آپس میں کینہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہیں ابھی رہنے دو۔ جب یہ آپس میں میل ملاپ کر لیں گے تب ان کے گناہ معاف ہونگے۔ امام بخاری نے ادب المفرد میں روایت نقل کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین شخصوں کی بخشائش نہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو کینہ رکھتا ہے ابوداؤد شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی سے تین دنوں سے زیادہ تعلقات توڑے رکھے اور اسی حالت میں مر جائے تو وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ ترمذی شریف میں ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی عبادت کے بارے میں نہ بتلاؤں جو روزہ نماز اور

صدقے زکوٰۃ سے بھی زیادہ افضل ہے صحابہ نے عرض کیا۔ حضور ضرور بتلائیں آپ نے فرمایا کہ دو مسلمان بھائیوں کے درمیان صلح کرا دینا اور یاد رکھو کہ دو مسلمان بھائیوں کے درمیان جدائی ڈلوانا ایسا گناہ ہے جو تمام نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے اور وہ بھی ملعون ہے جو کسی مسلمان کو دھوکہ دے۔

بدنیتی کی سزا

صرف دو غلطیوں نے رات بھر میں ایک ایسے سرسبز و شاداب باغ کو جو تقریباً ایک میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور ایک ہی خاندان کی ملکیت تھا چورا چورا کر دیا۔ حتیٰ کہ صبح کے وقت جب باغ کے مالک اس میں پہنچے تو اسے پہچان بھی نہ سکے ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نیتوں اور ارادوں کا کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا یا ہماری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ فضا کی پہنائیوں میں گم ہو کر گونگے ہو جاتے ہیں اس لیے ہمارے ظاہری اعمال کچھ ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے چھپی ہوئی نیتیں اور ارادے کچھ ہم بے خیالی میں کوئی جملہ کہہ جاتے ہیں اور یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اس جملے کا ہمارے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا۔ مگر وہ ذات جو علیم و خبیر ہے۔ جو دلوں کے راز اور نیتوں کے کھوٹ کو جاننے والی ہے۔ جو اندھیری رات میں چکنے پتھر پر چلنے والی چیونٹی کے قدموں کی آہٹ کو بھی سنتی رہتی ہے۔ جو صورتوں کو نہیں ظاہری اقوال و اعمال کو نہیں بلکہ دلوں اور دلوں میں کروٹیں لینے والے ارادوں اور نیتوں کو دیکھنے والی ہے۔ ان نیتوں پر اپنے قانون مجازات کو نافذ کرتی ہے اور انہی کے حساب سے جزا و سزا کا فیصلہ کرتی ہے۔

آج سے ہزاروں برس قبل صنعائے یمن سے چھ میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں فروان میں پیش آنے والا یہ واقعہ بھی اللہ تعالیٰ کے اسی قانون جزا و سزا کے نفاذ کی ایک مثال ہے۔ ایک بھرا پڑا خاندان تھا۔ اس کے اکثر افراد توانا اور

تندرست تھے۔ مال و دولت کی فراوانی تھی۔ اس لیے دادو دہش کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اور صدقے کی تو یہ تاثیر ہی ہے کہ اللہ کے نام پر جتنا خرچ کرتے جاؤ مال بڑھتا ہی جاتا ہے۔ مگر ایک فصل پر شیطان نے جو اپنا جادو چلایا تو دلوں میں کھوٹ پیدا ہو گیا اور ارادے بدل گئے۔ جب فصل تیار ہو گئی اور باغ کے مالکوں نے فیصلہ کیا کہ کل صبح چل کر پھل توڑ لیں گے تو رات ہی سے تیاری شروع ہو گئی۔ قبیلے میں جشن کا سا سماں تھا۔ سرِ شام ہی سے عورتیں کام میں جت گئیں کہ منہ اندھیرے قبیلے کے مردوں کو پھل توڑنے جانا تھا۔ مہینوں کی عرق ریزی اور جانفشانی کے ثمرات کل صبح ملیں گے۔ سینوں میں اُمیدوں کے دیئے جلائے مرد اپنے اپنے بستروں پر جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سب نے کہا کہ کل ہم فصل کاٹیں گے اور مالا مال ہو جائیں گے۔ مگر انشاء اللہ نہیں کہا اور جا کر سو رہے۔ رات کے آخری پہر میں سارے افراد بیدار ہوئے اور جتھہ بنا کر باغ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں مالکوں میں سے ایک نے کہا کہ ساتھیو! باغ ہمارا۔ زمین ہماری۔ درخت ہمارے۔ محنت ہم نے کی پانی ہم نے دیا۔ ہمارے آباؤ واجداد نے درخت لگائے۔ آخر یہ کونسی عقل مندی ہے کہ ہم اپنے باغ کی پیداوار میں سے غریبوں اور محتاجوں کو دیدیں۔ اپنی محنت کا ثمر دوسروں کے حوالے کرتے وقت میرا تو بڑا دل دکھتا ہے۔ سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور اور کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم اپنی محنت کی کمائی میں دوسروں کو کیوں شریک کریں۔ فیصلہ ہوا کہ باغ میں پہنچتے ہی سارے غرباء اور مساکین کو جو باغ کا صدقہ لینے کے لیے جمع ہونگے۔ بھگا دیں گے اور سارے پھل گھر لائیں گے۔ زمین پر زمین والے فیصلہ کر رہے تھے اور زمین و آسمان کا مالک عرش پر ان کی نیتوں کے مطابق فیصلہ کر چکا تھا۔ سارا قبیلہ جب میل بھر میں پھیلے ہوئے باغ پر پہنچا تو بیک زبان بولا کہ شاید ہم راستہ بھول گئے۔ شاید ہم دوسری جگہ چلے آئے یہ تو ہمارا باغ ہی نہیں ہے ارے یہاں کے تو ہزاروں درخت زمین بوس ہیں۔

ہمارا باغ تو ایسا نہیں تھا۔ ہم کہاں چلے آئے۔ مگر نشانات وعلامات تو ساری کی ساری ہمارے باغ ہی کی ہیں۔ قرآن کریم کی سورۃ القلم میں ہے کہ انہی کا ایک عقل مند چیخ پڑا۔ بھائیو! توبہ کرو۔ استغفار کرو۔ کہ یہ توبہ کا وقت ہے۔ ہماری نیت اور قول کا پھل ہمیں مل گیا۔ ہم نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا اور محتاجوں کو باغ کی پیداوار سے محروم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ کھلی آنکھوں دیکھ لو کہ رات کے طوفان نے تمہارے آباء واجداد کی صدیوں کی محنت کو تار عنکبوت کی طرح بکھیر کر رکھ دیا۔ تم نے محتاجوں کا حق مارنے کا ارادہ کیا تھا زمین وآسمان کے مالک نے تم سے سب کچھ چھین لیا۔ ملک وملکوت اس کے ارض وسما اس کے۔ ہم کیا اور ہمارے ارادے کیا۔ وما تشاؤن إلا ان یشاء اللہ تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا مرضیٔ مولا از ہمہ اولیٰ۔

پیار اور محبّت

اسلام محبت، اخوت، بھائی چارہ اور ہمدردی کا دین ہے۔ اس کی ساری کی ساری اساس ہی محبت پر ہے۔ قرآن کریم میں صحابہ کرام کی تعریف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں رحماءُ بینھم کے خطاب سے نوازا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے شریک تھے۔ یہ وہی عرب ہیں جو کبھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوا کرتے تھے قتل وغارت۔ لوٹ مار اور انتقام در انتقام اُن کا روزانہ کا معمول تھا۔ کہ ایک رحمت مجسم آفتاب عالم تاب کی طرح اُفق حجاز پر طلوع ہوا۔ اور اپنے جلو میں ایسی تابانی ولمعانی لے کر آیا کہ صدیوں کے تاریک دل اس کی ضیا پاشیوں سے منور ہو گئے۔ بھٹکے ہوؤں کو راہ ملی سونے والے جاگ اُٹھے اور پھر وحشی درندے امن عالم کے کفیل بن گئے آپ نے اپنے پیام محبت سے ایسی جوت جگائی کہ پوری ملت کا دل ایک ساتھ دھڑکنے لگا۔ بخاری ومسلم میں ہے کہ ایک دن ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک سب سے اچھا اسلام کیا ہے؟ آپ نے ارشاد
فرمایا۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا اور ہر شخص کو سلام کرنا چاہے تم اسے پہچانتے ہو یا نہ
پہچانتے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ کسی مومن پر دوسرے مومن کے چھ حقوق واجب ہیں
بیمار پڑے تو اس کی عیادت کرے وفات پا جائے تو اس کے جنازے میں شرکت
کرے۔ دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کرے اس سے ملاقات ہو تو سلام
کرنے میں سبقت کرے چھینک آنے پر جب وہ الحمد للہ کہے تو اس کا مومن
بھائی یرحمک اللہ سے اس کا جواب دے اور حاضر غائب دونوں صورتوں میں اس
کا خیر خواہ رہے۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد
فرمایا جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے جنت میں نہیں جاؤ گے اور جب تک آپس
میں تم ایک دوسرے سے محبت نہیں کرو گے تمہارا ایمان کامل نہیں ہوگا۔ کیا
میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتلاؤں کہ خود بخود اس کے ذریعہ تمہارے درمیان
محبت پیدا ہو جائے گی لو سنو ایک بات کو اپنے درمیان رواج دو اس سے
آپس میں محبت بڑھے گی اور وہ ہے آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرنا۔ سوار
پیدل چلنے والے کو پہلے سلام کرے۔ چلنے والا بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرے
تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں کو سلام کریں۔ صحیح بخاری شریف میں حضرت انس
رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ چند بچوں کے پاس
سے گزرے تو آپ نے ان بچوں کو سلام کیا۔ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضوان اللہ
تعالیٰ علیہم اجمعین نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ حضور! چونکہ ہمارے گھروں
میں بیٹھک نہیں ہوتی اس لیے مجبوراً ہم لوگ راستے کے کنارے بیٹھ کر بات
چیت کرتے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اگر مجبوراً راستے میں
بیٹھنا پڑے تو تمہیں راستے کا حق ادا کرنا چاہیئے۔ صحابہ نے دریافت کیا۔ یا رسول
اللہ۔ صلی اللہ علیک۔ راستے کا کیا حق ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا نامحرموں پر
نگاہ نہ ڈالی جائے۔ راستے میں کوئی ایسا فعل نہ کیا جائے جس سے گزرنے والوں

کو تکلیف ہو۔ کوئی راستہ بھول جائے تو اسے راہ بتلادی جائے۔ نیکی کا حکم دیا جائے اور بری باتوں سے منع کیا جائے اور اگر کوئی راہگیر سلام کرے تو اس کے سلام کا جواب دیا جائے۔ یہی ہے راستے کا حق۔

خواب کے آداب

صحیح بخاری شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خواب نبوت کے چھیالیسویں حصے میں سے ایک حصہ ہے میرے بعد نبوت ختم ہو جائے گی البتہ مبشرات باقی رہیں گے صحابہ کرام نے دریافت کیا یا رسول اللہ! مبشرات سے آپ کی مراد کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا "اچھے اور سچے خواب" حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک خواب تو وہ ہے جسے حدیث النفس کہتے ہیں۔ یعنی دن بھر جو کام کاج آدمی کرتا رہتا ہے اسی سے متعلق خواب بھی دیکھتا ہے۔ خواب کی دوسری قسم تخویف الشیطان ہے یعنی شیطان انسان پر مسلط ہو کر خواب میں اسے بھیانک مناظر دیکھاتا اور پھر اسے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے۔ اور خواب کی تیسری قسم کو بُشریٰ مِنَ اللہ کہتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک اور سچے بندے کو جب کوئی ایسی خوش خبری دینا چاہتا ہے جو مستقبل میں پیش آنے والی ہوتی ہے تو اسے بذریعہ خواب مطلع فرما دیتا ہے۔ اسلام نے جس طرح مسلمانوں کو کھانے پینے پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے اور زندگی کے تمام معاملات کے آداب سکھلائے ہیں اسی طرح خواب کا ادب بھی بتلایا گیا ہے مثلاً بخاری و مسلم میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے درحقیقت مجھ ہی کو دیکھا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو یہ قدرت نہیں دی ہے کہ ■ میری شکل اختیار کر کے خواب میں ظاہر ہو۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اچھے خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔

اور ڈراؤنے خواب شیطان کی طرف سے لہٰذا اگر تم میں سے کوئی شخص کوئی اچھا اور پسندیدہ خواب دیکھے تو اسے چاہیئے کہ وہ خواب اپنے کسی پسندیدہ اور اچھے آدمی کو سنائے سب کو سناتا نہ پھرے اور اگر کوئی بُرا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین مرتبہ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھے۔ اور اپنا خواب کسی سے بھی بیان نہ کرے۔

ایک دن ایک شخص نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرا سر کاٹ دیا گیا۔ آپ نے تبسّم فرمایا اور ارشاد فرمایا اگر نیند کی حالت میں تم میں سے کسی کے ساتھ شیطان کھیلے یعنی اس قسم کا ڈراؤنا خواب دیکھو تو کسی سے بیان نہ کیا کرو۔

یہ حکم حضور ﷺ نے اس لیے دیا ہے کہ بُرا خواب دیکھنے والا اس کے شر سے محفوظ رہے۔

تقویٰ

کسی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا جناب تقویٰ کا کیا مفہوم ہے فرمایا "کبھی کانٹوں والی جھاڑی کے درمیان سے گزرے ہو؟ کہا جی ہاں۔ دریافت کیا کہ پھر تم کس طرح گزرے تھے؟ کہا میں نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے اور بچتا بچاتا گزر گیا۔ فرمایا۔ یہی تقویٰ ہے۔ یہ دنیا ایک خاردار جھاڑی کی مانند ہے۔ ہر طرف ایسی چیزیں بکھری پڑی ہیں جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کرکے اور وقتی فائدے کا لالچ دکھا کر حق و صداقت کی راہ سے منحرف کرنا چاہتی ہیں۔ انسان خطا و نسیان کا پتلا، بھٹک سکتا ہے ایسے میں صرف خوف خدا ہے جو انسان کو غلط راستوں سے بچا سکتا ہے بشرطیکہ اسے اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین ہو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تقویٰ دن میں روزہ رکھنے اور رات بھر نماز پڑھنے کا نام نہیں بلکہ تقویٰ یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے بچے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور ان فرائض کو ادا کرے

جو اللہ تعالیٰ نے اس پر عائد کئے ہیں جو شخص ان باتوں کی پابندی کرے گا خیر کا دروازہ اُس پر کھلتا ہی چلا جائے گا ایک دن حضرت یزید بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک میں نے آپ سے بہت سی باتیں سُنی ہیں مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں ان باتوں کو بھول نہ جاؤں لہذا مجھے ایک ایسی بات بتا دیجئے جو تمام بھلائیوں کی اصل اور بنیاد ہو تاکہ میں اس پر قائم ہو جاؤں۔ ترمذی شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جن باتوں کا تمہیں علم ہے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ یعنی جان بوجھ کر اس کی نافرمانی نہ کرو۔ البتہ اگر نادانی سے تم سے کوئی غلطی یا گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کرنی چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ توبہ کرنے والا ایسا ہی ہوتا ہے گویا کہ اس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا تھا۔ ترمذی شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے درخت سے گزرے جس کے پتے خشک ہو چکے تھے۔ آپ نے اس کے پاس کھڑے ہو کر اپنا عصا درخت پر مارا تو بہت سے پتے گر گئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی حمد، کبریائی اور پاکی بیان کرنے سے گناہ اُسی طرح جھڑتے ہیں جس طرح اس وقت اِس درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر گناہوں کی معافی میں یہ کلمات بے حد مؤثر ہیں۔

علم

دین ہو یا دنیا کہیں کی بھی عظمت انسان بغیر علم کے حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے حصول کو ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض قرار دیا ہے۔ لیکن علوم تو دنیا میں بے شمار ہیں اور انسان کی عمر کوتاہ۔ لہذا علم کی دو قسمیں قرار پائیں گی۔ ایک تو وہ علم جس کا حاصل کرنا فرض ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی شریعت

کا علم۔ اس کے عائد کردہ فرائض و واجبات کا علم۔ بندوں کے حقوق اور ان حقوق کو ادا کرنے کے طریقوں کا علم۔ ان علوم کو سیکھنا ضروری ہے کیونکہ ان کے بغیر نہ تو دنیا کی زندگی کا نظام برقرار رہ سکتا ہے اور نہ انسان کی عاقبت سنور سکتی ہے۔

دوسرے وہ علوم جن سے معاش اور تمدن کے مسائل سمجھے جا سکتے ہیں اور انسان اپنی دنیوی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکتا ہے۔ یہ علوم بھی سیکھنے چاہئیں مگر ضروری ہے کہ علم معاش کو علم شریعت کے ماتحت رکھا جائے اور انسان اپنی دنیوی زندگی کو شریعت کے تابع رکھے۔ اس وقت یہ علم بھی علم نافع ہوگا۔ یاد رکھئے دنیا کی سب سے بڑی لعنت علم غیر نافع ہے۔ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے۔ علم غیر نافع اسے کہتے ہیں جس پر انسان عمل نہیں کرتا اور اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ یا علم غیر نافع وہ ہے جس سے انسانیت کو فلاح و کامرانی کے بجائے تباہی حاصل ہوتی ہے۔ جس نے ایٹم بم بنایا وہ بھی عالم ہی تھا لیکن ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی ایجاد نے آج دنیا کو ایک ابدی تباہی کے غار تک پہنچا دیا ہے۔ علم تو وہی ہے جو زندگی کی شب تاریک کو نمود سحر کا پیغام دے سکے۔

وہ علم کیا جو بچوں کو یتیم، سہاگنوں کو بیوہ اور ہنستے بستے شہروں کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کر دے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب علم معاش شریعت و اخلاق کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے پیغام دیا کہ علم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ خوف خدا پیدا کرے جو علم خوف خدا نہ پیدا کرے اور انسان کے ضمیر سے نور و ایمان کی کرن چھین لے اس سے افضل و برتر وہ جہل ہے جو عقیدہ و ایمان اور اخلاق و شرافت کی حدود و قیود کا پابند ہو۔ علم وہی ہے جس کی پشت پر عمل کی قوت موجود ہو۔ عالم بے عمل اہل علم کی جماعت سے خارج ہے۔ وہ اس نابینا کی مانند ہے جس کے ہاتھ میں چراغ ہو کر لوگ تو اس سے روشنی حاصل کر رہے ہوں اور وہ خود اس روشنی سے محروم ہو۔ علم اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کل قیامت

کے دن اس نعمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ کہ تم نے اس پر عمل کیا تھا یا نہیں؟

یتیم کا حق

دنیا میں ایسا کون آدمی ہو گا جسے یہ خواہش نہ ہو کہ اس کا گھر جنت نشان ہو۔ ہر قسم کی آسائش مہیا ہو۔ گھر میں رہنے والوں کے درمیان الفت اور محبت ہو۔ ایک دوسرے کی غم گساری کریں ایک دوسرے کے وقت پر کام آئیں۔ آپس میں حسد ہو نہ عداوت۔ یہ ایک معمولی سی خواہش ہے لیکن اس کا پورا ہونا بڑا دشوار ہے۔ اس لیے کہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ایک آدمی کی طبیعت کا رجحان دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہوتا ہے بس پھر جھگڑے قضیئے شروع ہو جاتے ہیں اور اچھا خاصا گھریلو ماحول جہنم زار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہوتا ہے لیکن سچ پوچھیئے تو کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ راحت اور خوشی کا تعلق دل سے ہے۔ دل ہی خوش نہیں تو سب بیکار ہے۔ گھر کو پُر سکون بنانے کا ایک نسخہ (۱) حضور ﷺ نے بتلایا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کے گھروں میں سب سے بہتر وہ گھر ہے جس میں کوئی یتیم رہتا ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو۔ اور مسلمانوں کا سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ بدسلوکی کی جا رہی ہو۔ مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے عرض کیا کہ میرا دل بہت سخت ہے۔ میں کیا کروں تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا کر اور مسکینوں کو کھانا کھلایا کر تیرے دل کی یہ بیماری دور ہو جائے گی۔ نسائی شریف میں حضرت خویلد بن عمرو سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے میرے اللہ میں دو کمزور قسم کے لوگوں کے حق کو محترم قرار دیتا ہوں۔ یعنی یتیم اور بیوی کے حق کو۔ اسلام سے پہلے یہ دونوں طبقے نہایت مظلوم تھے۔

لوگ یتیموں کا مال ہڑپ کر لیتے اور پھر ان پر طرح طرح کے مظالم کرتے اسی طرح اپنی بیویوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ان کے حقوق پامال کرتے اور انہیں ستاتے۔ اسلام نے ان دونوں مظلوم طبقوں کی دستگیری کی اور انہیں معاشرے میں ایسا باعزت مقام عطا کیا کہ مہذب سے مہذب معاشرے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث میں ہے کہ یتیم پر ظلم ہوتا ہے تو اللہ کا عرش کانپنے لگتا ہے کہ اُس بیچارے کا اللہ کے سوا کوئی والی و وارث بھی تو نہیں۔

اتّباعِ سُنّت

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کا شمار جلیل القدر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ آپ نہائیت فصیح گفتار تھے۔ وعظ شروع کرتے تو سخت سے سخت مخالف کا دل بھی موم ہو جاتا۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جسم بیمار ہوتا ہے تو درد و کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی طرح دلوں کا روگ گناہ ہے جس طرح جسم کی بیماری کے وقت زبان کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے اور لذیذ سے لذیذ کھانا بھی اچھا نہیں لگتا اسی طرح دل بیمار ہو تو عبادت کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی۔ ایک دن ایک شخص نے آپ سے عرض کیا۔ حضرت! میں آپ سے رخصت ہونے والا ہوں اس لیے مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمایئے جو ہمیشہ میرے کام آتی رہے۔ آپ نے فرمایا بس اس بات کا خیال رکھنا کہ دوسروں کے عیوب کی چھان بین تمہیں اپنے عیوب کو دیکھنے سے غافل نہ کر دے۔ سب سے زیادہ عقل مند وہ شخص ہے کہ جب کوئی حق بات اس کے روبرو پیش کی جائے تو وہ اسے فوراً قبول کر لے۔ اگرچہ اس حق بات کا پیش کرنے والا مرتبہ میں اس سے کمتر ہو اور اگر اس سے خطا ہو جائے تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لے۔ آپ نے فرمایا آدمی پر فساد چھ چیزوں سے آتا ہے۔ آخرت کا عمل کرتے وقت نیت میں خلوص نہ ہونا اپنے بدن کو شیطان کے ہاتھ گروی رکھ دینا کہ وہ اسے جس طرح چاہے چلائے۔ موت کے

نزدیک ہونے کے باوجود حرص و ہوس اور امید و تمنا کی درازی۔ مخلوق کی رضامندی کو خدا کی رضامندی پر ترجیح دینا۔

خواہشات نفسانی کی پیروی کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی سُنت کو ترک کر دینا اور آخری بات یہ کہ بزرگوں کی لغزش کو اپنے لیے حُجّت بنانا اور ان کے ہنر و کمال سے روگردانی کرنا۔

ایک مرتبہ اولیاء اللہ کے مجمع میں آپ نے فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ انسان اخلاق و اعمال اور اوامر و سُنن میں حضور ﷺ کا جو حبیب خدا تھے تابع اور پیرو ہو۔ تقویٰ۔ دینداری اور ولایت سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ انسان نبی اکرم ﷺ کے نقش قدم کی پیروی کرے۔ باقی سب کچھ ہوس ہے۔

۸۔ غصّہ کی مذمّت

سرورِ انبیاء ﷺ صحابہ کرام کی مجلس میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک آپ مجھے نصیحت فرمائیں آپ نے ارشاد فرمایا غصّہ نہ کیا کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمایئے آپ نے دوبارہ جواب دیا کہ "غصّہ نہ کیا کرو" سائل بار بار سوال کرتا رہا اور ہر بار آپ اُسے یہی نصیحت فرماتے رہے کہ غصّہ نہ کیا کرو اس لیے کہ غصّہ ہی تمام شر و فساد کی جڑ ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ غصّہ ایک قسم کی آگ ہے جو دل میں سلگتی ہے اس لیے اسے پانی سے ٹھنڈا کیا کرو یعنی جب غصّہ آئے تو وضو کر لیا کرو۔ ابوداؤد شریف میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب غصّہ آئے تو اپنی ہیئت تبدیل کر دو یعنی اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ۔ اس طرح اگر غصّہ اُتر جائے تو ٹھیک ورنہ لیٹ جاؤ۔ خبردار غصّہ کی حالت میں کوئی اقدام نہ کر بیٹھنا ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا

اور اس وقت تیر کمان سے نکل چکا ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی غصہ پی جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ایمان کے انوار سے بھر دیتا ہے۔

ایک دن حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے نصیحت کرنے کی درخواست کی آپ نے فرمایا غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے کہا حضرت! یہ تو آپ صحیح فرماتے ہیں مگر میں کیا کروں میرا مزاج ہی غصیلے ہے۔ حضرت سلمان فارسی نے فرمایا کہ ایک کام کیا کرو غصہ کی حالت میں اپنی زبان اور اپنے ہاتھ پر قابو رکھو۔ اس سلسلے میں بہترین نمونۂ عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک میں ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی لیکن اس دس سال کے عرصے میں آپ نے کسی بات پر مجھے نہیں جھڑکا نہ کسی کے کام کے کرنے پر فرمایا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا نہ کسی کام کے نہ کرنے پر مجھے دریافت فرمایا کہ تو نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ اسی لیے جب ایک شخص نے حضرت عائشہ سے حضور کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غصہ کی حالت میں اپنی اولاد و مال کے لیے بددعا نہ کیا کرو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت تم بددعا کر رہے ہو وہ قبولیت کی گھڑی ہو۔

زبان کی حفاظت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے ایک دوست سے ملنے گئے تھے۔ مگر دروازے پر کھڑے رہے۔ دوست موجود نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوست آگیا۔ اتنے جلیل القدر محدث کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر حیران ہوا۔ جلدی سے اندر گیا۔ اور بیٹھک کا دروازہ کھول کر بٹھایا۔ بیوی سے کہا کہ تم نے شیخ کو گھر میں کیوں نہ بٹھایا۔ اس نے کہا کہ میں نے تو بیٹھک کا دروازہ کھلوا دیا تھا مگر نہ جانے کیوں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل کر کھڑے ہو گئے۔

دوست نے دودھ کا شربت تیار کر کے ابنِ مسعود کی خدمت میں پیش کیا اور دریافت کیا حضرت! آپ بیٹھک سے باہر نکل کر کیوں کھڑے ہو گئے تھے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے بات کو ٹالنا چاہا مگر اُن کا دوست کب ہار ماننے والا تھا۔ بار بار اُن سے پوچھتا رہا۔ تب انہوں نے فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ میں نے جب دستک دی تو باندی نے دروازہ کھول دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ذرا پانی پلاؤ۔ پیاس لگی ہے۔ باندی پانی لینے گئی تو آپ کی بیوی نے شاید پڑوس سے دودھ منگوایا۔ باندی دودھ لینے گئی تو آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ میں سُن رہا تھا۔ دیر کرنے کی بنا پر آپ کی اہلیہ نے باندی پر لعنت بھیجی۔ مجھے فوراً حضور ﷺ کی وہ حدیث یاد آ گئی جس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جو شخص کسی شخص پر لعنت بھیجتا ہے اگر واقعتاً وہ اس لعنت کے لائق ہو تو اس پر لعنت پڑتی ہے ورنہ وہ لعنت لوٹ کر لعنت بھیجنے والے پر پڑ جاتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ممکن ہے وہ باندی لعنت کے قابل نہ ہو تو لازماً وہ لعنت لوٹ کر آپ کی بیوی اور اس گھر پر پڑے گی لہذا میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ جلد جلد اُس گھر سے باہر نکل جاؤں جس پر لعنت پڑنے کا اندیشہ ہو۔ میرے دوست! زبان کے معاملے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ زبان وہ چیز ہے جو بڑی بڑی عبادتوں کو چند لمحوں میں غارت کر دیتی ہے۔

علم کی حقیقت

علم کی دو قسمیں ہیں۔ علم نافع اور علم غیر نافع۔ علم نافع اس علم کو کہتے ہیں جو بندے کو اس کے نفس اور خالق نفس کی معرفت عطا کرے اور ان راستوں کی نشان دہی کرے جن کے ذریعہ انسانیت کو فلاح و کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ علم جو انسان کو خالق کی معرفت سے غافل کر دے، جو کائنات کی بھول بھلیوں میں انسان کو اس طرح پھنسا دے کہ وہ اسی میں اُلجھ کر رہ جائے اور حقیقت کا

ادراک نہ کرسکے وہ علم غیر نافع ہے۔ علم غیر نافع سے حضور ﷺ نے پناہ مانگی ہے۔ کیونکہ یہ علم جہل سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اسی علم غیر نافع نے اللہ تعالیٰ کی اس سجی سجائی حسین و جمیل کائنات کو بارہا جہنم زار میں تبدیل کیا ہے۔ علم جو پل بھر میں ہنستی بستی آبادیوں کو قبرستان میں تبدیل کردے اور ایک بم کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کی جان لے لے۔ جس کی بدولت سہاگنوں کا سہاگ لٹے۔ معصوم بچوں کی پیشانی پر یتیمی کا داغ لگ جائے۔ ماؤں کی گود خالی ہو جائے۔ بوڑھے باپوں کی آنکھیں اپنے جوان بیٹوں کی آمد کے انتظار میں پتھرا جائیں۔ خدا کی قسم علم نہیں بلکہ جہل سے بدرجہا بدتر ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے نزدیک تو علم وہ ہے جس کے حصول کے بعد انسان کا باطن سنور جائے۔ اس کے دل کی دنیا منقلب ہو جائے۔ اس میں انس و ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ کمزوروں کی دستگیری کرے۔ بے پناہوں کو پناہ دے۔ بے سہاروں کا سہارا بنے۔ بڑوں کا ادب کرے۔ چھوٹوں پر شفقت کرے۔ ہمسایوں کے حقوق کو پہچانے۔ حلال و حرام اور خوب و زشت کی حدود کو پامال نہ کرے۔ خود کو پہچانے اللہ کو پہچانے اور اللہ کے بندوں کو اللہ کا کنبہ سمجھ کر ان کی بہتری اور فلاح کا سامان پیدا کرے۔

علم کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے علم پر عمل بھی کرے۔ کیونکہ نہ عمل کے بغیر علم نافع ہے اور نہ علم کے بغیر عمل نفع بخش ہے۔ جب تک انسان اپنے علم پر عمل نہیں کرتا اس کے لیے آگے کی راہ نہیں کھلتی عالم جتنا علم پر عمل کرتا جاتا ہے اس کی راہ کھلتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ منزل مقصود یعنی معرفت خداوندی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ علم کے بغیر عمل کرنے والے کو حضور ﷺ نے کولہو کے بیل سے تشبیہ دی ہے۔ جو عمر بھر چلتا رہتا ہے لیکن بے علمی کے باعث اس کا عمل اس کے لیے نفع بخش ثابت نہیں ہوتا۔

شریعت و طریقت

جو شخص بندگی کے اوصاف یعنی شریعت کو نہیں جانتا وہ بھلا اس راہ کو کیسے پہچان سکتا ہے جو اللہ کی طرف لے جانے والی، اس کی معرفت بخشنے والی اور بندے کو اس کے قریب کرنے والی ہے جسے طریقت کہتے ہیں۔ کیونکہ شریعت تو پہلا قدم اور اوّلین منزل ہے۔ شریعت انسان کو اپنے آپ کو پہچاننے کا طریقہ سکھاتی ہے۔ اور اس کی اگلی مقام کر پُر خطر وادیوں سے صحیح و سالم گزار دیتی ہے۔ شریعت کی بنیاد وہم و ظن اور خواب و خیال پر نہیں ہے بلکہ اس کا ہر حکم قطعی اور یقینی ہے کیونکہ اس کی اساس وحی پر قائم ہے جو سرتاسر یقین ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو اپنے آپ کو نہیں پہچانتا بھلا وہ اللہ تعالیٰ کو کیسے پہچان سکتا ہے؟ شریعت انسان کو ظاہر میں اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری سکھاتی ہے اور ظاہر میں فرماں برداری کے بغیر باطنی کمال کا دعویٰ جھوٹ ہے۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ کے اوصاف کی معرفت بندگی کے ارکان کی صحت پر موقوف ہے۔ اور بندگی کے ارکان کی صحت بغیر احکام شریعت کی ٹھیک ٹھیک پابندی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بندے کا کمال یہ ہے کہ وہ بندگی کے مقام اور اس کے حدود کو پہچان لے۔ وہ یہ جان لے کہ اوّل و آخر وہ بندہ ہے۔ اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کا محتاج۔ حتیٰ کہ وہ اس کے حکم اور مرضی کے بغیر ایک سانس لے سکتا ہے۔ نہ ایک قدم چل سکتا ہے۔ یہ احساس اس میں عاجزی و درماندگی پیدا کرتا ہے اور اسی مقام سے طریقت کی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بارگاہ ربوبیت میں عاجزی سے بڑھ کر کوئی تحفہ قابل قبول نہیں۔ عاجزی انسان کو بندگی کے آداب سکھاتی ہے۔ اور بندہ اپنے اعمال و اخلاق اور کردار و گفتار کو سنوارنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اس طرح بیک وقت اُسکے ظاہر و باطن میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ " ظاہر میں انسان سے جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ

اس کے باطن ہی کا مظہر اور عکس ہوتا ہے اس لیے اگر ظاہر میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تنظیم اور فرماں برداری نہیں تو باطن میں حق تعالیٰ کی معرفت کا دعویٰ بے بنیاد ہے محال ہے کہ باطن میں اللہ تعالیٰ کی معرفت موجود ہو اور پھر ظاہر میں اس کے فرمان کی تعظیم اور فرماں برداری کا ظہور نہ ہو۔ ظاہر میں احکام شریعت کی پابندی کا جس قدر اہتمام ہوگا اسی درجے کی باطن میں اللہ تعالیٰ کی معرفت موجود ہوگی۔"

خدمتِ خلق

حشر کے میدان کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک دن حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک انسان سے فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔ یہ سن کر بندہ تعجب میں پڑ جائے گا بار الٰہا! یہ کیسے ممکن کہ تو بیمار پڑے تو تو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میرے بندے! کیا تجھے خبر نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب ہی بیمار پڑا ہوا تھا مگر تو نے اس کی خبر نہ لی حالانکہ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے قریب ہی پاتا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے مجھے کھلایا نہیں۔ بندہ عرض کرے گا مولا! بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا "کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا۔ اگر تو اسے کھانا کھلا دیتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ ادب المفرد میں امام بخاری نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ ایک بدو نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیک مجھے ایسے عمل کی تعلیم دیجیے جو مجھے جنت میں لے جائے تو آپ نے ارشاد فرمایا انسان کو غلامی سے آزاد کر۔ انسان کی گردن کو قرض سے چھڑا اگر تیرا رشتہ دار بھی ظالم

ہو اور وہ کسی پر ظلم کر رہا ہو تو اس کا ہاتھ پکڑ لے اگر تیرے اندر اس بات کی بھی طاقت نہ ہو تو بھوکے کو کھانا کھلا۔ پیاسے کو پانی پلا۔ نیکی کا حکم کر اور برائی سے لوگوں کو روک اگر یہ بھی تجھ سے نہ ہو سکے تو کم از کم اتنی احتیاط کر کہ کسی کے حق میں بری بات اپنی زبان سے نہ نکال۔ یہ وہ اعمال ہیں جو تجھے جنت میں لے جائیں گے۔ مومن کامل کی زندگی خدمت خلق کے لیے وقف ہوتی ہے۔ وہ دن رات انسانی دلوں کو رشتۂ محبت میں پرونے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ اسی لیے محبوبِ الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "قیامت کے بازار میں دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ کسی چیز کی قدر نہ ہو گی"

غرور کی حقیقت

سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا

"اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ دھماکے کے ساتھ چلنے سے تو زمین کو تو پھاڑ نہیں سکے گا اور نہ تن کر چلنے سے تو پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔"

اور سورۂ لقمان میں ارشاد ہوا۔

"اور لوگوں سے بے رُخی نہ کر اور زمین میں اترا کر نہ چل بے شک اللہ تعالیٰ غرور اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

ختمی مرتبت ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں وہی جنت کا دروازہ ہیں۔ اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے اس لیے جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ ابوداؤد شریف کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابہ کرام تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ عجمیوں کی طرح تعظیم کے لیے

کھڑے نہ ہؤا کرو۔ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ" جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے رہا کریں اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیئے۔ اسی طرح بڑے بڑے القاب و آداب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا بھی غرور کی ایک قسم ہے کیونکہ اگر وہ خلاف واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر و غرور کا ذریعہ۔ اور انسان ضعیف البنیان اپنی کس چیز پر غرور کرتا ہے۔ اس کے پاس ہے کیا کہ وہ غرور کرے۔ نہ اس کی زندگی اپنی۔ نہ اس کا جسم اپنا۔ نہ اعضاء و جوارح اپنے۔ سانس کے ایک کمزور سے ڈورے کے ساتھ تو اس کی زندگی بندھی ہوئی ہے۔ ڈورا ٹوٹا اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی سارے رشتے ٹوٹ گئے۔ ملکیتیں باطل ہو گئیں۔ ابھی چند لمحوں پہلے وہ شہنشاہ تھا۔ قصر شاہی کا مالک۔ لوگوں کا مالک الرقاب اور ابھی خاک کا ایک ڈھیر ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد منوں مٹی کے نیچے چلا جائے گا۔ اور صورتِ حال یہ ہو گی کہ

بر مزار ما غریبان نے چراغ نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

ذرا سا اقتدار ملا۔ چاندی اور سونے کے ڈھیر ہاتھ میں آ گئے۔ ایک کوٹھی بنا لی ایک محل سجا لیا۔ اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔ دوسروں کو حقیر سمجھنے لگا۔ چاہتا ہے کہ سب لوگ اُسے جھک جھک سلام کریں۔ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے رہیں۔ اس کی عظمت و جلالت مآبی کا قصیدہ پڑھیں۔ خاک کا پتلا اپنی حقیقت کو فراموش کر بیٹھا اور بھول گیا کہ اگر فرعون نہ رہ گیا جو اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا نعرہ لگایا کرتا تھا اگر شداد نہ رہ گیا جس کی سجائی ہوئی بہشت کی مثال نہیں ملتی اگر نمرود جیسے بادشاہ کا غرور نہ رہ سکا تو اس کا غرور کیسے رہے گا۔ عظمت و کبریائی کے لائق صرف ایک ذات ہے۔ وہی ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہی مالک الملک اور خالق الحب و النویٰ ہے۔ سب اس کی بارگاہ میں عاجز و مسکین وہی ایک داتا سب اس کے منگتا۔ بڑائی صرف اور صرف اس کو سجتی ہے۔ جو بڑائی کے معاملے میں اس سے منازعت کرے

گا پاش پاش ہو جائے گا۔ اس کی بارگاہ میں صرف خاکساری و فروتنی کی قدر ہے۔ جو اس کے آگے جھکا سرفراز ہوا۔ اور جس نے سر غرور بلند کیا سر نگوں ہو رہا۔ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے لیکن یہ اصول ایسا اصول محکم ہے کہ کسی قسم کے تغیر و تبدل کو قبول نہیں کر سکتا۔ دنیا و آخرت کی تباہی غرور میں ہے اور کی سرخروئی عاجزی میں۔ یہی قرآن کا فیصلہ اور رسولِ کونین کا پیغام ہے۔

شکرانِ نعمت

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ انسان کے بدن میں جتنے جوڑ ہیں ہر روز ان کا صدقہ ادا کرنا انسان پر واجب ہے۔ اس صدقے کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ اگر دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملے میں تمہیں فیصلہ کرنا پڑے تو انصاف سے فیصلہ کرو اگر کوئی آدمی اپنی سواری پر سوار ہونا چاہے تو سوار ہونے میں اس کی مدد کرو۔ کوئی شخص بھاری سامان اٹھا کر اپنی سواری پر لادنا چاہے تو لادنے میں اس کا ہاتھ بٹا دو۔ میٹھا بول بولنا بھی صدقہ ہے۔ مسجد کی طرف نماز پڑھنے کے لیے جاتے وقت تمہارا ہر قدم صدقہ ہے۔ اگر راستے میں کوئی تکلیف دینے والی چیز پڑی ہوئی ہو تو اس کا راستے سے ہٹا دینا بھی صدقہ۔ بزار کی روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کے بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور ہر جوڑ کا صدقہ ادا کرنا چاہیئے لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک اگر کسی میں اتنا صدقہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو تو وہ کیا کرے۔ ارشاد ہوا نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے یہی اس کے لیے صدقہ ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا۔ اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو؟ آپ نے ارشاد فرمایا تکلیف دینے والی چیز کو راستے سے ہٹا دو۔ لوگوں نے عرض کیا اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو؟ فرمایا کمزوروں کی مدد کرے۔ کسی نے دریافت کیا اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو؟ فرمایا کسی کو اپنے

ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچائے یہ بھی صدقہ ہے۔ ایک روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص بہرا ہو اور چیخ چیخ کر اس سے بات کرنی پڑے تو یہ چیخنا اور چلانا بھی صدقہ میں شمار ہوگا۔ اسی طرح کسی نابینا کی دستگیری کرنا اور اس کا ہاتھ تھام کر منزل پر پہنچا دینا بھی صدقہ ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت یونس بن عبید کے سامنے اپنی تنگدستی کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بالکل ہی محروم کر رکھا ہے۔ جناب یونس نے اس سے کہا اچھا اگر یہ بات ہے تو میں تمہاری ایک آنکھ کے لیے ایک لاکھ درہم دینے کو تیار ہوں اپنی ایک آنکھ نکال لینے دو اس نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا کہا اچھا ایسا کرو کہ ایک لاکھ کے عوض ایک ہاتھ کاٹ لینے دو اس نے کہا میں اس کے لیے بھی تیار نہیں۔ فرمایا اچھا میں تمہیں دو لاکھ دوں گا اپنا ایک پیر کاٹنے دو اس نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ فرمایا ظالم! لاکھوں کی دولت لیے پھرتا ہے اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی شکایت کر رہا ہے؟ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنے بدن ہی پر غور کر لیا کرے کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پیر، دل و دماغ جیسی کیسی کیسی نعمتیں اسے عطا فرمائی ہیں۔ ان نعمتوں کا شکریہ یہ ہے کہ انہیں کمزوروں کی مدد اور اللہ کی اطاعت میں صرف کرے اور انہیں معصیت کی جگہ پر نہ استعمال کرے۔ آنکھوں کی قدر ان سے پوچھو جو آنکھوں سے محروم ہیں۔ ہاتھ پیر کی قدر اپاہج لوگوں سے پوچھو بہرے لوگوں سے دریافت کرو کہ کان کتنی بڑی نعمت ہے۔ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ ایک دن دوپہر کی کڑی دھوپ میں ننگے پاؤں جا رہے تھے۔ جوتے نہیں تھے اس لیے پیر جلتے تھے دل میں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی استطاعت نہیں بخشی کہ جوتے خرید لیتا۔ اتنے میں ایک معذور پر نگاہ پڑی جو اسی دھوپ میں زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ سجدے میں گر پڑے کہ اللہ تعالیٰ تیرا شکر ہے کہ تو نے جوتے نہیں دیئے پاؤں تو سلامت رکھے ہیں اگر تو اس معذور کی طرح میرے پاؤں بھی مجھ سے چھین لیے ہوتے تو میں تیرا کیا بگاڑ لیتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں

ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم میرا شکر ادا کرتے رہو گے تو میں تمہارے اوپر اپنے انعامات بڑھاتا چلا جاؤں گا۔

ذخیرہ اندوزی

امام حسن بن علی نے فرمایا ہے کہ مجھے حضور ﷺ کا یہ قول مبارک اچھی طرح یاد ہے کہ جو چیز مشتبہ ہو اسے چھوڑ کر ہمیشہ ایسی چیز کو اختیار کرنا جو مشتبہ نہ ہو۔ اس روایت کو ترمذی۔ نسائی۔ امام احمد اور اکثر محدثین نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے ایک شخص سے یہ بات فرمائی تو اس نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک مجھے پتہ کیسے چلے گا کہ فلاں چیز یا فلاں عمل مشتبہ ہے اور فلاں چیز غیر مشتبہ ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اے شخص! جب ایسی صورت حال پیش آیا کرے تو اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھ کر خود اپنے دل سے پوچھ لیا کر۔ کیونکہ حرام پر مومن کا قلب مطمئن نہیں ہوتا اور حلال پر اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی کو ضمیر کی خلش کہہ لیجئے۔ انسان اپنے ضمیر کو لاکھ حیلوں بہانوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کرے اگر ایمان کا ایک ہلکا سا شائبہ اور یقین کی ایک معمولی سی چنگاری بھی اس کے دل میں ہوگی تو انسان کا ضمیر ضرور کچوکے لگائے گا۔ اور یاد دلائے گا کہ تو نے فلاں کام غلط کیا ہے۔ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ضمیر کا یہی کچوکا اور یہی خلش ایمان کی علامت ہے۔ یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اس کی آواز کو سنیں یا نہ سنیں وہ اپنا کام کر جائے گا۔ انسان کا دل بہترین مفتی ہے اس کا فتویٰ غلط نہیں ہوتا۔ حضرت حجاج بن دینار رحمتہ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ غلے کی بوریاں ایک مرد اور ایک عورت کے حوالے کیں اور کہا کہ انہیں بصرہ کے بازار میں لے جا کر فروخت کر دینا اور اسی نرخ پر فروخت کرنا جو تمہارے پہنچنے کے دن بصرہ میں ہو۔ چند دنوں کے بعد ان کا ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ جس دن

ہم لوگ آپ کا مال لے کر بصرہ پہنچے بصرہ کی منڈی میں غلے کی قلت تھی اور لمحہ بہ لمحہ بھاؤ بڑھ رہا تھا یہ دیکھ کر ہم نے مال کو روک لیا اور چند ہی دنوں میں غلے کی قلت کی وجہ سے بھاؤ بہت چڑھ گیا۔ تب ہم نے غلہ فروخت کیا اور کافی نفع کمایا ہے۔ اب آپ حکم فرمائیں تو آپ کی رقم آپ کی خدمت میں بھیج دی جائے۔ اسی وقت حجاج بن دینار رحمتہ اللہ علیہ نے انہیں جواب دیا اور لکھا کہ تم لوگوں نے خیانت کی ہے اس لیے کہ میرے حکم کے برخلاف تم نے مال کو روک کر فروخت کیا ہے۔ حالانکہ میں نے تاکید کی تھی جس دن بصرہ پہنچو اسی دن کے نرخ پر غلہ فروخت کر دینا۔ مجھے اصل مال چاہیئے نہ نفع۔ کیونکہ تم نے میرے مال کو مشتبہ بنا دیا ہے۔ اب اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ زر اصل اور منافع دونوں کو شہر بصرہ کے فقراء کے درمیان تقسیم کر دو کہ یہ بھی ایک نوع کا احتکار ہے۔ یعنی اشیائے ضرورت کو اس امید پر روک رکھنا کہ جب دام بڑھے گا اور قلت پیدا ہو گی تو زیادہ منافع کماؤں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ احتکار کرنے والا ملعون ہے اور اس کی کمائی حرام ہے۔

تلاوتِ کلامِ پاک کے آداب و حقوق

مدینے کے کنکریلے فرش پر بزم نبوت سجی ہوئی تھی ایسا لگتا کہ آسمان تھوڑی دیر کے لیے زمین پر اتر آیا ہے صحابہ کرام کے جھرمٹ میں ماہِ تابانِ نبوت جلوہ افروز تھا اور اصحابی کالنجوم کے مصداق صحابہ کرام ستاروں کے مثل ارد گرد تشریف فرما تھے۔ چشم فلک نے ایسا حسین منظر کبھی دیکھا تھا نہ کبھی دیکھے گا۔ ہم نشینوں میں وہ عاشقِ آشفتہ سر بھی تھا جس نے مارے ادب کے کبھی نام لے کر آپ کو پکارا نہ کبھی نام لے کر تذکرہ کرنا گوارا کیا وہ اپنی زبان کو اس قابل ہی نہیں سمجھتا تھا کہ اس پر وہ پاک نام آئے جس کا مسمیٰ باعث تخلیق کائنات ہے۔ وہ جب ذکر کرتا تو انہیں خلیل کے لقب سے یاد کرتا۔ کہ خلیل اسے کہتے ہیں جس کی

دوستی میں کون و مکاں کی کوئی چیز شریک نہ ہو۔ عاشق آشفتہ سر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور دریافت کیا میرے خلیل! مجھے وصیت فرمائیے۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ابوذر! تقویٰ اختیار کرو کہ یہ چیز پورے دین اور تمام معاملات کو ٹھیک حالت میں رکھنے والی ہے۔ ابوذر نے عرض کیا "کچھ اور ارشاد فرمائیں۔ فرمایا اپنے کو قرآن کی تلاوت اور ذکر الٰہی کا پابند بنا لو خدا تمہیں آسمان پر یاد کرے گا اور زندگی کی تاریکیوں میں یہ دونوں چیزیں تمہارے لیے روشنی کا کام دیں گی۔ ایک مرتبہ حضور پاک ؐ نے فرمایا "جس طرح لوہے کو پانی سے زنگ لگتا ہے اُسی طرح دل کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا حضورؐ! یہ تو بتائیں کہ دل کے زنگ کو دور کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ ارشاد ہوا۔ دل کے زنگ کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی موت کو بہت یاد کرے۔ اور دوسرے یہ کہ قرآن کی تلاوت کرے۔ موت کو یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس دنیوی زندگی کی مہلت کے بارے میں یہ تصوّر رکھے کہ بس یہ پہلی اور آخری مہلت ہے عمل کرنے کی دوبارہ نہیں ملے گی۔ آخرت کے لیے جو کچھ کرنا ہے بس انہیں دس بیس پچاس برسوں میں کر لینا ہے۔ پھر عمل کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے گا کہ موت کے بعد کی زندگی عمل کی نہیں جزا و سزا کی زندگی ہے۔

قرآن کی تلاوت کا یہ مفہوم ہے کہ تلاوت کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ٹھیر ٹھیر کر۔ غور و فکر کے ساتھ محض اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی غرض سے تلاوت کی جائے۔ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے اور اس کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچائے۔ اور قرآن کی تلاوت کے ذریعہ دنیاوی مفادات حاصل کرنے کی خواہش نہ کرے یہ ہے قرآن کی تلاوت کا ادب اور اس کا حق۔

حفاظتِ زبان

ایک دن حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں حاضر تھے۔ دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک ہم لوگوں کے بارے میں آپ کو سب سے زیادہ اندیشہ کس بات سے ہے؟ آپ نے زبان کی طرف اشارہ کیا یعنی اپنی زبان کو ٹھیک رکھنا اور کلام میں احتیاط کرنا۔ حضرت بلال بن حارث سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنے منہ سے کوئی کلمۂ خیر نکال دیتا ہے اسے اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی بہت اچھا کام کیا ہے۔ لیکن وہ ایک کلمۂ خیر کل میدان حشر میں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا سبب بن جائے گا۔ اسی طرح کوئی شخص بے سمجھے بوجھے نہایت بے پرواہی سے کوئی بری بات منہ سے نکال بیٹھتا ہے۔ اسے اندازہ بھی نہیں ہوتا نہ احساس ہوتا ہے مگر وہی بری بات کل قیامت کے دن اللہ کے غضب اور اس کی ناراضگی کا سبب بن جائے گی۔ ایک دن حضرت عقبہ بن عامر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا سرکار! مجھے یہ تو بتلایئے کہ نجات کا راستہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اپنے گھر میں ٹھہر کر اللہ کی عبادت میں مشغول رہا کرو اور تنہائی میں اپنے گناہوں کو یاد کرکے اللہ کے خوف سے رویا کرو۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مومن کبھی کسی کو طعنہ نہیں دیتا نہ کسی پر لعنت کرتا ہے نہ فحش کلامی کرتا نہ بے حیائی کا اظہار کرتا ہے۔ ابوداؤد شریف میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب بندہ کسی پر لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان پر جاتی ہے تو آسمان کے دروازے بند پاکر زمین کی طرف لوٹتی ہے۔ زمین بھی اسے جگہ نہیں دیتی تو اس آدمی کی طرف جاتی ہے جس پر لعنت بھیجی گئی ہو اگر وہ

لعنت کا مستحق تھا تو ٹھیک ورنہ لوٹ کر اسی پر پڑ جاتی ہے جو کسی پر لعنت کرتا ہے۔ صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی کو فاسق یا کافر کہتا ہے اگر واقعتہً جس کو کہا جائے فاسق یا کافر نہ ہو تو وہ فسق اور کفر لوٹ کر کہنے والے پر پڑ جاتا ہے۔ مسند احمد میں ہے ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ انہیں دیکھ کر خدا یاد آ جائے اور بد ترین بندے وہ ہیں جو چغل خوری کر کے مسلمانوں میں تفریق پھیلاتے۔ اور بھائی کو بھائی سے جدا کراتے ہیں۔ ایک دن آپ نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا لوگو! مجھے چھ چیزوں کی ضمانت دو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ بولو تو سچ بولو۔ وعدہ کرو تو اسے پورا کرو۔ تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو اسے ادا کرو۔ خود کو بدکاری سے محفوظ رکھو۔ غیر محرموں سے اپنی نگاہ کی حفاظت کرو۔ اپنے ہاتھ سے کسی کو ایذا نہ پہنچاؤ۔

اُستاد کا ادب

علم و ادب میں امام اصمعی کا جو مرتبہ تھا وہ بھلا اہلِ نظر سے پوشیدہ کیسے رہ سکتا تھا۔ اور وہ بھی ہارون الرشید جیسے صاحب علم اور علماء کے قدردان سے۔ ہارون اصمعی کا بہت ادب کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ مملکت کا استحکام اور ترقی علوم کی اشاعت اور علماء کی قدر و منزلت سے وابستہ ہے۔ وہ خود تو صاحب علم تھا ہی اس نے اپنے بیٹوں کو بھی زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ چنانچہ اس نے مامون الرشید کو علم و ادب کی تعلیم کے لیے امام اصمعی کے سپرد کر دیا۔ اور یہ سمجھ کر کہ مامون آئندہ چل کر ایک حکمران بننے والا ہے۔ اصمعی نے اسے دین و دنیا کے تمام ضروری علوم و آداب سے روشناس کرانا شروع کیا۔ امام اصمعی نے تعلیم کے ساتھ ساتھ مامون کی تربیت پر

بھی کافی زور دیا تھا اس لیے تعلیم بغیر صحیح تربیت کے بے برگ و بار اور بے اثر ہوا کرتی ہے۔ اتفاقاً ایک دن ہارون کے دل میں خیال آیا کہ مامون کو دیکھنا چاہیئے کہ کس حال میں ہے تو وہ سیدھا امام اصمعی کی قیام گاہ کی طرف گیا۔ وہاں کیا دیکھا کہ امام اصمعی اپنے پاؤں دھو رہے ہیں اور مامون پاؤں پر پانی ڈال رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ہارون کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اور سخت ناراضگی کی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ اصمعی نے سمجھا کہ چونکہ میں شہزادے سے خدمت لے رہا ہوں شاید یہ بات خلیفہ ہارون الرشید کو ناگوار گزاری ہے۔ کیونکہ شہزادہ پھر بھی تو شہزادہ ہی ہوتا ہے۔ ہارون سخت برہمی کی حالت میں بولا۔ حضرت میں نے تو شہزادے کو اس لیے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا کہ آپ اسے ادب سکھائیں گے۔ مگر یہاں تو صورت حال ہی کچھ اور ہے۔ اب اصمعی کا شک یقین میں بدل گیا۔ اور وہ سمجھ گئے کہ شہزادے سے خدمت لینا ہارون کو ناگوار گزرا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خلیفہ میں نے علم سکھانے اور تربیت کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی تو نہیں برتی ہے۔ آپ کو شکایت کیا ہے؟ خلیفہ نے کہا۔ امام آپ اپنے ہاتھ سے اپنا پاؤں دھو رہے ہیں اور شہزادہ پاؤں پر پانی ڈال رہا ہے آپ نے شہزادے کو یہ حکم کیوں نہیں دیا کہ ایک ہاتھ سے وہ آپ کا پاؤں دھوئے اور دوسرے ہاتھ سے پاؤں پر پانی انڈیلے۔ علم اللہ کا نور ہے۔ یہ بغیر استاد کی اطاعت، اس کی خیر خواہی، احترام اور خدمت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ مہربانی فرما کر آئندہ آپ شہزادے سے خدمت لینے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ فرمائیں۔ استاد کے ادب اور خدمت کی وجہ سے یہی مامون آگے چل کر اُفق اقتدار پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا اور اس کے علم و فراست کا بڑے بڑے علماء کو اعتراف کرنا پڑا۔

فرقہ واریّت

کسی معاملے یا مسئلہ میں اختلاف کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ جب انسان ہونے کے باوجود دو آدمیوں کے چہرے۔ دو آدمیوں کے احساسات طبائع، رجحانات وعادات یکساں نہیں تو بھلا دو آدمیوں کی رائے یکساں کیسے ہو سکتی ہے۔ لہذا عقائد و نظریات میلان طبع اور نقطۂ نظر میں اختلاف ہونا فطری ہے۔ صحن گلستان کا تختہ ایک ہی ہوتا ہے اس کی آبیاری بھی ایک ہی پانی سے کی جاتی ہے۔ ہوائے چمنستان میں بھی کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔ مگر ہر پھول کا رنگ جدا۔ بو جدا۔ اور نقش و نگار مختلف ہوتا ہے۔ کہ یہی رنگا رنگی و بوقلمونی ہی زینت چمن کا باعث ہے ورنہ زندگی سپاٹ اور بے رس ہو جائے۔ اختلاف کا یہی اصول دین و شریعت میں بھی ہے۔ چنانچہ اختلاف شرائع میں ہوا ہے۔ منہاج میں ہوا ہے۔ قانونی نکات اور فلسفیانہ نظریات میں بھی ہوا ہے اور اسی لیے حضور ﷺ نے اختلافِ اُمت کو رحمت سے تعبیر فرمایا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تو آغوش نبوت کے پروردہ تھے لیکن بہت سارے مسائل میں ان کے درمیان بھی اختلاف رائے تھا۔ اسی طرح محدثین و فقہا کے اقوال میں بھی بے شمار اختلافات ہیں۔

صوفیہ کے طُرق کا جائزہ لیجئے تو ان کے سلوک اور طریق مجاہدہ میں آپ کو اختلاف ملے گا۔ ان سب کے باوجود منزل سب کی ایک۔ اور مقصود سب کا ایک ہی ہے۔ یہ اختلاف رحمت ہے۔ اس سے علم میں ترقی ہوتی ہے اور انسانی فکر ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اختلاف کرنے والوں میں خلوص و للّٰہیت ہو۔ اور نظریاتی اختلاف ذاتی مخالفت اور عناد کی شکل نہ اختیار کرلے۔ ایک دوسرے کے نظریات

کا احترام کیا جائے۔ ایک دوسرے کے اکابر و اسلاف کو کلمۂ خیر سے یاد کیا جائے علمی و نظریاتی اختلاف کو عوام کی سطح پر لا کر سر پھٹول نہ کرائی جائے۔ (۳) محض دیانتداری سے اختلاف کیا جائے۔ مفاد پرستی اور نفسانیت کو راہ نہ دی جائے۔

ایک مرتبہ اپنے سینکڑوں شاگردوں کے ساتھ امام شافعی امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے مزار پر تشریف لے گئے۔ مزار کے احاطے ہی میں امام شافعی نے نماز فجر ادا کی اور اپنے مسلک کے مطابق رفع یدین کیا نہ قنوت نازلہ پڑھی۔ شاگردوں نے دریافت کیا حضرت! کیا آپ نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا ہے؟ فرمایا "نہیں میں نے صاحب مزار سے شرم کی ہے کہ ان کے مزار کے قریب ان کے مسلک کے خلاف عمل کروں۔

یہ ہے عالی ظرفی۔ رواداری۔ للٰہیت اور بے نفسی اسی قسم کا اختلاف رحمت ہے۔

پانچ خطرناک خصلتیں

مجلس نبوی میں اجلاء صحابہ مثلاً حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان۔ حضرت علی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور عبداللہ بن مسعود رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جیسے اکابر حاضر ہیں۔ چشم فلک نے نہ تو کبھی ایسا میر مجلس دیکھا تھا نہ ایسے پاکیزہ و مقدس شرکاء مجلس۔ ایک انصاری نوجوان داخل ہوا۔ اور سلام کر کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک سب سے بہتر کون مسلمان ہے؟ ارشاد ہوا سب سے بہتر وہ مسلمان ہے جس کے اخلاق بہتر ہوں عرض کیا اور حضور! سب سے زیادہ دانش مند اور ہوشیار کون ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سب سے زیادہ سمجھدار وہ آدمی ہے جو سب سے زیادہ موت کو یاد کرنے والا اور موت کی تیاری کرنے والا ہو یعنی یہ تصور ہر وقت اس کے سامنے ہو کہ دنیا کی یہ فانی زندگی ایک دن

ساتھ چھوڑ دے گی۔ اعزاء۔ اقرباء۔ مال و دولت۔ خدم و حشم۔ جاہ و مرتبہ کوئی چیز ساتھ جانے والی نہیں۔ صرف انسان کے اپنے اعمال ہونگے جو اس کے ساتھ جائیں گے۔ لہٰذا عقل مند لوگ آخرت کی تیاری میں لگے رہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سن کر انصاری نوجوان خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد آپ مجلس کی طرف متوجہ ہوئے اور حاضرین کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا پانچ خصلتیں نہایت خطرناک ہیں۔ اللہ تم کو ان سے اپنی پناہ میں رکھے اور ان کے دیکھنے سے تم محفوظ رہو۔

۱۔ جس قوم میں بے حیائی کھلم کھلا پھیل جائے اس قوم میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو پہلے کبھی ظاہر نہ ہوئی تھیں۔

۲۔ جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے وہ قحط سالی اور مشقتوں میں مبتلا ہوتی ہے اور ظالم بادشاہ ان پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔

۳۔ جو قوم زکوٰۃ ادا نہیں کرتی ان سے بارش روک لی جاتی ہے اگر جانور نہ ہوتے تو وہ بالکل ہی بارش سے محروم کر دی جاتی۔

۴۔ جو قوم اللہ اور اس کے رسول سے کیے ہوئے عہد کو توڑتی ہے اللہ تعالیٰ اجنبی دشمنوں کو اُن پر مسلط کر دیتا ہے اور وہ غیر قوم کے لوگ اس سے وہ سب کچھ چھین لیتے ہیں جو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

۵۔ جب علماء اور حکام کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرنے لگیں اور متکبّر و سرکش ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ آپس میں پھوٹ ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس وقت کو دیکھنے سے تمہیں محفوظ رکھے۔

مسلمانوں سے قرآن کا ایک سوال

جب مسلمانوں کا لشکرِ مواج سیل رواں کی طرح رومیوں کی مملکت کی طرف بڑھ رہا تھا تو روم کے گرجاؤں میں یہ امر زیر بحث تھا کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی روٹی میں خمیر ڈالا جاتا تھا یا نہیں اور ڈالا جاتا تھا تو کس قسم کا خمیر ہوتا۔ ایک

سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔ ایک جماعت کہتی تھی کہ کم از کم سات سو فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔ دوسری جماعت بتلا رہی تھی کہ اس سے بہت زیادہ تعداد میں فرشتے سوئی کی نوک پر بیٹھ سکتے ہیں۔ اس طرح کے مسائل پر دو جماعتیں بن جاتیں پھر دونوں کے درمیان مناظرہ ہوتا۔ پھر لڑائی اور خون خرابہ یہاں تک کہ لشکر اسلام پہنچا اور اس نے بہ آسانی رومی مقبوضات پر قبضہ جمالیا اس لیے کہ لشکر اسلام بنیان مرصوص سیسہ پلائی ہوئی دیوار تھا۔ ایک خدا۔ ایک رسول۔ ایک کتاب۔ ایک کلمہ۔ ایک قبلہ اور ایک دین کا علم بردار۔ آپس میں غم خوار و غم گسار۔ اشداءُ علی الکفار رحماء بینھم سب توحید کی زنجیر میں جکڑے ہوئے اور سب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پر نازاں۔ اتحاد قوموں کو ہمالہ بنا دیتا ہے۔ ملت کا اتحاد دیکھ کر دشمن لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ ہمت نہیں پڑتی کہ ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھیں۔ جانتے ہیں کہ ذرا بھی اِدھر اُدھر کیا کہ ساری اُمت مسلمہ بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑے گی۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

لیکن پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ تاتاری افواج بغداد کے دروازے پر کھڑی تھیں اور شہر میں اس سوال پر مناظرہ ہو رہا تھا کہ کوّا کھانا حلال ہے یا حرام۔ ایک فرقے کے وابستگان دوسرے فرقے کے ماننے والوں کے محلے جلا رہے تھے۔ اور تاتاری شہر میں داخل ہو گئے۔ پھر انہوں نے کسی کو معاف نہ کیا کہ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃٌ۔ کفر ایک ہی ملت ہے۔ لاکھوں سر قلم ہوئے۔ عصمتیں لُٹیں۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے۔ خانقاہیں مسمار اور مسجدیں تاراج ہوئیں کہ سعدی کو بغداد کا مرثیہ لکھنا پڑا۔ جب کمیونسٹ افواج شہر بخارا و تاشقند کی فصیلوں کے نیچے کھڑی تھیں تو شہر میں اس مسئلہ پر مناظرہ ہو رہا تھا کہ مونچھوں کے پکّے ہوئے بالوں کو چُننا جائز ہے یا نہیں۔ کمیونسٹ فوجیں داخل ہو گئیں اور آج

خیوا۔ تاجکستان۔ سمرقند۔ و بخارا کا حال آپ کے سامنے ہے۔
آج بھی وہی روسی طور خم میں آکر بیٹھے ہوئے ہیں اور پاکستان کے مشرقی اُفق پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ کیا اس نازک لمحے میں ملت پاکستانیہ کو فروعی مسائل میں اُلجھانا اور قوم کے شیرازے کو پارہ پارہ کرنا درست ہے؟ یہ ایک سوال ہے جو قرآن ہم سے پوچھ رہا ہے۔

توبہ و استغفار

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو سب سے پہلے اسے اپنے عیوب کی دید عطا فرماتا ہے ظاہر ہے کہ جب تک آدمی کو اپنے گناہوں اور عیوب کی طرف توجہ نہ ہو اسے توبہ کا خیال آسکتا ہے نہ توبہ کی توفیق حاصل ہو سکتی ہے۔ توبہ کے بغیر عبادت درست نہیں ہوتی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی آیت التائبون العابدون میں توبہ کا ذکر عبادت پر مقدم رکھا ہے۔ عبادت کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے سابقہ گناہوں سے تائب ہو۔ اصلاح احوال کی پہلی منزل توبہ اور آخری مقام مقام عبودیت ہے۔ ابتدائی منزل سے گزرے بغیر انسان انتہائی مقام میں کیسے داخل ہو سکتا ہے۔ رجوع اور انابت کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ایک احساس ندامت۔ ایک لمحے کا کرب و اضطراب۔ پشیمانی و شرمندگی یہی تو اس راہ کا سب سے بڑا زاد راہ ہے۔ تھک ہار کر جب بندہ اپنے معبود کی بارگاہ میں گر پڑتا ہے تو اس کی غفاری و ستاری کو جوش آجاتا ہے اور دست قدرت بندے کی دستگیری کیلئے آگے بڑھتا ہے۔ کہ کمال ساقی گری گرتوں کو تھام لیتا ہے۔
ایک دن حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا فرزند رسول مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمایئے

کہ میرے قلب کی سیاہی دور ہو جائے کہ باری تبارک و تعالیٰ کی مسلسل نافرمانیوں نے میرے دل کو تاریک کر رکھا ہے۔ امام نے فرمایا داؤد! تم تو اپنے دور کے یکتا زاہد ہو۔ تم نے نعیم آخرت کی خاطر دنیوی لذتوں سے منہ موڑ رکھا ہے۔ تمہیں میری نصیحت کی کیا ضرورت؟ حضرت داؤد طائیؒ نے عرض کیا اے پیغمبر خدا کے فرزند! آپ لوگوں کو تمام مخلوق پر فضیلت حاصل ہے اس لیے آپ کا ہمیں نصیحت کرنا ضروری ہے۔ امام جعفر صادقؒ داؤد طائیؒ کی بات سُن کر آبدیدہ ہو گئے فرمایا داؤد! میں تو اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں کل قیامت کے دن میرے جد بزرگوار ﷺ اس بات پر میری گرفت نہ فرمائیں کہ تو نے میری پوری پیروی کیوں نہیں کی۔ داؤد! میں تو اسی تصوّر سے ہر وقت لرزاں و ترساں رہتا ہوں۔ اللہ کے ہاں حسب و نسب سے کوئی کام نہیں بنے گا۔ اُس جہان میں تو انسان کا عمل دیکھا جائے گا۔ امام جعفر صادق کا جواب سُن کر داؤد طائی رونے لگے اور کہا خدایا! جس کا خمیر نبوت کے پانی سے گوندھا گیا جس کی فطرت کی تعمیر حجت و برہان سے ہوئی۔ جس کے نانا رسول پاک ﷺ ہوں جس کی دادی سیدہ خاتون جنت فاطمۃ الزہراء ہوں جب وہ حیران و پریشان ہے تو داؤد طائی کس شمار و قطار میں ہے۔ سوائے تیری رحمت و مغفرت کے کوئی سہارا نہیں۔ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ یہ جملے ادا کر رہے تھے اور آنسوؤں کا سیل رواں آنکھوں سے جاری تھا۔

اُستاد کا مقام

والیٔ خراسان کے بیٹے طاہر کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ باپ کی زندگی ہی میں وہ حج کرنے مکہ معظمہ آیا۔ چلتے وقت باپ نے نصیحت کی تھی کہ حج کے فوراً بعد واپسی کی کوشش نہ کرنا کیونکہ خوش قسمتی سے اس وقت مکہ میں بڑے

بڑے علماء اور محدثین کا اجتماع ہے۔ کچھ دن قیام کر کے علماء سے تحصیل علم حاصل کرنا کہ علم اللہ کا نور ہے اور دولت و سلطنت کو تو زوال لاحق ہو سکتا ہے مگر علم کی دولت لازوال ہے۔ والیٔ خراسان کا نمائندہ اسحاق بن ابراہیم مکہ معظمہ میں موجود تھا اسے جب اطلاع ملی کہ ولی عہد حج کے ارادے سے آ رہے ہیں تو اس نے طاہر کے قیام کا نہایت معقول انتظام کیا حج سے فراغت کے بعد طاہر نے اسحاق بن ابراہیم کو باپ کے حکم سے مطلع کیا۔ اسحاق نے مناسب خیال کیا کہ طاہر سے علمائے مکہ کا تعارف کرا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے مکان پر مکہ معظمہ کے تمام علماء کو مدعو کیا اور انہیں بتلایا کہ خراسان کا ولی عہد ان سے ملاقات کر کے علمی استفادہ کرنا چاہتا ہے۔ مکہ کے سارے علماء نے اسحاق بن ابراہیم کی دعوت قبول کر لی اور ہر قسم کے علماء شریک مجلس ہوئے۔ مگر ابو عبید نے شرکت سے انکار کر دیا اور کہا کہ علم کے پاس خود آنا چاہیئے کہ علم کی مثال کنویں کی اور طالب علم کی مثال پیاسے کی ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا بلکہ پیاسا خود چل کر کنویں کے پاس آتا ہے میں دین کے علم کو دولت کے آستانے پر لے جا کر رسوا نہیں کر سکتا۔ اگر ولی عہد مجھ سے کچھ سیکھنا چاہتا ہے تو آدابِ علم کا تقاضا ہے کہ وہ مؤدبانہ میرے درس میں حاضر ہو۔ اسحاق بن ابراہیم کو ابو عبید کی یہ بات سخت ناگوار گزری اور ابو عبید کو والیٔ خراسان کی طرف سے * دو ہزار درہم کا ماہانہ وظیفہ ملتا تھا اسے بند کر دیا۔ اور والیٔ خراسان کو مطلع کر دیا کہ ابو عبید کے جواب کی بنا پر میں نے یہ اقدام کیا ہے۔ انہوں نے ولی عہد کا احترام نہیں کیا لہٰذا وہ والیٔ خراسان کے وظیفے کے مستحق نہیں ہیں۔ والیٔ خراسان کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے فوراً اسحاق بن ابراہیم کو خط لکھا کہ "ابو عبید نے بالکل درست جواب دیا ہے۔ یہی جواب ایک عالمِ دین کے شایانِ شان ہے۔ آج سے میں علامہ ابو عبید کا وظیفہ دوگنا کرتا ہوں۔ اب انہیں تم دو ہزار درہم ماہانہ کے بجائے چار ہزار

درہم ماہانہ دیا کرو یہ فرمان ملتے ہی تم اس پر عمل کرو اور بقایا رقم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ادا کرو۔ والئ خراسان کا پیغام ملنے کے بعد اسحاق بن ابراہیم کے سر سے دولت کا نشہ اتر چکا تھا اور اسے علم و اہلِ علم کے وقار کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا۔ ابوداؤد شریف میں روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بوڑھے مسلمان۔ عالم دین۔ حافظ قرآن۔ عادل بادشاہ اور استاد کی عزت کرنا تعظیمِ خداوندی میں داخل ہے۔

بعد از وفات والدین کے حقوق

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایک خچر پر سوار سر پر عمامہ باندھے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی طرف جا رہے تھے۔ دورانِ سفر ایک گاؤں کے پاس سے ان کا گزر ہوا۔ ایک دیہاتی نے جو انہیں دیکھا تو پہچان گیا کہ ہو نہ ہو یہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادۂ گرامی ہیں۔ لپکا لپکا دیہاتی قریب آیا۔ جناب ابن عمر نے جو دیکھا کہ ایک بوڑھا تیزی سے ان کی طرف آ رہا ہے تو سواری روک لی۔ بوڑھا قریب آیا۔ غور سے ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کا چہرہ دیکھا تو پوچھا۔ کیا آپ حضرت فاروق اعظم کے لڑکے نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا جی ہاں! اور سواری سے اُتر پڑے۔ دریافت کیا آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ اس نے جواب دیا "میں آپ کے والد گرامی کی خدمت میں اکثر حاضری دیا کرتا تھا۔ میں ان کا دوست تھا۔ آج عرصے کے بعد آپ کو جو میں نے دیکھا تو آپ کے والد مجھے یاد آ گئے۔ آپ کا چہرہ ان کے مشابہ ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جو سُنا کہ وہ دیہاتی ان کے والد کا دوست ہے تو اپنا خچر اور عمامہ اس کے حوالے کر دیا۔ وہ بیچارا انکار ہی کرتا رہا مگر ابن عمر نہیں مانے اور فرمایا کہ آپ یہ عمامہ سر پر باندھ لیں اور یہ خچر قبول فرما لیں۔ میری طرف سے یہ ہدیہ ہے۔ ناچار دیہاتی نے قبول کر لیا۔ جب

حضرت ابن عمرؓ آگے بڑھے تو ان کے رفقائے سفر نے کہا۔ جناب والا! خدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ نے اپنی سواری دیہاتی کے حوالے کر دی۔ عمامہ اسے دیدیا۔ اتنا طویل سفر ہے آپ نے اپنی حاجت کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ والد کی وفات کے بعد اس کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے حسنِ سلوک کیا جائے۔ چنانچہ جوں ہی مجھے پتہ چلا کہ یہ دیہاتی میرے والد کے دوستوں میں سے ہے تو میں نے ضروری سمجھا کہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤں۔ اس وقت میرے پاس یہی دو چیزیں ایسی تھیں جنہیں میں آسانی سے اسے دے سکتا تھا۔ میں نے دیدیا۔

۲ ابوداؤد شریف میں ابو اسید ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اپنے والدین کی وفات کے بعد اگر میں ان کے ساتھ کوئی نیکی کرنا چاہوں تو کیا کروں؟ آپ نے ارشاد فرمایا ان کے لیے دعائے مغفرت کرو۔ انہوں نے اگر کسی سے اپنی زندگی میں کوئی وعدہ کیا تھا تو اسے پورا کرو ان کے اعزا و اقربا کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور ان کے دوستوں کی تعظیم کرو۔ یہ آپ نے اس لیے حکم دیا کہ اس طرز عمل سے والدین کی روح کو خوشی حاصل ہوگی۔

والدین کا فرض

والدین پر اولاد کی صرف ظاہری نشو و نما ہی واجب نہیں ہے بلکہ ازروئے قرآن ان پر اپنی اولاد کی باطنی اور روحانی تربیت بھی فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے اولاد بھی ایک بہت بڑا انعام ہے لیکن انعام کے ساتھ ساتھ یہ بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مومنوں کو حکم دیا ہے کہ اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و

عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ جہنم کی آگ سے بچانے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اپنی اولاد کے اخلاق و کردار کی نگرانی کرو۔ اور ان تمام برائیوں اور خرابیوں سے انہیں بچانے کی کوشش کرو جو انہیں آخر کار جہنم کا مستحق بنا دینے والی ہیں۔ جہنم سے بچانے کے دو طریقے بتلائے گئے ہیں ایک تو یہ کہ ان کی تربیت خالص تقویٰ اور پرہیزگاری کے ماحول میں کی جائے۔ ان کے سامنے ایسا نمونۂ عمل پیش کیا جائے کہ وہ بچپن ہی سے والدین کی نقل کر کے خود بخود ان کے سانچے میں ڈھل جائیں اور انہیں حلال روزی کھلائی جائے کیونکہ حرام غذا بچوں میں حرام خیالات، فاسد جذبات اور ناپاک کردار پیدا کرتی ہے اور کوئی لاکھ کوشش کر ڈالے وہ بچہ صراط مستقیم کا رُخ ہی نہیں کر سکتا جس کی پرورش رزق حرام سے ہوئی ہو۔ اسی طرح کے بچے والدین کے باغی اور گستاخ ہوتے ہیں اور والدین یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ایسی اولاد سے تو بے اولاد رہنا بہتر تھا۔ قرآن کریم نے دوسرا طریقہ یہ بتلایا ہے کہ اپنی اولاد کو نیک و سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کی نیکی و سعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیئے کہ اصل دلوں کو پھیرنے والا اور گمراہی سے بچانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بعض احادیث میں ہے کہ والدین کی دعا یا بددعا اولاد کے حق میں رد نہیں کی جاتی۔ اولاد کو پیار چاہیئے۔ توجہ چاہیئے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ چلتے وقت جب لڑکھڑانے لگے تو کوئی اسے سنبھال لے۔ وہ بیمار پڑے تو کوئی اس کی تیمارداری کرے۔ اور اس کے دکھ سکھ کا ساتھی ہو۔ جب والدین یہ پیار اور رفاقت اسے دیتے ہیں تو اس کے وجود کی گہرائیوں میں اعتماد اور محبت کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں اور وہ زندگی کی جد و جہد میں مردانہ وار حصہ لینے کے قابل بنتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا وہ میری جماعت سے نہیں ہے۔ حدیث

حضور ﷺ رحمت مجسم تھے۔ ایک مرتبہ آپ سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کو گود میں لیے پیار کر رہے تھے کہ ایک اعرابی صحابی حضرت اقرع بن حابس آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے انہیں آپ کا یہ پیار پیغمبرانہ وقار کے خلاف معلوم ہؤا اور کہا کہ "کیا آپ بھی بچوں کو پیار کرتے ہیں ؟ میرے تو دس بچے ہیں مگر میں نے تو آج تک کسی بچے کو پیار نہیں کیا ہے" اقرع کا یہ جملہ سُن کر آپ کا چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا۔ ارشاد فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم اور شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں ؟" صحیح بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحم نہیں فرماتا" حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں ایک دن ایک غریب عورت آئی اس وقت گھر میں سوائے ایک کھجور کے کچھ نہیں تھا۔ سیدہ عائشہ نے وہی کھجور اس عورت کو دیدی۔ سائلہ نے اس کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور اپنی دونوں بچیوں میں تقسیم کر دیئے۔ اس کا یہ عمل سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھلا لگا۔ اور جب سرور دو جہاں ﷺ تشریف لائے تو آپ سے یہ واقعہ عرض کیا آپ نے ارشاد فرمایا۔ عائشہ! اللہ تعالیٰ جسے لڑکیاں دے اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ بچیاں والدین اور جہنم کے درمیان آڑ بن جائیں گی۔ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا "باپ اپنے بچے کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے" آپ نے شدت کے ساتھ اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کوئی چیز دینے میں کسی لڑکے کو کسی دوسرے لڑکے یا لڑکی پر ترجیح دی جائے۔ ایک شخص نے اپنے بیٹوں میں سے ایک بیٹے کو ایک غلام دیا اور چاہا کہ اس عطیہ پہ حضور ﷺ کو گواہ بنائے تو آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے اپنے سب لڑکوں کو ایک ایک غلام دیا ہے ؟ انہوں نے عرض کیا

نہیں آپ نے فرمایا کہ "میں اس ظالمانہ عطیہ پر ہرگز گواہ نہ بنوں گا۔

تعلیمِ دین

اگر حاضرین حیرت زدہ تھے تو غلط نہیں تھا۔ اتنا خوبصورت آدمی۔ اُجلے کپڑے پہنے ہوئے۔ بال سیاہ۔ مگر اجنبی مدینہ کی آبادی بھی اس وقت زیادہ نہیں تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے تھے لیکن یہ مدینہ کا باشندہ نہیں ہے۔ اگر باہر سے آیا ہے تو سفر کی وجہ سے کپڑے میلے ہونے چاہیئں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم چہرہ غبار آلود ہونا چاہیئے۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔ اجنبی آیا اور حاضرین کو سلام کرنے کے بعد سیدھا نبی اکرم ﷺ کے سامنے جاکر بیٹھ گیا۔ اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنوں سے ملالیے اور اپنے ہاتھ سرکار ﷺ کے زانو پر رکھ کر سوال کیا کہ اللہ کے رسول! یہ تو بتلایئے کہ اسلام کیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تو شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرے زکواۃ دے۔ رمضان کے روزے رکھے۔ اور اگر استطاعت ہو تو حج کرے۔ اس نے کہا کہ آپ نے درست فرمایا۔ حضرت عمر بن الخطاب نے کہا کہ ہمیں یہ سُن کر اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب آدمی ہے خود ہی سوال بھی کرتا اور ساتھ ہی تصدیق بھی کیے جا رہا ہے پھر اس نے سوال کیا کہ ایمان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ کہ تو اللہ پر اس کے ملائکہ، کتابوں، رسولوں یوم آخرت اور تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لائے۔ اس نے کہا یہ بھی آپ نے درست فرمایا۔ اجنبی نے کہا اچھا یہ تو بتلایئے کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تیرے اندر اس کی صلاحیت نہیں ہے تو کم از کم یہ احساس ضرور ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اچھا یہ فرمایئے کہ قیامت کب آئے گی اور قیام

قیامت کی کیا صورت ہو گی۔ حضور ﷺ نے جواب دیا اس کی تفصیلات جتنی کہ سائل جانتا ہے اتنی ہی میں بھی جانتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں جانتا۔ اجنبی نے کہا اچھا اس کی چند نشانیاں اور علامتیں تو بتلا دیں۔ آپ نے فرمایا اس کی ایک علامت تو یہ ہے کہ والدین کی نافرمانی عام ہو جائے گی اور لڑکے اپنی والدہ سے اس طرح برتاؤ کرنے لگیں گے جیسے کہ وہ آقا ہوں اور والدہ ان کے گھر کی لونڈی۔ اور ننگے پاؤں، ننگے بدن بکریاں چرانے والے نیچے درجے کے لوگ اونچے اونچے محل اور مکان بنانے لگیں گے۔ یہ باتیں سُن کر اجنبی اُٹھا اور روانہ ہو گیا۔ راوی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس کے جانے کے بعد حضور ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا عمر! جانتے ہو یہ کون آدمی تھا۔ میں نے کہا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ بخاری و مسلم شریف میں ہے کہ آپ نے فرمایا وہ جبریل علیہ السلام تھے جو اس لیے تشریف لائے تھے کہ تمہارے سامنے سوال کر کے دین کی اہم باتوں کی تمہیں تعلیم دیں۔

مسلمان کی پردہ پوشی

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے کہ نہ تو اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ اور یاد رکھو کہ جو اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری کرے گا۔ اور جو کسی مسلمان کی پریشانی دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پریشانی دور کرے گا اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا! ظلم گناہ عظیم ہے۔ احادیث میں ظلم کو ظلمات کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مظلوم بندے کے قریب

ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ مظلوم کی فریاد اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ ہر دعا قبولیت کی طرف بڑھتی ہے لیکن مظلوم کی دعا کی طرف اللہ تعالیٰ کی قبولیت خود اُتر کر آتی ہے اس لیے مظلوم کی بددعا سے ڈرنا چاہیئے! بلکہ مسلمانوں کو تو حکم دیا گیا ہے کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ لو اور مظلوم کی مدد کرو۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان حاجت مند ہے۔ تو ایک مسلمان کی طرح اس کی حاجت روائی مسلمان پر واجب ہے۔ آج اس کے اجر کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن کل قیامت کے دن حشر کے میدان میں جب رشتے ٹوٹ جائیں گے اور کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ مسلمان کی یہ حاجت روائی کام آئے گی۔ اور میدان حشر کا مالک اپنے بندے کی دستگیری فرمائے گا۔

مسلمان کی پردہ پوشی بھی بہت بڑی عبادت ہے۔ عیب کس میں نہیں ہے۔ بے عیب ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس لیے اگر کوئی نیک مسلمان کوئی غلطی کر بیٹھے تو اخوت ایمانی کا تقاضا ہے کہ اسے لوگوں کی نظروں سے گرانے کے لیے اس کا عیب جگہ جگہ بیان نہ کیا جائے بلکہ اس کے عیب پر پردہ ڈال دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے عیوب اور گناہوں پر قیامت کے دن پردہ ڈال دے گا۔ البتہ اگر کوئی شخص علی الاعلان احکام خداوندی کو توڑتا اور اس کی مقرر کردہ حدود کو پامال کرتا ہے تو اس کی پردہ پوشی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ایسے ذرائع استعمال کرنے چاہیئں جن کے باعث اس برائی کا قلع قمع ہو۔

شیخ ابوالحسن نوریؒ اور خلیفہ معتصم باللہؒ

لوگوں کو یقین تھا کہ آج شیخ ابوالحسن نوری کی گردن ماردی جائے گی اس لیے کہ خلیفہ معتضد باللہ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بات کرنے سے پہلے تلوار استعمال کرتا ہے۔ شاہی دربار سجا ہوا ہے اور خلیفہ معتضد باللہ تخت شاہی

پر متمکن۔ البتہ دربار میں شیخ ابوالحسن نوری، خلیفہ، موسیٰ بن افلح کوتوال کے سوا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے۔ شرعۃ الفامین نامی گھاٹ کا نگراں موسیٰ بن افلح آگے بڑھا۔ اور خلیفہ کے سامنے مقدمہ پیش کیا۔

" عالیجاہ! گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کشتی پر جناب والا کے استعمال کے لیے شراب سے بھرے ہوئے مٹکے رکھے تھے۔ میں پروانۂ راہداری جاری کرنے میں مصروف تھا کہ یہ درویش جو اپنا نام ابوالحسن نوری بتلاتا ہے وضو کرنے گھاٹ پر آیا۔ اس نے جب کشتی پر شراب کے مٹکے دیکھے تو اس کا پارہ چڑھ گیا۔ ملاح سے دریافت کیا کہ ان مٹکوں میں کیا ہے؟ ملاح نے تبلایا کہ خلیفہ معتضد باللہ کے لیے شراب لے جائی جا رہی ہے۔ اتنا سننا تھا کہ یہ درویش غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ ملاح منع ہی کرتا رہا۔ بار بار جتلاتا رہا کہ یہ مٹکے خلیفہ کے لیے لیجائے جا رہے ہیں۔ مگر اس نے کسی کی ایک نہ سُنی اور لاٹھی لے کر مٹکوں پر پل پڑا اور تمام مٹکوں کو چور چور کر دیا۔ جب میں نے ملاح کے چیخنے کی آواز سُنی تو بھاگا بھاگا آیا مگر میرے پہنچتے پہنچتے یہ بوڑھا اپنا کام کر چکا تھا۔ عالی جاہ! یہ بوڑھا بڑا گستاخ اور جبری ہے۔ اس نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدائی فوجدار ہے۔ اسے اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اس کی گستاخی بادشاہِ وقت کی گستاخی ہے۔ جس کے نتائج نہائیت خوفناک ہو سکتے ہیں۔ عالی جاہ! مجرم آپ کے دربار میں حاضر ہے۔ اور بندہ جناب والا کے فرمان عالی کا منتظر۔

کوتوال نے یہ ساری کہانی کچھ ایسے اشتعال انگیز انداز میں بیان کی کہ خلیفہ معتضد باللہ کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر زناٹے دار تمانچہ رسید کر دیا ہو۔ وہ آگ بگولا ہو کر گویا ہوا۔

" تم کون ہو؟ "

شیخ ابوالحسن نوری طمانیت و وقار کے پیکر بنے کھڑے ہیں۔ موت سامنے ہے لیکن ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ چہرے پر عزم و استقلال کے اثرات نمایاں ہیں۔ اور دل ہے کہ سکینت کا مسکن بنا ہوا ہے۔ نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"میں محتسب ہوں"

خلیفہ چیخ کر بولا۔ "تمہیں محتسب کس نے بنایا ہے؟

"جس نے تجھے حکمران بنایا ہے" شیخ نے بہادری سے جواب دیا۔ شیخ کا جواب سن کر اہل دربار پر سناٹا چھا گیا۔ موسیٰ بن افلح کوتوال تو گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کہ جلاد موجود ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ خلیفہ اب ضرور بالضرور شیخ کے قتل کا حکم صادر کرے گا۔ مگر یہاں تو حالات ہی دوسرے ہیں۔ خلاف توقع اور خلاف اُمید۔ بجائے اس کے کہ خلیفہ شیخ کو قتل کرنے کا حکم دیتا۔ سر جھکا کر سوچ میں پڑ گیا۔ اب ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ حاضرین اپنی سانس روکے ہوئے ہیں۔ دیکھو اب کیا ظہور میں آتا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد خلیفہ نے سر اٹھایا اور شیخ سے سوال کیا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ کام تم نے کیوں کیا؟

شیخ ابوالحسن نوری نے کہا۔

"خلیفہ! میں نے یہ کام تیری دشمنی میں نہیں بلکہ تیری دوستی اور خیر خواہی میں کیا ہے۔ تو ایک ناجائز کام میں مبتلا تھا۔ شراب کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ شراب انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مسلمانوں کا حکمران جہنم کا ایندھن بنے۔ اس لیے میں نے مٹکے توڑ دیئے۔ کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کا اہم ترین ستون اور عظیم ترین فریضہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس ذات کی قسم

جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا ورنہ عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر عذاب نازل کر دے گا۔ اس وقت تم دعا کرو گے لیکن تمہاری دعا قبول نہیں کی جائے گی۔ خلیفہ میں نے اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بموجب اس فریضے کو ادا کیا ہے مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ نہ مجھے نتائج کی سنگینی کا خیال ہے۔ میرے فرض نے مجھے آواز دی۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

شیخ کی اس مختصر گفتگو نے خلیفہ معتضد باللہ کے دل کی دنیا کو منقلب کر دیا۔ اقتدار کا نشہ سر سے اتر گیا۔ مالک الملک کے دربار میں حاضری کے خیال نے اس میں احساس ندامت پیدا کر دیا۔ اور دنیا نے دیکھا کہ بنو عباسیہ کا پُر جلال حکمران ایک گدائے بے نوا کا دامن تھامے توبہ کر رہا ہے۔

حق کا تیر نشانے پر لگ چکا تھا اس لیے کہ شیخ کا عمل ہر قسم کی نفسانیت سے خالی تھا اور شیخ کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ تھا۔

اصولِ تجارت

اسلام ترک دنیا۔ رہبانیت اور بے عملی کا دین نہیں ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر جہاد زندگانی میں حصہ لینے، جد و جہد کرنے، روزی طلب کرنے اور حقوق اللہ و حقوق العباد کو ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بہت سے ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ ہی صرف اس مشقت سے ہوتا ہے جسے کوئی مسلمان حلال روزی طلب کرنے میں برداشت کرتا ہے۔ سورۂ جمعہ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ جب جمعہ کی نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی روزی طلب کرو۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ

جس طرح نماز پڑھنا۔ روزہ رکھنا اور حج کرنا عبادت ہے اسی طرح اگر محض اللہ کا حکم سمجھ کر حلال روزی طلب کی جائے تو وہ بھی عبادت ہے البتہ طلب معاش کا یہ تصور مطلق اور حدود و قیود سے بالکل آزاد نہیں بلکہ اسلام نے اس طلب پر بہت سی پابندیاں عائد کی ہیں۔ مثلاً اسلام طلب معاش میں کسی قسم کی بدعہدی، فریب اور بے ایمانی کی اجازت نہیں دیتا۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہے اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ۔ اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں چند لفظوں میں خاتمہ کر دیا۔ صحیح مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گزر رہے تھے تو ایک جگہ آپ نے غلے کا ایک ڈھیر دیکھا آپ نے اس میں اپنا دست مبارک ڈالا تو اسے اندر سے بھیگا ہوا اور باہر سے خشک دیکھا۔ آپ نے غلے والے سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ دوکاندار نے عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ فرمایا کہ تو پھر اسے اُوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں۔ یاد رکھو جو دھوکہ دے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لیے جھوٹی قسم کھائے گا وہ قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ سے ملے گا تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر غضبناک ہوگا۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حشر کے دن ایسے شخص سے نفرت کی وجہ سے رُخ پھیر لے گا۔ اگر مقدمہ بازی میں کوئی شخص بے ایمانی، زور استدلال اور اپنے خود ساختہ ثبوتوں کے ذریعہ اپنے حق میں عدالت سے فیصلہ بھی کروالے تو وہ چیز اس کے لیے حلال نہ ہوگی۔ ابوداؤد شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فریقین میں سے کوئی شخص زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعوے کو خوبی سے بیان کر کے اگر مجھ سے اپنے حق میں فیصلہ بھی کرالے اور میں اسے کوئی ایسی چیز دلا دوں جو اس کی نہیں ہے تو اسے

وہ چیز نہیں لینی چاہیئے کیونکہ درحقیقت اسے میں نے آگ کا ایک ٹکڑا دیا ہے۔

مال کا انبار۔ زمین کے وسیع وعریض قطعات۔ اونچی اونچی عمارتیں۔ کار اور کارخانے سب دنیا ہی میں رہ جانے والی چیزیں ہیں۔ قبر کے گڑھے میں صرف کفن کی ایک چادر اور اپنے اعمال کا توشہ لے کر جانا ہوگا۔ آخرت کا سفر بڑا صبر آزما اور بڑا طویل سفر ہے۔ اس سفر میں ایمان کے توشے کے سوا کوئی توشہ کام آنے والا نہیں۔ کیونکہ ہر شخص کو یہ سفر تن تنہا ہی کرنا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اسے کوچ کا کب حکم دے دیا جائے گا۔

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

اولاد کے حقوق

بچے چمنستان وجود کے پھول اور اس کائنات ہست و بود کی زینت ہیں۔ شریعت کہتی ہے کہ اولاد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے عظیم نعمت ہے۔ اس کی پرورش و پرداخت۔ اس کی تعلیم و تربیت۔ اس کے ساتھ شفقت و رحمت عبادت ہے۔ ایک دن ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا بچہ لے کر حاضر ہوئے۔ اور آپ کے سامنے پیار سے اپنے بچے کو چمٹانے لگے تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا تم کو اس بچے سے محبت ہے؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو تم سے ارحم الراحمین اللہ جل شانہ کو محبت ہے۔ صحابہ کرام اس شخص کو نہایت برا سمجھتے تھے جو اپنی اولاد سے محبت کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک شخص کو عامل مقرر کیا۔ دوران گفتگو میں کہیں اس

نے کہہ دیا کہ میرے کئی بچے ہیں مگر میں نے آج تک ان میں سے کسی کو چوما تک نہیں ہے۔ اس کی یہ بات سُن کر جناب فاروق اعظم سخت برہم ہوئے اور فرمایا اللہ تعالیٰ صرف محبت کیش آدمیوں پر رحم فرماتا ہے جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالیٰ بھی اسے اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے۔ صحابہ کرام صرف اپنے ہی بچوں سے محبت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی محبت بچوں کے لیے عام تھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ راستے سے گزر رہے تھے آپ نے بہت سے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا تو وہاں ٹھہر گئے۔ اور سب بچوں کو دو دو درھم دیئے۔ حضرات صحابہ بچوں کی پرورش میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔ اور اس کام کو دینی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشی عورتوں کی اس فضیلت کو خاص طور پر بیان فرمایا کہ

> عرب کی عورتوں میں قریش کی عورتیں سب سے اچھی ہیں کہ بچوں سے ان کے بچپن میں نہایت محبت رکھتی ہیں۔ اور شوہروں کے مال واسباب کی نگہداشت کرتی ہیں۔

حضرت ام سلیم بیوہ ہوئیں تو اس وقت ان کے صاحبزادے حضرت انس بن مالک بچے تھے۔ انہوں نے اسی وقت عزم بالجزم کر لیا کہ جب تک انس بن مالک کی مکمل نشوونما نہ ہو جائے گی وہ عقد ثانی نہ کریں گی اور انہوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا۔ حضرت انسؓ بار بار کہتے اللہ تعالیٰ میری ماں کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے میری ولایت کا حق ادا کیا۔

مخلوقِ خدا کے ساتھ ہمدردی

حضرت عبداللہ بن جعفر نے جب یہ دیکھا کہ حبشی غلام نے یکے بعد دیگرے تین روٹیاں کتے کے حوالے کر دیں تو وہ سخت حیران ہوئے۔ مسافر تھے۔ دورانِ سفر میں دھوپ کی شدت، پیاس اور گرمی سے پریشان ہو کر باغ میں ایک درخت کے زیرِ سایہ آرام کرنے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ آلِ جعفر میں حضرت عبداللہ بن جعفر اپنی سخاوت اور دریا دلی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا تھا مگر آپ کا مال اپنے نفس کی پرورش اور دنیوی عیش و عشرت کے حصول کے لیے نہیں تھا۔ آپ جس مسلمان کو تکلیف میں دیکھتے اس کی مدد فرماتے کہ دولت اس لیے نہیں ہے کہ آدمی اس پر سانپ بن کر بیٹھا رہے۔ حقیقی معنوں میں دولت مند وہ لوگ ہیں جن کی دولت انسانوں کے دکھ درد کو دور کرنے میں کام آتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن جعفر کی تو تربیت ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ اگر زندگی کے ان ٹھوس حقائق کا انہیں عرفان حاصل نہ ہوتا تو باعثِ تعجب تھا۔ ایسا لگتا کہ سخاوت ان کے خمیر میں شامل ہے۔ تاہم حبشی غلام کے عمل کو دیکھتے ہوئے انہیں بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک حبشی چرواہا بکریوں کی رکھوالی کر رہا ہے۔ ایک کتا آیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ چرواہے نے

ایک روٹی نکالی اور اس کے سامنے ڈال دی۔ روٹی کھا کر کتا چرواہے کا منہ دیکھنے لگا اس نے دوسری اور تیسری روٹی بھی نکالی اور کتے کے حوالہ کر دی۔ روٹیاں کھا کر کتا روانہ ہو گیا۔ عبداللہ بن جعفر چرواہے کے پاس گئے اور دریافت کیا۔ اے شخص! تجھے روز کتنی روٹیاں ملتی ہیں۔ حبشی غلام نے جواب دیا اتنی ہی جتنی کہ آپ نے ابھی دیکھیں۔ عبداللہ بن جعفر سے رہا نہ گیا۔ پوچھا۔ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اب تو کیا کھائے گا؟

غلام کا جواب سُن کر عبداللہ بن جعفر ہکا بکا رہ گئے۔ غلام نے کہا حضرت! کتے اس علاقے میں نہیں رہتے یہ کتا کہیں دور سے روٹی کی اُمید لگا کر آیا تھا میں نے سوچا کہ اگر میں اسے روٹی نہ دوں گا تو اس کی محنت ضائع جائے گی۔ اس لیے اپنی روٹی اٹھا کر اُسے دیدی۔ رہا یہ سوال کہ میں کیا کھاؤں گا؟ تو کوئی بات نہیں میں ایک وقت فاقہ ہی کر لوں گا۔ ایک وقت فاقہ کر لینا کتے کا آسرا توڑ دینے سے زیادہ بہتر ہے۔ حبشی غلام کا یہ جواب حضرت عبداللہؓ بن جعفر کو اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اس سے اس کے مالک کا نام اور پتہ دریافت کیا۔ مالک کے پاس پہنچے اور اس سے وہ غلام۔ وہ باغ اور بکریوں کا پورا ریوڑ خرید لیا۔ دوسرے دن غلام کے پاس تشریف لائے۔ اس سے فرمایا کہ آج کے دن سے تو آزاد ہے۔ یہ باغ اور بکریوں کا یہ ریوڑ سب تیری ملکیت ہیں۔ جا اور آزادی و عافیت کے ساتھ زندگی گزار۔ حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ غلام نے مجھے دعا دی۔ میرا شکریہ ادا کیا۔ بکریوں اور باغ کو صدقہ کر دیا۔ اور وہاں سے چلا گیا۔ یہ بہت دنوں کی بات ہے مگر آج بھی اس غلام کی دریا دلی جب یاد آتی ہے تو گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ شرافت۔ عالی ظرفی۔ بلند نگاہی کسی خاص طبقے۔ نسل یا خاندان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اکثر گدڑیوں میں بھی لعل ہوتے ہیں۔

اخلاص

اگر بدن سے روح نکل جائے تو انسان کا بدن مٹی کا ڈھیر ہے۔ پھول سے خوشبو الگ ہو جائے تو وہ بے وقعت ہے۔ ساز کی زینت آواز سے ہے۔ آواز نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ بالکل اسی طرح عبادت کی روح۔ اس کی خوشبو اور اس کی زینت اخلاص سے ہے۔ کہ صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور اس کا حکم بجا لانے کے لیے عبادت کی جائے۔ اگر عبادت میں ریاکاری، بناوٹ اور دکھاوا ہو تو از روئے حدیث وہ شرک ہے کہ عبادت تو کرتا ہے اللہ کی اور اس کے ذریعہ رضامندی مخلوق خدا کی تلاش کرتا ہے۔ حالانکہ اگر خالق راضی ہو جائے تو سب راضی ہو جاتے ہیں۔ اللہ والوں میں یہی اخلاص ہوتا ہے جو ان کی عبادتوں کو قبولیت سے اور مسجدوں کو لذت سے آشنا کرتا ہے۔ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ وعظ کے دوران فرمایا کہ لوگو! میں نے اخلاص کی تعلیم ایک حجام سے حاصل کی ہے اس زمانے میں جبکہ میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا۔ میں نے ایک حجام کو دیکھا کہ وہ ایک امیر آدمی کی حجامت بنا رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ خدا کے لیے میری بھی حجامت بنا دے۔ اللہ کا واسطہ سُن کر حجام کے حال میں ایک تغیر پیدا ہوا۔ اور اس نے اسی وقت امیر کی حجامت چھوڑ کر میرے بال کاٹنے شروع کر دیئے۔ امیر بیچارہ بیٹھا یہ ماجرا دیکھتا رہا۔ میرے بال کاٹنے کے بعد حجام نے ایک کاغذ کی پڑیا میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اور امیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے پڑیا دیکھی تو اس میں ریزگاری تھی۔ میں نے دریافت کیا۔ بندۂ خدا! یہ کیا ہے۔ حجام نے کہا۔ یہ پڑیا رکھ لو۔ اپنی ضرورت میں خرچ کر دینا۔ مسافرت میں میرے مالی حالات ٹھیک نہیں تھے۔ اور میں بے حد ضرورت مند تھا۔ میں نے پڑیا تو رکھ لی لیکن دل میں نیت کر لی۔ کہ اللہ تعالیٰ جوں ہی کوئی سبیل لگائے

گا میں اس کو اس احسان کا بدلہ ضرور دوں گا۔ کیونکہ قرآن میں ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہی ہوتا ہے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہؤا کہ چند ہی دنوں بعد بصرہ سے میرا ایک دوست آیا اور اس نے اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی مجھ کو پیش کی۔ اشرفی کی تھیلی ہاتھ میں آتے ہی مجھے اپنا وہ عہد یاد آ گیا۔ اور تھیلی لے کر اس حجام کی تلاش میں نکلا۔ تھوڑی بہت تلاش کے بعد حجام مل گیا۔ میں نے وہ تھیلی اسے پیش کر دی۔ تھیلی دیکھ کر حجام سخت برہم ہؤا۔ اس نے کہا۔ اے شخص! میں نے تیری خدمت صرف اس نام کی عظمت کا احساس کرتے ہوئے کی تھی۔ جس کا تونے واسطہ دیا تھا۔ تونے میرے مولا وخالق اللہ رب العزت کا نام لیا۔ میں نے امیر کی ناراضی کی پرواہ نہ کی اور اس کی حجامت چھوڑ کر تیری خدمت میں لگ گیا۔ اب تو مجھے اس خدمت کا معاوضہ دینے آیا ہے۔ کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں کہ خدا کے واسطے کام کرنے والا کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا۔ میں معاوضہ لے کر اپنی نیکی اور خدمت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اشرفیوں کی یہ تھیلی اٹھا اور اپنی راہ لے۔

حضرت جنید بغدادی کا بیان ہے کہ میں اس حجام کا اخلاص دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ ایک معمولی حجام عبادت کی اُس روح سے آشنا ہے جس سے بڑے بڑے بھی بے خبر ہیں

خوفِ خدا

سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا ہے۔ بہت جلد لشکر نور لشکر ظلمت پر غلبہ حاصل کرلے گا۔ تاہم ابھی فضاؤں میں آوازِ اذاں نہیں گونجی ہے۔ اندھیرا شیر فروش کے ایک کچے سے بوسیدہ مکان میں ماں بیٹی کے درمیان مکالمہ جاری ہے۔ مکالمے کی زبان بہت سادہ ہے لیکن جذبات ایسے پاکیزہ کہ شعر وادب کے شاہکار ان پر قربان۔ کیونکہ یہاں سچ ہے۔ صرف سچ اور

سچائی سادہ ہوتی ہے۔ اس میں تصنع نہیں ہوتا۔ بناوٹ نہیں ہوتی۔ دل سے نکلتی ہے۔ اور دل کے آر پار ہو جاتی ہے۔ سچائی میں قوت بھی ہوتی ہے اور استحکام بھی۔ وہ خود کو منوا کر رہتی ہے۔ اور آخر کار اسے وہ مقام مل جاتا ہے جس کی وہ اہل ہوتی ہے۔ ایک بوسیدہ اور خستہ سے مکان میں گفتگو کرنے والے تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہماری گفتگو میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ دروازے کے قریب امیرالمومنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق کان لگائے کھڑے ہیں۔ ماں نے بیٹی سے کہا۔ بیٹی! دودھ میں پانی ملا دے۔ بیٹی از راہ ادب خاموش کھڑی ہے۔ جب ماں نے دیکھا کہ اس کے حکم پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے تو اس کے لہجے میں ذرا تلخی آ گئی۔ سُنتی نہیں۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ تیرا باپ دودھ لے کر فروخت کرنے کے لیے بازار جائے گا۔ آج دودھ کی مقدار کم ہے۔ ہم لوگ غریب آدمی ہیں۔ ہمارا گذارا نہیں ہوگا۔ دودھ میں پانی ملا کر اس کی مقدار بڑھا دے۔ اب بیٹی سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہا۔ ماں! امیرالمومنین حضرت عمر نے دودھ میں پانی ملانے سے منع فرمایا ہے۔ چند دنوں پہلے کیا آپ نے خلیفہ کی منادی نہیں سُنی ہے؟ اپنا نام سُن کر خلیفہ دروازے کے ذرا اور قریب کھسک آئے اور غور اور انہماک سے سُننے لگے۔ بیٹی کے جواب پر ماں ہنس پڑی۔ ارے پگلی تو کیسی باتیں کر رہی ہے۔ منادی تو میں نے بھی سُنی ہے لیکن کیا یہاں امیرالمومنین موجود ہیں؟ کیا دودھ میں پانی ملاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں؟ چھوڑ ان خیالات کو جو کہہ رہی ہوں وہ کہہ کر۔ بیٹی نے کہا۔ ماں! تو کیا کہہ رہی ہے یہاں نہ امیرالمومنین موجود ہیں نہ وہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن امیرالمومنین کا خدا تو موجود ہے۔ وہ تو علیم و بصیر ہے۔ وہ تو دیکھ رہا ہے۔ اسے ہم کیا جواب دیں گے۔ آخر ایک دن اُس کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ اصل جواب دہی تو اس کے سامنے کرنی ہے۔ ماں! یہ دل

تو تنگی ترشی سے گزر ہی جائیں گے۔ قبر کی رات اور حشر کا دن کیسے گزرے گا یہ تو سوچ۔ اپنی بات ختم کر کے بیٹی نے جو مڑ کر دیکھا تو ماں کے چہرے پر آنسوؤں کے تارے جھلملا رہے تھے۔ صداقت نے خود کو منوا لیا تھا۔ دوپہر کو جو شیر فروش بازار سے لوٹا تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ بیوی نے پوچھا کہ آج کیا بات ہے جو اتنے خوش نظر آ رہے ہو۔ جواب دیا کہ پگلی! گھر میں بیٹھی ہے اُٹھ اور تیاری کر محلے والوں کو خبر دے۔ آج شام تیری بیٹی خلیفہ کی بہو بنے گی۔ فاروق اعظم کے بیٹے عاصم کی بیوی۔ بیٹی نے یہ سُنا تو شرما کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ قدرت نے اسے خوفِ خدا کا انعام دیا تھا۔ آگے چل کر اسی شیر فروش کی بیٹی کی شاخ پر عمر بن عبدالعزیز جیسا گل سر سبز پھوٹا۔

الحبّ للہ والبغض للہ

اسلام قبول کرنے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر گوشے ہر عمل اور ہر حرکت و سکون کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضیات کے تابع کر دے۔ اور زندگی کے تمام معاملات میں صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کو ملحوظ رکھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک تم اپنی خواہشات کو اس وحی کے تابع نہ کر دو جسے لے کر میں آیا ہوں۔ محبت کرو تو اللہ کے لیے اور عداوت کرو تو اللہ کے لیے۔ اہل و عیال کی محبت، دوست اور احباب کی محبت، مال و اسباب کی محبت اور کھیت اور باغات کی محبت ہرگز ہرگز اللہ اور رسول کی محبت پر غالب نہ آنے پائے۔ ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دکھلایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر رہے ہیں۔ ابراہیم جانتے تھے کہ نبی کا خواب وحی ہوتا ہے۔ ایک لمحے کا تذبذب

نہ ہؤا۔ شک کا کوئی کانٹا ان کے دل میں نہ چبھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کے حلقوم پر چھری چلادی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے سے محبت نہیں تھی۔ امام حسینؓ سے مطالبہ کیا گیا کہ اپنے جوان رعنا علی اکبر کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرکے قتل گاہ میں جام شہادت نوش کرنے کے لیے بھیج دیں۔ حسینؓ نے کسی اضطراب کا مظاہرہ نہیں کیا اور دربارِ الوہیت میں اپنے عشق کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ بیٹا عزیز نہ تھا۔ بلکہ اس لیے کہ لَا اِلٰہ کے اقرار نے غیر اللہ کے ہر خس و خاشاک کو خاکستر کر دیا تھا۔ اور خالق و مالک حقیقی کی محبت تمام فطری محبتوں پر غالب آ چکی تھی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر صدیق اکبرؓ اور ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن ابی بکر بالمقابل آ گئے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک دن حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے اپنے والد ماجد سے کہا کہ آباجان! بدر کے معرکے میں جبکہ میں کفار کے لشکر میں تھا اور آپ مسلمانوں کے۔ آپ ایک مرتبہ بالکل میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے۔ اگر چاہتا تو آپ کا کام تمام کر دیتا لیکن اس خیال سے کہ آپ میرے باپ ہیں۔ میں نے ہاتھ روک لیا۔ صدیق اکبر جس کا سینۂ بے کینہ اللہ و رسول کی محبت کا خزینہ تھا۔ جس نے غزوۂ تبوک کے موقع پر گھر کا سارا سامان لا کر قدم نبوت پر ڈھیر کر دیا۔ اور جب نبی ﷺ نے دریافت کیا کہ ابوبکر! اہل و عیال کے لیے گھر میں کیا چھوڑا ہے تو سر جھکا کر جواب دیا کہ۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

تلملا اٹھا۔ اور کہا۔ عبدالرحمٰن! تو نے تو مجھے باپ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں ابوبکر کی جان ہے اگر تو بدر کے میدان میں میری تلوار کی زد میں آتا تو میں تجھے دو ٹکڑے کر دیتا۔ اس لیے کہ تو کفر کی پشت پناہی کے لیے آیا تھا۔ جسے غیرت صدیقی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اللہ و رسول کی

اسی محبت و متابعت نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ساری اُمت پر لازوال فضیلت بخش دی ہے۔ حضرت سیدنا مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے مکتوبات شریف میں لکھا ہے کہ اُمت کا بڑے سے بڑا ولی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے صحابی کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔ ابوداؤد شریف میں ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت کیا کہ جانتے ہو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ کونسا عمل محبوب ہے؟ کسی نے کہا نماز کسی نے کہا زکواۃ ایک شخص نے کہا جہاد فی سبیل اللہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرنا اور اللہ ہی کے لیے عداوت کرنا ہے۔

قناعت کی حقیقت

یہ دنیا امتحان کی جگہ اور آزمائش کا مقام ہے۔ یہ جزا و سزا کی جگہ نہیں۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل، نور و ظلمت اور ہدایت و ضلالت کے درمیان تمیز کرنے اور راہ صواب اختیار کرنے کی صلاحیت ودیعت کر کے اسے اس کارگہ ہستی میں چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ یہ دیکھے کہ اس کا کونسا بندہ اللہ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کو راہ ہدایت کی تلاش میں استعمال کرتا ہے اور کون ہے جو نفس و شیطان کی غلامی اختیار کر کے خود کو ہمیشہ کے عذاب کا سزاوار بناتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ وعدہ بھی فرما دیا ہے کہ جو لوگ ہماری ہدایت کی پیروی کریں گے انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ حزن۔ ارادہ تم کرو راہ ہم دکھائیں گے۔ اور جب راہ دکھانے پر آتے ہیں تو صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ تم منزل کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہو اور منزل تمہارے سامنے ہوتی ہے۔ اللہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ انسان کا اپنا نفس ہے۔ اپنی لامتناہی خواہشات۔ تمنائیں اور حسین آرزوئیں ہیں۔ یہ تمنائیں

یہ خواہشات اور یہ دل آویز آرزوئیں جال ہیں جن میں پھنس کر انسان اپنی راہ کھوٹی کر دیتا ہے اور پھر ان کی کوئی حد و انتہا بھی تو نہیں ہے۔ ایک آرزو پوری ہوتی ہے تو فوراً ہی دوسری آرزو مچلنے لگتی ہے۔ اس کو پورا کرو تو تیسری پھر چوتھی غرض کہ آرزؤں اور تمناؤں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ جو آخر کار قبر کے دہانے تک انسان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ کم سے کم آرزو کی جائے اور مالک کی طرف سے جو مل جائے اس کا شکریہ ادا کرکے اس پر قناعت کی جائے۔ قناعت ترک عمل کا نام نہیں۔ ہاتھ پیر توڑ کر گھر میں بیٹھ رہنے کا نام نہیں بلکہ قناعت تو اس کا نام ہے کہ جو چیز انسان کے ہاتھ میں ہو اس سے زیادہ اس چیز پر بھروسہ کیا جائے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو پتھر کی تہوں اور سمندر کی گہرائیوں میں پرورش پانے والے ایک حقیر سے کیڑے کی ضروریات سے غافل نہیں۔ بھلا اس انسان کو کیسے فراموش کر سکتا ہے۔ جس کے سر پر ایک مرتبہ وہ خلافت الٰہیہ کا تاج رکھ کر اسے مسجود ملائک بنا چکا ہے مگر کوئی اسے پکارے تو

در کریم سے بندے کو کیا نہیں ملتا

عہد اور ایفائے عہد

ہر عبادت کی کوئی نہ کوئی روح ہوتی ہے۔ اُسے اس عبادت کی حقیقت کہتے ہیں۔ حج کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کامل طور پر اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بانیٔ دین حنیف حضرت ابراہیم السلام نے اپنی ذات کو پورے طور پر اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان بنا لیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ہر تعلق ہر رشتے ناتے اور ہر وابستگی سے رُخ موڑ کر صرف ذات باری تبارک و تعالیٰ کو مرکز توجہ بنا لیا۔ اور اس کے ساتھ جو پیمانِ وفا باندھا اسے ساری زندگی نبھایا۔ آفتیں آئیں۔ مشکلات میں

متبلا ہوئے۔ یگانے بیگانے بن گئے۔ ماں باپ دشمن ہو گئے۔ اہلِ قبیلہ نے منہ موڑ لیا۔ اپنے ہم وطن جان کے دشمن بن گئے۔ مگر ابراہیم کے پائے استقلال میں معمولی سی لرزش آئی نہ لغزش۔ ابراہیم کوہ گراں کی طرح اپنے مقصد پہ ڈٹے رہے۔ یہاں تک کہ حکومت وقت اور اہلِ وطن نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا۔ نیچے آگ تھی اُوپر ابراہیم کہ جبریل علیہ السلام نے سوال کیا ابراہیم! آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے مڑ کر دیکھا اور جناب جبریل کو پہچان گئے فرمایا مدد کی ضرورت ہے لیکن تمہاری مدد کی نہیں بلکہ رب تبارک و تعالیٰ کی مدد کی ضرورت ہے۔ جبریل نے کہا تو پھر اللہ سے مدد طلب کریں جواب دیا کہ اسے علم ہے کہ میں کس حال میں ہوں مدد کرنا چاہے گا تو کرے گا اگر مدد نہیں کرے گا تو اس کا بندہ ہوں اس کے نام پر جل مروں گا۔ اس وقت جبریل علیہ السلام کو وحی کی گئی کہ میرے اور میرے خلیل کے درمیان سے ہٹ جاؤ اور آگ کو حکم دیا گیا کہ ابراہیم کے لیے گلزار اور سامان راحت بن جائے۔ حج کی ساری حقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی اسوۂ اور نمونۂ عمل میں پوشیدہ ہے۔ کہ تمام سہاروں اور آسروں کا انکار کر کے صرف ذاتِ واحد جل جلالہ کو اپنا مرکز مراد اور قبلۂ توجہ قرار دیا جائے اور بندہ صرف اسی کے لیے جئے اور اسی کے لیے مرے۔ حاجی لبیک کہتے وقت اسی عہد کی تجدید کرتا ہے۔ اور پھر ساری زندگی اسے اسی عہد کو نباہنا پڑتا ہے۔ عہد باندھنا تو آسان ہے اسے نباہنا بڑے دل گُردے والوں کا کام ہے۔ لہذا عہد باندھتے وقت اللہ تعالیٰ سے ایفائے عہد کی توفیق بھی مانگنی چاہیئے۔

فیاضی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ تو آزاد کردہ غلام تھا۔ مہذب،

متدین اور تربیت یافتہ کاروباری سلسلے میں عراق آیا تھا۔ کام مکمل ہونے کے بعد جب واپسی کا وقت آیا تو سوچا کہ اپنے سابق آقا کے لیے کوئی تحفہ ضرور لے جانا چاہیئے۔ آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دینا نہایت پسندیدہ فعل ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو کہ اس سے محبت بڑھتی ہے۔ اور رشتۂ مودّت استوار ہوتا ہے۔ آپ کے اسی حکم کی بناء پر صحابۂ کرام کے درمیان ایک دوسرے کو تحفہ دینے کا بہت رواج تھا۔ چنانچہ آزاد کردہ غلام نے بھی تحفہ خرید لیا۔ مدینہ منورہ آیا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دوران گفتگو عرض کیا۔ حضور! میں آپ کے لیے ایک نہایئت عمدہ اور قیمتی تحفہ عراق سے لایا ہوں یہ کہا اور ایک ڈبہ پیش کر دیا حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے دریافت فرمایا اس ڈبے میں کیا ہے۔ غلام نے کہا عراق میں میری ملاقات ایک نہایئت لائق اور ماہر طبیب سے ہوئی تھی۔ اس نے ایک معجون بنا کر مجھے دی ہے۔ اس معجون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ چاہے آپ جتنا بھی کھانا کھالیں تھوڑی سی معجون استعمال فرمالیں کھانا ہاضم ہو جائے گا۔ غلام کی بات سُن کر جناب ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سُست ہو گئے۔ اور فرمایا "بندۂ خدا! چالیس سال ہو گئے میں نے آج تک پیٹ بھر کر کھانا تو کھایا نہیں مجھے ہاضمے کی معجون کی بھلا کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ اصحاب صفہ میں تھے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی بذاتِ خود تربیت فرمائی تھی۔ رات میں کھانے بیٹھتے تو کبھی تنہا کھانا نہیں کھاتے۔ پاس پڑوس کے ایک ایک مسکین کو بلا کر دسترخوان پر بٹھاتے اور اسے شریکِ طعام کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ خود کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوتا۔ گھر والوں نے کوشش کی کہ کسی طرح ان کو اس طریقے سے باز رکھیں تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں کھانا ہی نہ کھاؤں اور رات میں بھوکے سو رہے۔

اخلاص فی العمل

محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا اسلامی لشکر کے سپہ سالار مسلمہ بن عبدالملک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر قلعہ پر قبضہ کس طرح کیا جائے۔ موسم بھی ناموافق تھا اور اندیشہ تھا کہ اگر محاصرہ اور زیادہ طویل ہو گیا تو اسلامی لشکر پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا۔ اتفاق سے ایک دن قلعہ کی دیوار کا جائزہ لیتے لیتے مسلمہ کی نگاہ قلعہ کی دیوار کے ایک شگاف پر پڑی۔ بجلی کی طرح تیزی سے ایک ترکیب مسلمہ کے ذہن میں آئی۔ اگر کوئی سپاہی اس شگاف کے راستے قلعہ میں داخل ہو کر دروازہ کھول دے تو لشکر بہ آسانی قلعہ پر قبضہ کر سکتا ہے۔ سپہ سالار نے کئی سپاہیوں سے کہا کہ تم اس دراز کے راستے قلعہ میں داخل ہو جاؤ۔ انہوں نے انتھک کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ علامہ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں لکھا ہے کہ ایک چھریرے بدن کا غیر معروف سپاہی آیا اور قلعہ میں گھس گیا۔ رات کا وقت تھا۔ پہریدار محو خواب تھے۔ سپاہی نے دروازہ کھول دیا اور نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ لشکر پروگرام کے مطابق دروازے پہ تیار ہی کھڑا تھا۔ فوراً قلعہ میں داخل ہو گیا اور قبضہ کر لیا۔ سپہ سالار سپاہی کی اس کارگزاری پر بے حد خوش ہوا۔ مگر وہ اس سپاہی کو پہچانتا تھا۔ نہ اس کے نام سے واقف تھا۔ اس نے اس سپاہی کو انعام و اکرام سے نوازنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر سپاہی اپنا کام مکمل کرنے کے بعد خاموش تھا۔ مسلمہ بن عبدالملک کے حکم سے جب لشکر میں بار بار اعلان ہو چکا کہ جو سپاہی قلعہ کی دیوار کے راستے داخل ہوا تھا وہ سپہ سالار مسلمہ بن عبدالملک سے ملاقات کرے تو ایک شخص سپہ سالار کے خیمہ کے دروازے پر آیا اور دربان سے کہا کہ میں سپہ سالار سے ملنا چاہتا ہوں۔ دربان نے اس غیر معروف سپاہی کو سپہ سالار کے سامنے پیش کر دیا۔ سپاہی نے مسلمہ سے کہا اگر آپ تین باتوں کا وعدہ کریں تو میں آپ کو بتا دوں کہ قلعہ میں داخل ہونے

والا شخص کون تھا۔ ایک تو یہ کہ آپ اس سپاہی کے نام سے خلیفہ کو آگاہ نہیں کریں گے۔ دوسرے یہ کہ آپ اسے کوئی انعام نہیں دیں گے اور تیسرے یہ کہ آپ یہ دریافت نہیں کریں گے کہ وہ کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ سپہ سالار نے جب وعدہ کر لیا تو سپاہی نے کہا کہ وہ میں ہوں۔ میں اپنی اس خدمت کا اجر آخرت میں لینا چاہتا ہوں۔ اس واقعہ کے بعد سپہ سالار مسلمہ کی عادت ہو گئی کہ ہر نماز کے بعد دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد میرا حشر و نشر اسی سپاہی کے ساتھ کرنا یہ اس لیے کہ جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے۔

ایک حبشی غلام کی کمال سخاوت

سخاوت میں آل جعفر کی مثال کم ملتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن جعفر کی سخاوت تو ضرب المثل تھی۔ کہ سائل کو کبھی بھی اپنے دروازے سے خالی ہاتھ واپس نہ کیا۔ اگر کسی نے معمولی سا سلوک کیا تو جناب عبداللہ نے اسے اتنا دیا اتنا دیا کہ مالا مال ہو گیا۔ آپ کی سخاوت کو دیکھ کر بعض لوگ اسے ناعاقبت اندیشی بھی قرار دیتے مگر آپ پر اس کا بالکل اثر نہ پڑتا۔ اور بحر سخاوت متلاطم رہتا۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن جعفر ایک جنگل میں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں آپ کا گزر ایک باغ سے ہوا۔ دیکھا کہ ایک حبشی غلام وہاں کام کر رہا ہے۔ دھوپ سخت تھی۔ حضرت عبداللہ بن جعفر ذرا آرام کرنے کے لیے ایک درخت کے سایہ میں ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ غلام کی روٹی آئی اور اسی وقت ایک کتا بھی باغ میں چلا آیا اور غلام کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ غلام نے ایک روٹی نکالی اور کتے کے آگے ڈال دی۔ کتے نے روٹی کھالی اور پھر غلام کا منہ تکنے لگا۔ غلام نے دوسری روٹی بھی اس کے آگے ڈال دی اور کتے نے اسے بھی چٹ کر لیا اور پھر غلام کے پاس کھڑا رہا۔ غلام نے تیسری اور آخری روٹی بھی نکالی اور کتے کے حوالے کر دی۔ کل تین روٹیاں تھیں

غلام نے تینوں روٹیاں کتے کو کھلا دیں۔ درخت کے سایہ میں لیٹے لیٹے حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ منظر دیکھتے اور متاثر ہوتے رہے۔ روٹیاں کھا کر کتا تو چلتا بنا۔ غلام اپنے کام میں لگ گیا۔ حضرت عبداللہ بن جعفر اُٹھ کر غلام کے پاس تشریف لائے اور اس سے دریافت فرمایا "روزانہ تمہارے لیے کتنی روٹیاں آتی ہیں؟" اس نے عرض کیا تین آپ نے دریافت فرمایا کہ پھر تینوں کا تم نے ایثار کر دیا۔ اب تم خود کیا کھاؤ گے؟ اس نے کہا حضور یہ جنگل ہے۔ یہاں کتے نہیں رہتے۔ یہ غریب بھوکا کتا کہیں دور سے مسافت طے کر کے یہاں آیا تھا۔ اس لیے مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ اسے ویسے ہی واپس کر دوں۔ حضرت عبداللہ نے دریافت فرمایا کہ اب آج تم کیا کھاؤ گے؟ غلام نے کہا: ایک دن فاقہ کر لوں گا یہ تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے دل میں سوچا کہ لوگ تو معمولی سی سخاوت پر میری ملامت کرتے ہیں۔ یہ غلام تو مجھ سے بھی زیادہ سخی نکلا۔ حضرت کو اس کی یہ ادا بے حد پسند آئی۔ فوراً شہر تشریف لے گئے۔ اور باغ کے مالک سے وہ باغ اور غلام خرید لیا اور واپس تشریف لا کر غلام سے فرمایا کہ آج کے دن سے تو آزاد ہے۔ اور یہ باغ بھی میں نے تجھے بخش دیا۔ یہ باغ لے لے اور زندگی کے بقیہ ایام خوشی و شادمانی کے ساتھ گزار۔

غلام نے انتہائی خودداری کے ساتھ جواب دیا جناب والا میں آپ کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس شکریے کے اظہار میں یہ باغ آپ کی خدمت میں بطور نذرانے کے پیش کرتا ہوں۔

اب چونکہ آپ کے دل میں مجھ سے عقیدت پیدا ہو گئی ہے اس لیے میرا آپ کے ساتھ رہنا میرے حق میں زہر قاتل ہے اس لیے اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں غلام نے یہ چند جملے دوہرائے اور روانہ ہو گیا۔ ایک حبشی غلام کی سخاوت و خودداری کو دیکھ کر سیدنا عبداللہ بن جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

انگشت بدنداں تھے۔

ایفائے عہد

قاتل نے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دربار میں قتل کا اقرار کر کے خود کو مستوجب سزا قرار دلوا دیا تھا۔ دو نو جوان اسے پکڑ کر دربار خلافت میں لائے تھے کہ اس نے ہمارے باپ کو قتل کیا ہے۔ قصاص دلوایا جائے۔ قاتل نے برسرِ عدالت اقرار کیا کہ اس سے یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ اس نے طیش میں آ کر ایک پتھر کھینچ مارا جس کی ضرب سے بوڑھا قتل ہو گیا۔ خلیفہ فاروق اعظم نے فرمایا کہ جب تو نے قتل کا اعتراف کر ہی لیا ہے پھر تو لازم ہے کہ اسلام کا قانون قصاص تیرے اوپر نافذ کیا جائے۔ جوان ! موت کے لیے تیار ہو جا ! جوان نے عرض کیا حضور ! میں امام کے حکم اور شریعت کے فیصلے پر سر تسلیم خم کرتا ہوں البتہ میری ایک درخواست ہے وہ یہ کہ میرا ایک چھوٹا نابالغ بھائی ہے۔ میرے والد مرحوم نے کچھ سونا چھوڑا تھا اور اُسے میری سپردگی میں دیا تھا۔ کہ جب میرا بھائی بالغ ہو تو اسے دینا میں نے اس سونے کو ایک جگہ دفن کر دیا ہے اور اس کا حال سوائے میرے کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اگر وہ سونا حقدار کو نہ ملا تو میں قیامت کے دن ذمہ دار ہوں گا۔ اس لیے مجھے اجازت عطا فرمائیں میں گھر جا کر اس سونے کا بندوبست کر کے واپس آ جاؤں۔ صرف تین دنوں کی مہلت چاہتا ہوں۔ مجھے ضمانت پر رہا فرما دیں۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تیری ضمانت کون لے گا؟ نوجوان نے ایک سرسری نگاہ مجمع پر ڈالی اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا " یہ میری ضمانت لے لیں گے "۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جناب ابوذر سے دریافت فرمایا کیا تم ضمانت کرتے ہو؟ حضرت ابوذر نے فرمایا۔ جی ہاں میں ضمانت لیتا ہوں کہ یہ تین دن بعد حاضر ہو جائے گا۔ نوجوان کو رہا کر دیا گیا۔

تین دن پلک جھپکتے گزر گئے۔ تیسرے دن کی شام آ گئی۔ نوجوان ابھی تک مدینہ پہنچا نہیں تھا۔ خلیفہ کی عدالت میں مدعیوں نے استغاثہ کیا۔ ہمارے باپ کے قتل کا قصاص دلوایا جائے۔ صحابہ کرام میں حضرت ابوذر کے بارے میں تشویش پیدا ہو چلی تھی۔ مدعیان بار بار حضرت ابُوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھتے۔ ہمارا مجرم کہاں ہے؟ ابوذر نے کمال استقلال و جرأت مندی کے ساتھ جواب دیا "کان کھول کر سُن لو! اگر تیسرے دن کا وقت مقررہ گزر گیا اور مجرم نہ آیا تو خدا کی قسم میں اپنی ضمانت پوری کروں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ فاروق اعظم نے بھی فرمایا کہ اگر نوجوان نہ آیا تو ابوذر کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کا شریعت مطالبہ کرے گی۔ خلیفہ ابھی گفتگو کر ہی رہے تھے کہ شور اٹھا۔ اور ناگہاں وہ مجرم نمودار ہوا۔ پسینے میں شرابور۔ دم پھول رہا تھا۔ خلیفہ کے سامنے حاضر ہوا۔ عرض کیا۔ ماں ماموں کو سپرد کر کے آ رہا ہوں۔ آپ شریعت کا فیصلہ میرے سر پر نافذ کریں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا امیر المومنین جب اس نوجوان نے مجھے اپنا ضامن ٹھہرایا تو میں اسے جانتا بھی نہ تھا لیکن میں نے خلاف مروّت سمجھا کہ اس کی درخواست رد کر دوں۔ بُشرے سے یہ عہد کا پکا نظر آ رہا تھا۔ اور ویسا ہی ثابت بھی ہوا۔ عہد کی پاسداری دیکھ کر صحابہ کرام میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ اور مقتول کے ورثا نے بر سرِ عدالت اعلان کیا کہ

"ہم نے اپنے باپ کا خون معاف کیا"

ہر طرف سے نعرۂ مسرت بلند ہوا۔ کہ نوجوان نے اسی کردار کا مظاہرہ کیا جو صحیح معنوں میں ایک مومن کا کردار ہونا چاہیئے۔

سچائی نجات دیتی ہے

حجاج بن یوسف ثقفی اگر خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا جانی دشمن تھا۔

تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں وہ تو ہر حق پرست حق گو اور کلمۂ حق بلند کرنے والے کا دشمن تھا۔ بڑے بڑے عابد و زاہد بڑے بڑے عالم و فاضل محدث و مفسر اس کی خون آشام تلوار کی بھینٹ چڑھ گئے۔ سعید بن جبیر جیسا مفسر و محدث اور جلیل القدر تابعی اس کی درندگی کا شکار ہوا اور انتہائی صبر و سکون کے ساتھ اس کے ہاتھوں اپنی جان جاں آفریں کو سپرد کی۔ آج نہ حجاج ہے نہ حجاج کا اقتدار مگر مظلوموں کے ناحق خون کا چراغ آج بھی لَو دے رہا ہے۔ اور انہی چراغوں کی جوت میں مہر و وفا والوں کا قافلہ جادہ پیما ہے اور جادہ پیما رہے گا۔ حق کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنا تو انبیاء و اولیاء کی سُنت ہے۔ جو ہر دور میں زندہ رہے گی۔ شکست و فتح کا فیصلہ مارنے یا مارے جانے سے نہیں کیا جاتا۔ فیصلہ تو اس سے کیا جاتا ہے کہ راہ حق میں قربانی پیش کرنے والا اہل باطل کے آگے سرنگوں ہوا کہ سر بلند رہا۔ ظلم سے بچنے کی خاطر حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت حبیب عجمی کی عبادت گاہ میں روپوش ہو گئے۔ مگر حجاج چاہتا تھا کہ جیسے بھی ہو حضرت خواجہ حسن بصری کا چراغ حیات گل کر دے۔ ڈھونڈتا ڈھونڈتا حبیب عجمی کے پاس آیا دریافت کیا تم جانتے ہو کہ اس وقت خواجہ حسن بصری کہاں ہیں؟ حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا ہاں! وہ اس وقت اندر میری عبادت گاہ میں ہیں۔ حجاج سپاہیوں سمیت عبادت گاہ میں گھس پڑا۔ لیکن حسن بصری کو نہ پا کر غصے میں واپس آ گیا۔ کہا! درویش! تو جھوٹا ہے۔ اندر حسن بصری تو نہیں ہیں۔ حبیب عجمی نے کہا میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے جھوٹ نے کہا وہ اندر ہی ہیں۔ حجاج دوبارہ عبادت گاہ میں داخل ہوا اور پھر ناکام واپس آیا اسی طرح تیسری مرتبہ بھی اندر جا کر ڈھونڈا لیکن خواجہ حسن بصری کہیں نظر نہ آئے ناچار ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔ اس کے بعد خواجہ حسن بصری عبادت گاہ سے باہر آئے۔ اور فرمایا حبیب! میں نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے تیری برکت سے مجھے گرفتار ہونے

سے بچا لیا۔ حبیب نے جواب دیا نہیں میری برکت سے نہیں بلکہ میرے سچ بولنے کی برکت تھی۔ اگر میں جھوٹ بولے ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو رسوا کر دیتا۔

قرض کی معافی

مقروض کو وہ وقت معلوم تھا جبکہ حضرت ابو قتادہ اپنی رقم کا تقاضا کرنے آتے تھے۔ ہاتھ خالی تھے۔ بیچارہ بہت شرمندہ اور پریشان تھا۔ اس لیے ٹھیک اسی وقت اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ حضرت ابو قتادہ آتے مقروض کے لڑکوں سے دریافت کرتے اور جب پتہ چلتا کہ وہ گھر میں موجود نہیں ہے تو واپس ہو جاتے اتفاق سے ایک دن ناوقت چلے آئے۔ مقروض بیچارہ گھر میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ حضرت ابو قتادہ نے اس کے بچے سے دریافت کیا کہ تمہارے والد صاحب کہاں ہیں؟ بچے نے بتلایا کہ گھر میں ہیں اور کھانا کھا رہے ہیں۔ حضرت ابو قتادہ نے بچے سے کہا کہ جب تمہارے والد کھانے سے فارغ ہو جائیں تو انہیں اطلاع دے دینا کہ ابو قتادہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ باپ جب کھانے سے فارغ ہوا اور بچے نے اسے ابو قتادہ کے بارے میں بتلایا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ پیر کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی۔ پاس میں ایک پیسہ نہیں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ لیکن کرتا تو کیا کرتا۔ شرماتا لجاتا باہر نکلا۔ اس نے سوچا تھا کہ ابو قتادہ مجھے دیکھتے ہی برس پڑیں گے۔ مگر یہاں تو عالم ہی دوسرا تھا۔ ابو قتادہ کوئی معمولی آدمی تو نہیں تھے۔ نبوت نے ابو قتادہ کی تربیت کی تھی۔ قرآن کریم رگ و ریشے میں پیوست تھا۔ قرآن نے اپنے ماننے والوں کو ہدائیت کی ہے کہ "اگر مقروض تنگدست ہو تو اسے اس وقت تک مہلت دو کہ وہ فراخ دست ہو جائے۔"

حضرت ابو قتادہ نے پوچھا کہ "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم مجھ سے کیوں چھپتے پھرتے تھے؟" قرض دار نے بتلایا کہ حضرت! بات یہ ہے کہ میں آج کل سخت تنگدست

ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ حسب وعدہ قرض کی رقم ادا نہ کر سکا۔ مقروض نگاہیں جھکائے اپنی بات کہتا رہا۔ بات ختم کرنے کے بعد اس نے نظر اٹھائی تو کیا دیکھا کہ ابوقتادہ کی آنکھیں۔ بہہ رہی ہیں۔ مسند امام احمد بن حنبل میں ہے یہ حالت دیکھ کر مقروض پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ابوقتادہ نے کہا "میرے بھائی! ممکن ہے کہ میرے تقاضے سے تمہیں تکلیف پہنچی ہو۔ مجھے معاف کرنا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے قرض دار کو مہلت دیتا ہے یا قرض معاف کر دیتا ہے وہ قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہو گا۔ "میرے بھائی میں نے اپنا قرض معاف کیا۔ شاید میدان حشر میں جس دن کسی کو سایہ میسر نہ ہو گا اللہ جل جلالہ کے عرش کا سایہ میسر آجائے۔

اصلاح کا صحیح طریقہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادہ گرامی حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ وعظ کہہ رہے تھے کہ ایک ایسا شخص مجلس وعظ میں آکر بیٹھ گیا جس کے پائینچے ٹخنوں سے نیچے تھے۔ پائینچوں کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے سے حضور ﷺ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ مگر اس وقت شاہ صاحب نے کچھ نہیں کہا اور وعظ جاری رہا۔ وعظ ختم ہونے کے بعد جب لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے تو حضرت شاہ صاحب نے اس آدمی سے فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جائیے تنہائی میں مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ وہ شخص ٹھہر گیا تو آپ نے خلوت میں اس سے فرمایا کہ بھائی میرے اندر ایک عیب ہے۔ وہ یہ کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ڈھلک جاتا ہے۔ بڑی کوشش اور احتیاط کرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو پھر بھی ہو ہی جاتا ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص فخریہ اپنی لنگی کو ٹخنے کے نیچے لٹکاتا ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔ یہ کہہ کر شاہ صاحب

رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور اپنے پائنچے اسے دکھانے لگے اور فرمایا کہ ذرا غور سے دیکھنا میرے پائنچے واقعتہً ڈھلکے ہوئے ہیں یا مجھے خوامخواہ کا وہم ہو گیا ہے۔ تیر نشانے پر بیٹھ چکا تھا۔ اس شخص نے حضرت کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا کہ حضرت! آپ کے اندر یہ عیب کیوں ہوتا البتہ یہ عیب میرے اندر ہے مگر اس انداز میں آج تک کسی نے مجھے سمجھایا نہیں تھا۔ اب میں تائب ہوتا ہوں آئندہ انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ غلط کار یا خطاکار کو ذلیل کرنا یا اس کا مذاق اڑانا اصول نصیحت و اصلاح کے خلاف ہے۔ تشدد یا تحقیر سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ انسان میں ضد اور تعصب پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت قبول حق کی صلاحیتیں چھن جاتی ہیں۔ اور تاریکی انسان کے دل کو گھیر لیتی ہے اسی لیے قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ لوگوں کو بلایا کرو۔

باب پنجم

خُلفاء وسَلاطین

ابوبکر صدیقؓ/سیّد القوم خادمہم

ادھر دو تین دنوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پریشان بھی تھے اور متعجب بھی پریشانی اس بات کی کہ ثواب کمانے اور بارگاہ خداوندی میں مقبولیت حاصل کرنے کا ایک اچھا خاصا ذریعہ پیدا ہو گیا تھا وہ ہاتھ سے نکل گیا اور تعجب اس پر کہ آخر وہ آدمی ہے کون جو اتنے سویرے آ کر اندھی بڑھیا کے گھر میں صفائی کر دیتا ہے۔ مشکیزے میں پانی بھر کر پیالہ سمیت بڑھیا کے قریب رکھ دیتا ہے۔ اس کے بستر کو بھی درست کر دیتا ہے۔ یہ معذور بڑھیا مدینہ کے نواحی علاقے میں رہتی تھی۔ اس کی کوئی اولاد تھی نہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا۔ آنکھوں سے محرومی اس کے مقدر کی محرومی بن چکا تھا، کوئی ذریعۂ معاش بھی نہ تھا۔ ایسی معذور و مجبور بڑھیا کسی دوسرے معاشرے میں ہوتی تو شاید ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتی۔ مگر مدینے کا معاشرہ ختمی مرتبت ﷺ کا تربیت یافتہ معاشرہ تھا جس میں ایمان کی یہ علامت سمجھی جاتی تھی کہ معاشرے کا کوئی بھی فرد اس حال میں رات بسر نہ کرے کہ وہ شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ اس معاشرے کے ہر فرد کو یہ سبق دیا گیا تھا کہ جو دولت تمہارے پاس ہے یہ ربِّ ذوالجلال کی امانت ہے اور اس نے تمہارے کمائے ہوئے مال میں ان لوگوں کا حصّہ رکھ دیا ہے جو کسی عُذر کے باعث حصولِ معاش کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہر مومن کو یہ حق ادا کرنا ہوگا ورنہ اس کی کوئی عبادت بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں۔ ان تعلیمات کا اثر یہ تھا کہ ہر فرد دن بھر اس فکر میں سرگرداں رہتا کہ کوئی محروم شخص ملے اور وہ اس کی خدمت کر کے دارین کی سُرخروئی حاصل کرے۔ کیسے پاکیزہ تھے وہ قدسی نفوس اور کیسا پُرسکون و مطمئن رہا ہوگا وہ معاشرہ جس کے نہ اونچے اُونچے محلات تھے نہ دولت کی نمود و نمائش۔ مدینے کے ایک گوشے میں بیٹھے یہ گلیم پوش قوموں کی تقدیریں رقم کر رہے تھے اور آنے والی نسل کے لئے ایسا ضابطۂ حیات تیار کر رہے تھے جو صحیح معنوں میں دُکھی انسانیت کے تمام دُکھوں کا علاج تھا۔ چنانچہ سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ نواحِ مدینہ میں ایک غریب و معذور بڑھیا مدد کی محتاج ہے تو انہوں نے اپنا یہ معمول

بنا لیا تھا کہ روزانہ علی الصباح بڑھیا کے گھر جاتے، اُسے کھانا پہنچاتے، مکان کی صفائی کر دیتے مشکیزے میں پانی بھر کر اس کے پاس رکھ دیتے۔ مگر اب انہیں پریشانی تھی، اس لئے کہ کوئی ایسا اللہ کا بندہ بھی تھا جو اُن سے پہلے پہنچ کر بڑھیا کی یہ خدمت انجام دے دیا کرتا اور جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ پہنچتے تو میدان صاف ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے سوچا کہ اس کا کھوج لگانا چاہیئے کہ ایسا کون شخص ہے جو اس فرض کی ادائیگی میں ان پر سبقت لے جایا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دن وہ کچھ رات رہتے ہی بڑھیا کے جھونپڑے پر پہنچ گئے، دیکھا کہ خلیفۂ اوّل، افضل البشر بعد الانبیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ اس ضعیفہ کی خدمت گزاری سے فارغ ہو کر جھونپڑے سے باہر نکل رہے ہیں۔ فاروقِ اعظمؓ بولے خلیفۂ رسولؐ! کیا آپ ہی روزانہ سبقت کر جاتے ہیں اور میں پیچھے رہ جاتا ہوں ؟ اُمّتِ مُسلمہ کا یہ بے مثال حکمران سر جُھکائے خاموشی سے نکل گیا کہ اس خدمت سے مقصود فرض کی ادائیگی اور صرف باری تعالیٰ کی رضامندی تھا۔

عزّتِ اسلام

ایمان خود اتنی بڑی نعمت اور اتنا بڑا سامانِ عزّت و وقار ہے کہ اس کے مقابلے میں دُنیا کی ہر نعمت اور ہر عزّت ہیچ ہے۔ مومن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پرواہ نہیں کرتا، کِسی کے سامنے نہیں جُھکتا نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ وہ بحیثیت مسلمان کے اپنا پایہ ساری دُنیا سے بُلند تصوّر کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ عزّت اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور ان کے واسطے سے مومنین کے لئے ہے۔ اس خودداری اور عزّت کو قائم رکھنا دراصل اسلام کی عزّت کو قائم رکھنے کے مترادف ہے جو مسلمان اپنی اس خودداری کو برقرار نہیں رکھتا وہ سچ پوچھیے تو بالواسطہ دینِ اسلام کی حرمت کو نقصان پہنچانے کے جُرم کا مرتکب ہے۔ اسلامی خودداری کا مطلب ظاہری شان و شوکت، تزک و احتشام، تصنّع و تکلّف اور بناوٹ نہیں ہے بلکہ اس کی مراد تواضع، خاکساری اور سادگی کے ساتھ خود اسلام و ایمان کے وقار کو بحال رکھنا ہے۔ ممکن ہے کہ

ایک مسلمان غریب و مفلس ہو ممکن ہے کہ اس کا لباس پیوند زدہ ہو۔ اس کے ظاہر سے شان و شوکت کا اظہار نہ ہو رہا ہو اس کے باوجود بے نیاز ہو۔ باطل کے مقابلے میں کسی سے نہ دبنے والا ہو اور نہ ڈرنے والا۔ اسی کا نام ہے شوکتِ اسلام اور وقارِ ایمان۔ فتح بیتُ المقدس کے موقع پر حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جب رومیوں سے شہر کی کنجی لینے کے لئے تشریف لے گئے اور شہر کے قریب پہنچے تو اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، چند مسلمانوں کے ہمراہ سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے استقبال کے لئے نکلے۔

جب یہ جماعت ایک ایسے مقام پر پہنچی جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اونٹنی سے اتر پڑے۔ پاؤں سے چرمی موزے نکال کر کاندھے پر ڈال لئے۔ اونٹنی کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے اور اس شان سے شہر کی فصیل کے قریب پہنچنے لگے تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا۔ عرض کی حضرت! آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کا پیراہن پیوند زدہ ہے۔ موزے آپ کاندھوں پر ڈالے ہوئے ہیں۔ اونٹنی کی نکیل تھام کر آپ چل رہے ہیں۔ سارا شہر اُمڈا ہوا ہے۔ ہزارہا لوگ آپ کو دیکھیں گے۔ خلیفۃ المسلمین کو اس حلیہ میں دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔ اس طرح تو ہماری بڑی بھد ہوگی اور مذاق اُڑے گا۔ خُدا کے لئے آپ ذرا اچھا لباس پہن لیں۔ شان سے سواری پر بیٹھیں، تب شہر کی فصیل کے قریب تشریف لے چلیں۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے چہرے پر جلال چھا گیا اور غصّہ میں فرمایا ابو عبیدہ! اگر تمہارے بوڑھے ہونے اور صحابیت کا خیال نہ ہوتا اور تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو میں اسے اس بات پر ایسی سزا دیتا کہ ساری اُمّت کے لئے سامانِ عبرت ہوتی۔ ابو عبیدہ! ہم سب ذلیل لوگ تھے۔ دُنیا کی کوئی قوم ہمیں مُنہ لگانے کو تیار نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام اور محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عزّت دی۔ یاد رکھو کہ جو عزّت ہمیں خُدا نے دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز یعنی لباس اور سواری کے ذریعہ اگر ہم عزّت چاہیں گے تو خُدا ہمیں ذلیل کر دے گا اور یہ عزت جو ہمیں ملی ہے چھن جائے گی۔

حضرت عمر فاروقؓ اور ہرمزان

شروع شروع میں تو شہنشاہِ ایران مسلمانوں کو بہت کمزور، جنگی مہارت کے لحاظ سے کمتر اور ناتجربہ کار سمجھ رہا تھا لیکن جب دو چار اچھی خاصی جھڑپیں اور معرکے ہوئے تو وہ چوکنا ہو گیا۔ تاہم طاقت کا غرور اور اقتدار کا نشہ اس کے سر پر بدستور سوار تھا۔ اس نے سوچا کہ کسی ایسے سپہ سالار کو سرحدی علاقے میں متعین کیا جائے جس کی دھاک علاقے پر بیٹھی ہوئی ہو کہ اس کا نام ہی سن کر مسلمان حوصلہ کھو بیٹھیں، چنانچہ اس نے ہرمزان کو طلب کیا جو ایرانی افواج کا نامور سپہ سالار تھا اور اسے اہواز اور فارس کے دو صوبوں کا گورنر مقرر کر کے مسلمانوں کے مقابلے میں بھیجا۔ جنگ ہوئی اور نہایت خوفناک جنگ ہوئی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور آخر کار ایرانیوں کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ ہرمزان جیسا سپہ سالار ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا مگر اس نے شرط یہ عائد کی کہ اسے صحیح وسلامت مدینہ منورہ پہنچا دیا جائے۔ خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے حق میں جو فیصلہ فرمائیں گے اسے منظور ہوگا۔ باہمی مشورے کے بعد مسلمانوں نے اس کی اس شرط کو منظور کر لیا اور ہرمزان بڑی شان وشوکت سے روانہ ہوا۔ بڑے بڑے ایرانی رئیس اس کے ہمراہ تھے۔ اس کی شان وشوکت سے قطعاً یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ شکست خوردہ لشکر کا سپہ سالار ہے۔ اس دور میں ایران اپنے تمدنی ارتقاء کی معراج پر پہنچ چکا تھا۔ عام رؤساء اور امراء سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتے اور ان کے محلوں میں روزانہ عیش ونشاط کی محفلیں سجائی جاتیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ اس دور میں اگر کسی رئیس کی کمر کا پٹکا ایک لاکھ روپے سے کم کا ہوتا تو اس سے دیگر رؤساء بات کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ مگر ایران کے غریب عوام کا برا حال تھا۔ ان کی حالت ان بیلوں کی سی تھی جو دن رات ان رئیسوں کی خواہشات کے جہنم کو بھرنے میں مصروف رہتے۔ غلاموں کا کوئی والی وموالی تھا نہ عورتوں کا۔ جابرانہ استبداد کی چکی میں عوام پس رہے تھے۔ ہرمزان بھی اسی تعیش پسند معاشرے کا پروردہ تھا۔ اس کی آنکھوں نے

حقیقی انسانی ہمدردی اور اخوت و محبت کی کبھی جھلک بھی نہ دیکھی تھی۔ ایرانی سرداروں کے جلو میں جب وہ شہر مدینہ کے قریب پہنچا تو ٹھہر گیا، غسل کیا، سر پر تاج مرصّع رکھا۔ دیبا کی قبا زیب تن کی۔ کمر سے مرصّع تلوار لگائی اور شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ مدینہ طیبہ میں داخل ہوا۔ وہ اور اس کے سردار حیران تھے کہ مدینہ میں ایران کی طرح نہ تو اونچے اونچے محلّات تھے نہ سامانِ زیب و زینت۔ زیادہ تر مکانات چھپّر پوش۔ لوگ بھی جو نظر آتے سیدھے سادے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مسجدِ نبویؐ کے قریب پہنچ کر دریافت کیا کہ امیر المومنین کہاں ملیں گے؟ ایرانیوں کا خیال تھا کہ جس شخص کے دبدبے نے ساری دُنیا میں غلغلہ ڈال رکھا ہے اس کا دربار بھی بڑی شان و شوکت کا ہوگا۔ طرح طرح کے ساز و سامان سے مرصّع ہوگا۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں ـــــ ایک بدّو نے اشارہ سے بتلایا کہ وہ ہیں ہمارے امیر المومنین۔ ہرمزان نے جب نظریں اس طرف دوڑائیں تو ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے یا اس پر سکتہ طاری ہوگیا ہے۔ کیونکہ اس وقت فاتح عرب و عجم زینتِ منبر و محراب سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، صحن مسجد میں فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے تھے۔ زُلفیں گرد آلود، پیراہن پیوندزدہ اور قدموں تلے تاجِ کسریٰ و قیصر۔

حقِّ مظلومیّت

وہ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے۔ پیوند زدہ کپڑے، گرد آلود جسم۔ کہ ایک بڑھیا راستے میں مل گئی۔ دریافت فرمایا کہ "تیرا کیا حال ہے؟" بڑھیا نے کہا میرا حال کیا پوچھتے ہو؟ غربت و افلاس کے ساتھ دن کاٹ رہی ہوں۔ جب سے عمر خلیفہ ہوئے ہیں کوئی عطیہ درہم یا دینار کی شکل میں نہ ملا۔ بیوہ بیکس ہوں۔ گزران اوقات سخت دشوار ہے۔ خلیفہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: عمر کو تیرے حال کی کیا خبر؟ تُو تو اتنے دُور افتادہ مقام پر بیٹھی ہوئی ہے۔ تڑخ کر بڑھیا بولی سُبحان اللہ! وہ والی کیسا والی ہے جو لوگوں کا حاکم بن جائے اور اسے خبر نہ ہو کہ ملک کے مشرق و مغرب میں کیا ہو رہا ہے؟ خلیفہ رونے لگے۔ ہائے عمر! کل قیامت کے دن تیرے اوپر کتنے دعوے دار ہوں گے۔ فرمایا! ہاں میں

عُمر کو جہنّم سے بچانا چاہتا ہوں بتا کہ تو میرے ہاتھ اپنا حقِ مظلومیت کتنے میں فروخت کرے گی ؟ اس نے کہا مذاق نہ کرو۔ فرمایا نہیں میں سچ کہتا ہوں تجھے اپنا حقِ مظلومیت میرے ہاتھ فروخت کرنا ہوگا۔ آخر پچیس دینار پر فاروقِ اعظم رضؓ نے بُڑھیا سے حقِ مظلومیت خرید لیا۔ اتنے میں حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما تشریف لائے اور انہوں نے کہا السلام علیکم یا امیر المومنین! اب تو بُڑھیا کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سر پیٹنے لگی کہ میں نے تو امیر المومنین کے مُنہ پر انہیں بُرا بھلا کہہ دیا۔ اب کیا ہوگا ؟ سیدنا فاروقِ اعظم رضؓ نے اسے تسلی دی فرمایا ! ماں تو نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ خُدا تجھ پر رحم کرے۔

ایک کپڑے کے ٹکڑے پر لکھوایا کہ عمر رضؓ نے اس بڑھیا سے پچیس دینار کے عوض حقِ مظلومیت خریدا ہے اگر اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ حشر کے دن دعوے دار ہوگی تو عمر رضؓ اس سے بَری ہوں گے۔ اس دستاویز پر حضرت علی المرتضیٰ رضؓ اور حضرت ابنِ مسعود رضؓ سے گواہی لکھوائی اور دستاویز حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے حوالہ کیا کہ اگر میں آپ سے پہلے دُنیا سے گزر جاؤں تو یہ تحریر میرے کفن میں رکھ دینا تاکہ دُنیا سے جاتے وقت اپنی براءت کا سامان بھی ساتھ لیتا جاؤں کہ سفر درپیش ہے اور منزل بڑی ہی کٹھن۔

رزق میں احتیاط

عراق کی مہم کامیاب رہی اور کامیابی کے بعد لشکرِ اسلام بصرہ سے ہوتا ہوا دارالحکومت مدینہ منوّرہ لوٹ رہا تھا۔ اس لشکر میں حضرت فاروقِ اعظم امیر المومنین رضؓ کے صاحبزادگان حضرت عبداللہ بن عمر اور عبیداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی شامل تھے۔ لشکرِ اسلام نے چند دنوں تک بصرہ میں قیام بھی کیا۔ اس وقت بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ تھے۔ انہوں نے نہایت ادب و احترام سے لشکرِ اسلام کا استقبال کیا، بالخصوص خلیفہ کے صاحبزادگان کا۔ روانگی کے وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ نے صاحبزادگان سے کہا کہ میرے پاس صدقے کا مال ہے اور اسے مدینہ منوّرہ بھیجنا ہے۔ میری ایک تجویز ہے اگر آپ حضرات اس پر عمل کرلیں تو مال مدینہ منوّرہ پہنچ بھی جائے گا

اور آپ لوگوں کو بھی کچھ مالی فائدہ ہو جائے گا اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس مال سے آپ سامان تجارت خرید لیں اور اسے مدینہ منورہ لے جا کر فروخت کر دیں، اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں اور نفع کی رقم خود لے لیں۔ حضرت عبداللہ اور حضرت عبیداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے غور کیا تو انہیں اس میں کوئی شرعی قباحت نظر نہ آئی اور اس تجویز کو منظور کر کے اس صدقے کے مال سے انہوں نے سامان تجارت خرید کر لیا اور مدینے میں اسے فروخت کرنے کے بعد اصل اور نفع دونوں لے کر دربار خلافت میں حاضر ہوئے اور ساری سرگزشت سُنا دی۔ یہ بات سُن کر خلیفہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ دریافت کیا کیا بصرہ کے گورنر نے اس طرح کا مال دوسرے لشکریوں کو بھی دیا تھا؟ صاحبزادگان نے نفی میں جواب دیا۔ تب حضرت فاروق اعظم نے فرمایا تمہارے ساتھ یہ خصوصی برتاؤ صرف اس لئے کیا گیا کہ تم میرے لڑکے ہو، اور میں اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ میرے بیٹے ہونے کے ناطے تمہارے ساتھ کوئی خصوصی برتاؤ کیا جائے لہٰذا اصل اور نفع دونوں بیت المال میں جمع کراؤ۔ خلیفہ کے حکم پر فی الفور عمل کیا گیا کہ حقیقی دیانت داری کا یہی تقاضا تھا۔

حضرت عثمان غنیؓ — خیر مجسم

ابن سعیدؓ کی عمر بہت کم تھی۔ ایک دن ایک چڑیا سے کھیل رہے تھے کہ وہ اُڑ کر مسجدِ نبویؐ میں چلی گئی۔ ابن سعیدؓ اس کے پیچھے بھاگے اور بھاگتے بھاگتے مسجد میں داخل ہو گئے۔ کُرتہ ذرا بوسیدہ تھا۔ دیکھا کہ ایک بڑے وجیہہ بزرگ مسجد میں ایک اینٹ کو تکیہ بنائے محوِ خواب ہیں معصوم بچے کی نگاہ جب ان پر پڑی تو ان کی وجاہت اور حسن و جمال کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا ان کے پاس کھڑا ہو گیا اور تعجب سے انہیں تکنے لگا۔ بچےؓ کی جو آہٹ پائی تو بزرگ نے آنکھ کھول دی۔ دریافت کیا بچےؓ تم کون ہو، کس کے بیٹے ہو؟۔ اس وقت مسجد میں کیا کرنے آئے ہو؟ ابن سعیدؓ نے نہایت معصومیت سے بزرگ کو ساری باتیں بتلا دیں اور یہ بھی بتلا دیا کہ حضرت! اس وقت تو میں اپنی چڑیا کو پکڑنے کی نیت سے آیا تھا۔ بزرگ نے بچے کو اپنے پاس بُلا کر بٹھا

لیا اور قریب ہی ایک شخص سو رہا تھا، اس کا نام لے لے کر پکارنے لگے۔ مگر وہ اللہ کا بندہ بالکل ہی غافل سو رہا تھا۔ بزرگ نے ابنِ سعیدؓ سے فرمایا کہ بچے ذرا قریب جا کر اسے بیدار کرو۔ جب ابنِ سعیدؓ نے اسے بیدار کیا تو بزرگ نے اسے قریب بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا اور وہ چلا گیا۔ اب ابنِ سعیدؓ بھی جانے کے لئے کھڑے ہو گئے تو بزرگ نے فرمایا کہ تم ابھی نہ جاؤ، تم سے کچھ کام ہے۔ میرے پاس ہی بیٹھے رہو۔ ابنِ سعیدؓ کا بیان ہے کہ اس بزرگ کے چہرے میں ایسی کشش، لہجے میں ایسی مٹھاس اور طرزِ گفتگو میں اتنی شیرینی تھی کہ میں انکار نہ کر سکا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ وہی آدمی ایک نہایت قیمتی اور خوب صورت کُرتہ لے کر آیا۔ بزرگ نے وہ کُرتہ لیا۔ میرا کُرتہ اتروا دیا اور وہ کُرتہ مجھے پہنا دیا۔ میرا پُرانا کُرتہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور جب میں چلنے لگا تو میرے کُرتے کی جیب میں ایک ہزار درہم کی تھیلی ڈال دی۔ فرمایا اب اپنے گھر جا سکتے ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ نہایت جاذبِ نظر کُرتہ میرے بدن پر تھا اور جیب میں درہموں سے بھری ہوئی تھیلی۔ گھر میں آیا تو سیدھے اپنے والد کے پاس گیا اور جیب سے تھیلی نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔ والد نے جو ماجرا دریافت کیا تو ساری داستان شروع سے آخر تک سُنا ڈالی۔ میرے والد سوچ میں پڑ گئے۔ پوچھا تم انہیں جانتے ہو۔ میں نے عرض کیا میں تو انہیں نہیں جانتا۔ لیکن بابا! آدمی بڑے خوب صورت تھے۔ معمولی کپڑے ان کے بدن پر تھے، مسجدِ نبویؐ کے ایک کونے میں ایک اینٹ سر کے نیچے رکھے سو رہے تھے۔ ان کے مُنہ سے باتیں ایسے نکل رہی تھیں جیسے کہ پھول جھڑ رہے ہوں۔

یہ سب سُن کر ابنِ سعیدؓ کے والد مسکرا اٹھے اور فرمایا بیٹے! میں سمجھ گیا وہ کون تھے۔ وہ خلیفۂ وقت ذو النورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ تھے۔ غریبوں کے غمگسار، شمع کی طرح دوسروں کے لئے جلنے اور گھلنے والے۔ خیرِ مجسّم، سخی اور غنی۔

علی المرتضیٰؓ اور رعایا کی خبر گیری

سڑک کے کنارے ایک لونڈی کھڑی رو رہی تھی۔ مگر کسے فرصت تھی کہ اتنے

رش کے وقت اس سے رونے کی وجہ دریافت کرتا۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی اور کاروبار میں تیزی آ چکی تھی۔ عین اسی وقت ایک پُرہیبت اور باوقار شخص لونڈی کے قریب سے گزرا اور اُسے روتا دیکھ کر ٹھہر گیا۔ بیٹی! تو کیوں رو رہی ہے؟۔ لونڈی نے کہا حضرت! میں نے فلاں دوکان دار سے ایک درہم کی کھجوریں خریدی تھیں۔ کھجوریں لے کر جب میں اپنے مالکوں کے پاس گئی تو انہیں پسند نہ آئیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ کھجوریں واپس کر کے قیمت لے آؤ۔ مگر دوکان دار واپس کرنے پر راضی نہیں ہے۔ اگر یہ بات میں جا کر مالکوں سے کہوں تو وہ اور زیادہ ناراض ہوں گے اور مجھے اندیشہ ہے کہ سزا دیں گے۔ اس لئے رو رہی ہوں۔ یہ پُرہیبت اور باوقار شخصیّت کوئی معمولی شخصیّت نہ تھی خلیفۂ وقت حضرت مولا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تھے، لونڈی کو ساتھ لے کر دکان دار کے پاس تشریف لے گئے اور اسے حکم دیا کہ کھجوریں واپس لے کر قیمت لوٹا دو، دکان دار نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ آپؓ کو کھجوروں کے بازار میں دیکھ کر بہت سے دکان دار جمع ہو گئے۔ آپؓ نے ارشاد فرمایا کاروباری معاملات میں نرمی کیا کرو، مسکینوں کو کھلایا کرو۔ اللہ تعالےٰ تمہارے کام میں برکت دے گا۔

قریب ہی کپڑے کا بازار تھا خلیفہ وہاں تشریف لے گئے۔ ایک دکان پر ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے خلیفہ کو نہیں پہچانا۔ آپؓ نے تین درہم میں ایک قمیص اس سے خریدی اور اسے پہن کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب دکان کا اصل مالک آیا تو پاس کے دکان داروں نے اسے بتلایا کہ تیرے لڑکے سے جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے تین درہم میں ایک قمیص خریدی ہے۔ دکان دار بیچارہ سخت پریشان ہوا۔ کیونکہ غلطی سے لڑکے نے دو۲ درہم کی قمیص تین درہم میں فروخت کر دی تھی۔ چنانچہ وہ ایک درہم لے کر خلیفہ کی قیام گاہ پر پہنچا اور عرض کیا کہ حضرت! قمیص دو۲ درہم کی تھی، غلطی سے میرے لڑکے نے تین درہم لے لئے تھے۔ اس لئے یہ ایک درہم واپس لے لیں۔ شیرِ خدا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے فرمایا۔ "میں یہ درہم نہیں لے سکتا، اس لئے کہ میں نے یہ قمیص رضامندی سے تین درہم میں خریدی تھی۔ اب اس کا واپس

لینا میرے لئے جائز نہیں۔

حکمتِ ایمانی

خلیفۂ راشد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے دن اب قریب ہی تھے۔ عصر کی نماز پڑھ کر نمازی جامع کوفہ سے نکل رہے تھے۔ ان میں جناب کمیل بن زیاد نخعی رضؓ بھی تھے۔ کمیلؓ کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ میں آپ کے ساتھ ہولیا۔ شہر کے باہر صحرا میں ایک قبرستان تھا مولا علیؓ مجھے وہاں لے گئے۔ فضا پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور دریائے حکمت جوش پر تھا۔ شیرِ خدا حیدرِ کرار کرم اللہ وجہہ جنہیں نبوت نے شہرِ علم کا دروازہ کہا تھا اور شرفِ صحبت نے جن کے قلبِ مبارک کو علم و معرفت کا گنجینہ بنا دیا تھا نہ جانے کیوں آج بہت جوش میں تھے، فرمایا: کمیلؓ! یہ دل دراصل برتن ہیں اس لئے ہمیشہ دل میں پاک چیزیں ڈالا کرو۔ اس وقت جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔ یاد رکھو کہ انسان تین قسم کے ہوتے ہیں ایک ربّانی عالم، دوسرے وہ لوگ جو نجات حاصل کرنے کے لئے علم سیکھتے ہیں اور تیسرے وہ احمق جو ان چرواہوں کی طرح ہیں کہ ہر بھیڑ کی آواز پر اس کی طرف بھاگتے ہیں اور جس طرف کی ہوا ہوتی ہے اسی طرف چل پڑتے ہیں نہ وہ علم کے نور سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور نہ کسی مضبوط چیز کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

کمیلؓ! علم مال سے بہتر ہے کہ علم تیری حفاظت کرتا ہے اور تو مال کی حفاظت کرتا ہے جو شخص مال کے بل بوتے پر عزت حاصل کرتا ہے، اس کی عزت مال کے ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن جو شخص علم کے ذریعہ عزت حاصل کرتا ہے اس کی عزت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ کمیلؓ میں تمہیں پانچ نصیحتیں کرتا ہوں۔

۱۔ سوائے خدا کے کسی سے امید نہ رکھو۔

۲۔ سوائے اپنے گناہ کے کسی سے نہ ڈرو۔

۳۔ اگر تم سے کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کا تمہیں علم نہ ہو تو یہ کہتے ہوئے نہ

شرماؤ کہ "میں نہیں جانتا"

۴۔ اگر تمہیں کسی بات کا علم نہ ہو تو اسے معلوم کرنے میں تکلّف نہ کرو۔

۵۔ صبر اختیار کرو کیونکہ صبر کا تعلق ایمان سے ایسا ہی ہے جیسا سر کا تعلق بقیہ جسم سے اس جسم کا کوئی فائدہ نہیں جس کا سر ہی نہ ہو۔ اسی طرح اس ایمان سے کوئی فائدہ نہیں جس کے ساتھ صبر نہ ہو۔

حضرت علی المرتضیٰؓ کی وصیّت

زخم کاری تھا اور ایک عام آدمی بھی اب سمجھنے لگا تھا کہ بچنا شاید ممکن نہ ہو۔ ایسے وقت میں اپنے ہوش وحواس پر قابو رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے بے ہوشی آجاتی مگر پھر سنبھل جاتے۔ اگر کوئی معمولی آدمی ہوتا تو دل چھوڑ بیٹھتا مگر یہاں تو عزم وہمّت کا فلک بوس پہاڑ ہے۔ ایسا شخص ہے جس کی ساری زندگی تلوار کے سایہ میں گزر گئی۔ وہ ہر وقت موت کو گلے لگانے کے لئے تیار رہتا لیکن موت اس سے آنکھیں ملانے سے گھبراتی تھی۔ اب وہ لمحہ لمحہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مگر طبیعت میں سکینت ووقار ہے، سینۂ بے کینہ علم ومعرفت کے انوار سے منور ہے۔ اپنے خالق ومالک سے ملنے کا شوق کشاں کشاں موت کی وادیوں کی طرف لئے جا رہا ہے ایسے عالم میں یہ فکر نہیں کہ میری اولاد میرے بعد کھائے گی کیا؟ رہے گی کہاں؟ اسے زندگی کی آسائشیں میسر آئیں گی یا نہیں؟ فکر صرف اس بات کی ہے کہ میری اولاد میرے بعد جادۂ مستقیم پر باقی رہے گی یا نہیں؟ آنکھیں کھولیں اور حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو مخاطب کرکے فرمایا: "میرے بیٹو! میرا آخری وقت آن پہنچا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی پوری ہو گئی۔ ابنِ ملجم کی تلوار نے ایسا زخم لگایا ہے کہ میری ڈاڑھی خون آلود ہو چکی ہے۔ کان لگا کر میری وصیّت سنو اور میری نصیحت کو ساری زندگی حرزِ جان بنائے رکھنا۔ خلوت و جلوت میں خوفِ خدا سے اپنے دلوں کو معمور رکھنا۔ ہر حال میں کلمۂ حق بلند کرنا، دوست اور دشمن سب کے ساتھ انصاف کرنا۔ خبردار! عمل میں کوتاہی نہ کرنا۔ میرے بچّو! ہر شے

کے انجام پر نگاہ رکھنا۔ اگر کوئی چیز بظاہر تکلیف دہ ہو لیکن اس کے نتیجے میں جنت ملے اور کوئی چیز بظاہر خوش کن ہو لیکن اس کی انتہا جہنّم پر ہو رہی ہو تو انجام کا خیال کر کے تکلیف برداشت کر لینا، لیکن ہرگز ہرگز دُنیا کی وقتی عافیت کی طرف متوجہ ہو کر آخرت کے عذاب کو نہ خریدنا۔ میرے جگر کے ٹکڑو! جو شخص اپنے عیوب پر نگاہ رکھتا ہے اسے دوسروں کے عیب نظر نہیں آتے۔ وہ تو اپنی ہی اصلاح میں لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تقسیم اور تقدیر پر راضی رہنا، جو مل جائے اس کا شکر ادا کرنا جو نہ ملے اس کا غم نہ کرنا۔ جو شخص دوسروں کے لئے کُنواں کھودتا ہے پہلے وہ خود اس میں گرتا ہے۔ جو اپنے مسلمان بھائی کی حُرمت کو پامال کرتا ہے اس کی اور اس کی اولاد کی حُرمت پامال کی جاتی ہے جو شخص اپنی رائے کو سب کی رائے سے بہتر سمجھتا ہے آخر کار گمراہ ہو جاتا ہے۔ خبردار! سرِ غرور کبھی بلند نہ کرنا کیونکہ مغرور ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ بُری جگہ نہ جانا ورنہ تم پر تہمت لگا دی جائے گی۔ علماء کی صحبت اختیار کرنا تم باوقار بن جاؤ گے۔ ہر وقت ہنسی مذاق سے پرہیز کرنا ورنہ تم ہلکے ہو جاؤ گے۔ گفتگو مختصر اور برقت کرنا۔ کیونکہ جو زیادہ کلام کرتا ہے وہ غلطیاں بھی بہت کرتا ہے۔ میرے بچّو! ادب و اخلاق ہی وہ ترازو ہے جس پر کسی انسان کو تولا جاتا ہے۔ فقر کی زینت صبر اور غنا کی زینت شکر ہے۔ یاد رکھنا کہ اسلام سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں اور تقویٰ سے بڑھ کر کوئی فضیلت نہیں۔ توبہ سے بڑھ کر کوئی سفارشی نہیں۔ عافیت سے بڑھ کر کوئی لباس نہیں۔ سُن لو کہ حرص ہر مصیبت کی کُنجی اور ہر آفت کا پیش خیمہ ہے۔ جنّت کے مقابلے میں ہر نعمت حقیر ہے اور جہنّم کے مقابلے میں ہر مصیبت ہیچ۔ جنّت طلب کرنا، اپنے مولا کو راضی کرنے کی کوشش کرنا کسی بھی حالت میں حرفِ شکایت زبان پر نہ لانا کہ یہ آدابِ بندگی کے خلاف ہے۔"

اب آواز ڈوب رہی ہے۔ کلمہ شہادت زبان پر جاری ہے اور اسد اللہ الغالب جناب علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ کی رُوح پُرفتوح جنّت الفردوس کی طرف رواں ہے کہ وہاں اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

شہادتِ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ

انہوں نے کہا کہ اس رات تو میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ شب بیداری ہو رہی تھی۔ مصر تک سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مسجد میں نمازیوں کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ کوئی رکوع میں تھا تو کوئی سجدے میں۔ نوافل ادا کئے جا رہے تھے۔ میں بھی عبادت میں کچھ ایسا منہمک ہوا کہ دبے پاؤں رات گزر گئی اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور مسجد کے مینار سے آوازِ اذان بلند ہوئی۔ تاہم ابھی تک اندھیرا غالب تھا۔ میں نے فجر کی سُنّتیں ادا کیں اور صحنِ مسجد کے اُس حصّے میں آ کر بیٹھ گیا جو مسجد کے دروازے سے متصل تھا۔ اتنے میں [illegible] والد صاحب کی آواز دُور سے سُنائی دینے لگی الصّلوٰۃ، الصلوٰۃ، لوگو! چلو نماز کے لئے، چلو نماز کے لئے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ صبح کی نماز کے لئے جب مسجد میں آتے تو راستے میں سونے والوں کو جگاتے ہوئے آتے۔ اب آواز قریب آ چلی تھی۔ ابھی وہ مسجد کے دروازے کے قریب ہی پہنچے تھے کہ اندھیرے میں دو مرتبہ تلوار چمکی اور بابُ العلم شیرِ خُدا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ فزت برب الکعبہ (کعبہ کے رب کی قسم میں بازی جیت گیا) کہتے ہوئے گر پڑے۔ شور اٹھا اور لوگ حملہ آور کو پکڑنے کے لئے دوڑ پڑے۔ حضرت محمد بن الحنفیہ رضی اللہ عنہٗ کا بیان ہے کہ میں جو بڑھ کر پہنچا تو اس منظر کو دیکھ کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ میرا وہ باپ جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بچپن ہی میں اپنی کفالت میں لے لیا تھا۔ جس نے نابالغوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا جو شبِ ہجرت بے تکلّف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بسترِ مبارک پر آپؐ کی چادرِ مبارک اوڑھ کر سو گیا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ کفارِ مکّہ کہیں نبیؐ سمجھ کر اسے دھوکے میں قتل نہ کر دیں۔ جس کی تلوار بدر و حنین، اُحد و احزاب میں برقِ تپاں بن کر خرمنِ کُفر پر گرتی رہی۔ وہ جو مرحب کو پچھاڑنے والا عمر بن عبدود جیسے پہلوان کو ابدی نیند سلانے والا تھا۔ وُہ جسے خاتونِ جنّت کے شوہر بننے کا شرف

حاصل ہوا۔ جیسے غزوۂ خیبر کے موقع پر بیس دن کی ناکامی کے بعد قلعۂ قموص فتح کرنے کے لئے پرچم عطا کرتے وقت نبی ﷺ نے اعلان فرمایا تھا کہ علیؓ اللہ ورسولؐ سے محبت رکھتے ہیں اور اللہ ورسولؐ علیؓ کو محبوب جانتے ہیں۔ آج جامع کوفہ کے دروازے پر زخمی پڑا ہے۔ ابن ملجم کی زہرناک تلوار کا وار پیشانی پر پڑا اور ڈاڑھی مبارک خون سے تربتر ہو گئی۔ حسنین کریمینؓ بلائے گئے۔ وصیت فرمائی:

میرے بیٹو! اگر میں زندہ بچ گیا تو قاتل کے بارے میں فیصلہ خود کروں گا اور اگر وفات پا گیا تو خبردار قصاص لیتے وقت اس سے زیادتی نہ کرنا۔ اسی کی طرح ایک ہی وار میں اس کا سر قلم کرنا۔ اس کی لاش کی بے حرمتی نہ کرنا۔

میرے بیٹو! خلوت وجلوت میں خدا سے ڈرتے رہنا۔ نماز باجماعت ہرگز ترک نہ کرنا، دنیا سے ہرگز دل نہ لگانا، مسلمانوں کو متحد رکھنے کی کوشش کرنا، اللہ تعالےٰ کے سوا کسی پر بھروسہ کرنا نہ کسی سے سوال کرنا کہ وہی مالک الملک قوت واقتدار کا مالک ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

عمر بن عبدالعزیزؒ

الغافاً فاطمہؒ ان کے کمرے میں چلی آئیں تو کیا دیکھا کہ جائے نماز پر بیٹھے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر زار وقطار رو رہے ہیں۔ آنسوؤں نے ان کے رخسار اور ڈاڑھی کو بھگو دیا ہے۔ بیوی اپنے شوہر کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ پوچھا، آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: فاطمہ! بڑے افسوس کی بات ہے کہ مجھے اس امت کا والی بنا دیا گیا ہے۔ اس طرح میرے اوپر اس امت کے بھوکوں، فقیروں، مریضوں بے چاروں، یتیموں، بیواؤں، مظلوموں، مسافروں، عیال داروں، کم آمدنی والوں اور ان جیسوں کی ذمے داری لاد دی گئی ہے۔ یہ لوگ دور دراز علاقوں اور دور کے

شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور مجھے علم ہے کہ میرا خُدا قیامت کے دن مجھ سے ان کے بارے میں سوال کرے گا اور محمد رسول اللہ ﷺ ان لوگوں کے لئے مجھ سے جھگڑیں گے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں ان کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ اس لئے مجھے اپنے معاد پر رحم آیا اور اپنی بے بسی کا تصور کر کے میں رو پڑا۔ خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جواب سُن کر ان کی اہلیہ فاطمہؒ کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا اور انہوں نے یہ عہد کر لیا کہ حتی الوسع وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گی جس کے باعث حشر کے میدان میں ان کے شوہر کو ذلیل و رسوا ہونا پڑے۔ عمر بن عبد العزیزؒ کے اسی احساسِ ذمہ داری اور تقویٰ شعاری کے باعث علامہ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں حضرت سفیان ثوریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو بھی خلفائے راشدینؓ میں شمار کرنا چاہیئے اور اس بات پر علمائے اُمت متفق ہیں۔

بچپن میں ایک مرتبہ عمر بن عبد العزیزؒ رو رہے تھے تو ان کی والدہ ماجدہ نے سبب دریافت کیا۔ عمر بن عبد العزیزؒ نے کہا ماں! مجھے موت یاد آگئی تھی۔ اس موت کو جو انہیں بچپن میں یاد آئی تھی عمر بن عبد العزیزؒ نے ساری زندگی یاد رکھا اور اس طرح زندگی گزاری گویا ہر لمحہ موت ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ابنِ مہرانؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے انہیں کسی جگہ کا حاکم بنایا اور حکم دیا کہ اگر کبھی تمہیں میرا ایسا حکم ملے جو حق کے خلاف ہو تو اسے زمین پر پٹخ دینا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے ایک عامل کو لکھا کہ "اگر تمہارا اقتدار اور طاقت کبھی تمہیں عوام پر ظلم کرنے کی طرف مائل کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ کی طاقت و اقتدار کو یاد کر لینا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے گھر میں دو چراغ تھے۔ جب انہیں سرکاری خطوط لکھنے ہوتے تو سرکاری چراغ جلاتے اور ذاتی کام کرتے وقت ذاتی چراغ جلاتے۔ اور سرکاری چراغ بجھا دیتے۔ انہوں نے کبھی سرکاری چراغ کی روشنی میں اپنے ذاتی کام کے لئے ایک چھٹی بھی نہیں لکھی۔ علامہ ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے کسی عزیز نے تحفتہً انہیں سیب بھیجے تو انہوں نے لوٹا دیئے۔ کسی نے کہا جناب! ہدیہ تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبول

فرمالیا کرتے تھے؟ عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے لئے تو وہ ہدیہ ہوتا تھا مگر ہمارے لئے یہ رشوت ہے۔

عمرؒ بن عبد العزیزؒ اور زہد و تقویٰ

وہ بچپن میں ایک دن ایک کونے میں کھڑے روتے پائے گئے۔ یہ دیکھ کر ماں گھبرا گئیں۔ دوڑی آئیں اور بچےؒ کو لپٹا لیا۔ پوچھا، بیٹے! کیوں رو رہے تھے؟ جواب دیا۔ ماں! مجھے موت یاد آگئی تھی۔ وہ موت جو انہیں بچپن میں یاد آئی تھی۔ ساری زندگی یاد رہی اور انہوں نے اس طرح زندگی گزاری جیسے موت ہر لمحہ ان کے سامنے کھڑی ہو۔ پاک صاف اور نورانی زندگی ایسی زندگی جس کی نظیر ان کے مابعد کے دور میں نہیں ملتی۔ ولید بن عبد الملک کے عہدِ حکومت میں وہ مدینہ منورہؒ کے گورنر تھے۔ انہوں نے بڑے عدل و انصاف سے حکومت کی۔ انہوں نے دس فقیہوں کا ایک بورڈ بنا رکھا تھا اور کوئی فیصلہ ان کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔

مدینہ کی گورنری کے زمانے ہی میں انہوں نے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کی تھی۔ سلیمان بن عبد الملک کے بعد جب وہ مسلمانوں کے حاکم بنے اور لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تو وہ مسجد سے باہر آئے۔ مسجد کے دروازے پر دُور دُور تک عمدہ اور نفیس گھوڑے کھڑے تھے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ یہ گھوڑے مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت ہیں۔ انہیں لے جاؤ۔ میں تو اپنے جس گھوڑے پر سوار ہو کر آیا تھا اسی پر واپس جاؤں گا۔

جب عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ بنے تو ایک شخص نے ان کی عدالت میں ایک حاکم کے خلاف شکایت کی کہ اس نے مجھے مارا ہے اور میری زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ خلیفہ نے اس حاکم کو طلب کر کے اس سے پوچھا کہ تُو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے ولید بن عبد الملک نے ایسا ہی حکم دیا تھا اور ہم پر آپ لوگوں کی اطاعت فرض ہے۔ اتنا سننا تھا کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ غصّہ سے سُرخ ہو گئے فرمایا۔ تُو جھوٹا ہے۔ ہماری اطاعت تم پر فرض نہیں۔ تمہارے اوپر ہمارے صرف الٰہی احکام

کی پیروی واجب ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے منشار کے برخلاف نہ ہوں چنانچہ فوراً مدعی کی زمین اس کو واپس دلوادی۔

ایک دن خلیفہ نے اپنے غلام سے جس کا نام درہم تھا دریافت فرمایا کہ لوگ کیا کہتے ہیں ؟ غلام نے کہا۔ لوگ کیا کہیں گے سب مزے میں ہیں۔ البتہ میں اور آپ سخت مصیبت میں ہیں۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے پوچھا وہ کیسے ؟ کہا کہ میں نے خلیفہ بننے سے پہلے بھی آپ کو دیکھا ہے آپ عطر میں بسا ہوا لباسِ فاخرہ پہنتے تھے۔ اچھی سواریوں پر چڑھتے تھے اچھا کھانا کھاتے تھے جب آپ حاکم بنے تو میں سمجھا تھا کہ اب میں کچھ آرام پاؤں گا لیکن آپ خود بھی مصیبت میں گرفتار ہوگئے اور ہمارا حال بھی بُرا ہے۔ یہ سُن کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے غلام کو آزاد کر دیا اور فرمایا کہ مجھے میرے حال پر اس وقت تک کے لئے چھوڑ دو جب تک اللہ تعالیٰ مجھے چھٹکارا نہ دے۔

مسلمانوں کی قیادت پھولوں کا ہار نہیں، کانٹوں بھرا تاج ہے۔

عمرؒ بن عبدالعزیزؒ اور رعایا کی خبرگیری

مصر کا گورنر ایوب ابن شرجیل سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے کہ اسے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا فرمان مل چکا تھا۔ یہ فرمان کسی سیاسی معاملے کے سلسلے میں نہیں تھا نہ بظاہر اس کا تعلق امورِ مملکت سے تھا۔ خلیفہ نے ایوب ابن شرجیل کے ذمہ جو کام لگایا تھا۔ سچ پوچھیے تو وہ ایک گورنر کے شایانِ شان نہیں تھا لیکن چونکہ خلیفہ کا حکم آچکا تھا اس لئے ایوب ابن شرجیل کو تو یہ کام کرنا ہی تھا۔ ایک حبشی لونڈی فرتونہ نے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو لکھا تھا کہ میرے مکان کی دیواریں نیچی ہیں۔ محلّے کے شریر لڑکے دیوار پھاند کر چلے آتے ہیں اور میری مرغیاں چُرا لے جاتے ہیں۔ مہربانی فرما کر آپ میرے مکان کی دیواریں اُونچی کرا کر مجھے تحفظ دیں۔

فرتونہ کی درخواست حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ملی تو انہوں نے دارالخلافہ سے مصر کے گورنر ایوب ابن شرجیل کو ایک فرمان بھیجا کہ فرتونہ نے میرے پاس شکایت

بھیجی ہے۔ اس فرمان کو پاتے ہی تم خود فرتونہ کے پاس جاؤ اور تحقیق کرو کہ اس کی شکایت بجا ہے یا بے جا۔ اگر اس کی شکایت درست ہو تو فوراً اس کے ازالے کی کوشش کرو کیونکہ رعایا کی جان و مال اور عزت و آبرو کو تحفظ دینا حکومت کا فرضِ اوّلیں ہے۔

مصر کا گورنر ایوب ابن شرجیل اگر چاہتا تو اپنے کسی نائب کو اس فرض کی ادائیگی پر مامور کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس بات کی اطلاع حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ہو گئی تو اس کی خیر نہیں۔ انہی خوبیوں کی بنار پر اکثر مؤرخین نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اڑھائی سالہ دورِ حکومت کو بھی خلافتِ راشدہ میں سے شمار کیا ہے۔

جس دن سلیمان بن عبدالملک کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کے حاکم بنے اور لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تو وہ مسجد سے باہر آئے اس وقت مسجد سے باہر دُور دُور تک ایک سے ایک نفیس گھوڑے کھڑے تھے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان گھوڑوں کو دیکھا تو فرمایا یہ سب بیت المال کی ملکیت ہیں۔ انہیں بیت المال میں لے جاؤ۔ ہم تو اپنے اسی گھوڑے پر چڑھیں گے جو ہمارا اپنا ہے عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو اس وقت کی معلوم دُنیا کے سب سے بڑے حکمران تھے جن کی قلمرو شام، عراق، ایران، افغانستان، ماوراء النہر، سندھ، بلوچستان، مصر، افریقہ اور اندلس تک پھیلی ہوئی تھی اور جن کے مقابلے کا اس وقت کی دنیا میں کوئی بادشاہ نہ تھا اپنے تمام اموال، لونڈیوں اور باندیوں کا جائزہ لیا اور لونڈیاں ان کے گھروں کو بھجوا دیں اور اموال بیت المال کے سپرد کر دیئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلا جو فرمان جاری کیا وہ یہ تھا کہ "ہمارے کسی حاکم کے خلاف اگر کسی کو کوئی شکایت ہو تو اسے چاہیئے کہ براہِ راست ہم سے شکایت کرے۔ شکایت کے جائز ہونے پر ہم اسے انعام بھی دیں گے اور شکایت کا ازالہ بھی کریں گے۔"

اسی طرح کے اعلانات نے مصر کی ایک حبشی لونڈی فرتونہ کو یہ جرأت بخشی تھی

کہ وہ اپنے مکان کی دیوار کے نیچے ہونے اور مرغیوں کے چوری ہونے کی شکایت خلیفہ کے پاس پہنچائے۔ ایوب بن شرجیل گورنرِ مصر نے خود جاکر اپنے سامنے فرتونہ کے مکان کی دیواروں کو اونچا کرایا اور جب اس نے اطمینان کا اظہار کر دیا تو گورنرِ مصر نے اطمینان کا سانس لیا۔

غربت

مدرسے سے واپس آکر بچہ روئے ہی چلا جا رہا تھا۔ ماں نے سمجھا کہ شاید بھوکا ہے، کھانا کھانے کے بعد چپ ہو جائے گا۔ لیکن کھانا کھانے کے بعد بھی بچے کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ انتہائی مغموم اور رنجیدہ۔ آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ ماں نے تنہائی میں لے جاکر بچے سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں۔ آپ ہیں کہ پیوند پہ پیوند لگائے جارہی ہیں۔ مگر ماں اب تو پیوند کی بھی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ میرے ساتھی میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ اتنے بڑے آدمی کا بیٹا ہو کر اس بُرے حال میں مدرسے آتا ہے۔ لہٰذا جب تک نئے کپڑے نہ ہوں گے میں توکل سے مدرسہ نہیں جاؤں گا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ جہاں سے ہو انتظام کرو۔ یہ باتیں بچے نے کچھ ایسے انداز میں کہیں کہ ماں کا دل بھی رو دیا۔ اس نے کہا جانِ من! غم نہ کر۔ انشاءاللہ میں آج ہی تیرے لئے نئے کپڑوں کا انتظام کروں گی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد لڑکے کا باپ بھی آ گیا۔ یہ باپ کوئی لکڑہارا، کوئی مزدور، کوئی غریب کسان نہ تھا۔ اُس وقت کی دُنیا کی سب سے بڑی حکومت کا سربراہ تھا۔ اس کا نام تاریخِ اسلام کے صفحات پر آج بھی جگمگا رہا ہے۔ لڑکے کی ماں یعنی ملکہ نے خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے کہا، خلیفہ! میں نے مکمل تمہاری اطاعت کی ہے۔ میں ایک بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ تم نے کہا میں نے لاکھوں کے زیور تمہارے ادنیٰ سے اشارے پر اُتار کر بیت المال میں جمع کرا دیئے۔ میں نے اپنی تمام موروثی جائیداد حکومت کے حوالے کر دی شہزادی

ہو کر روکھا پھیکا کھا کر گزارا کرتی ہوں۔ لیکن میں اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ میرا بچّہ مدرسے میں اپنے ہم درس بچّوں کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنے۔ جہاں سے ہو میرے بچّے کے لئے ایک جوڑا کپڑا بازار سے منگوا دو۔ یہ باتیں ملکہ نے کچھ اس انداز سے کہیں کہ خلیفہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے مگر پاس میں ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ بیت المال کے خازن کو ایک پرچی لکھ کر بھیجی کہ ماہِ رواں کی تنخواہ میں سے کچھ پیشگی دے دو، تنخواہ پر رقم وضع کر لینا۔ پرچی کی پُشت پر خازن نے لکھ کر لوٹا دیا کہ براہِ کرم آپ مجھے ضمانت دیں کہ مہینہ ختم ہونے تک آپ زندہ رہیں گے۔ اس لئے پیشگی دینے سے معذور ہوں۔ خلیفہ زندگی کی ضمانت کیسے دیتے، بیٹے سے کہا: بیٹے! انہی کپڑوں میں مدرسہ جاؤ۔ بچّے مذاق اڑائیں تو شرما کر نہیں سر اُٹھا کر جواب دینا کہ میرا باپ نئے کپڑے بنانے کی استطاعت نہیں رکھتا کہ غریب ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔

محمدؒ بن ابی عامر المنصورؒ

کون جانتا تھا کہ آج جو نوجوان روزی کمانے کے لئے الحکم الثانی کے محل کے سامنے بیٹھ کر عرضیاں لکھا کرتا ہے آگے چل کر اندلس کی اتنی بڑی اسلامی مملکت کا مطلق العنان حکمران بن جائے گا۔ محمد بن ابی عامرؒ نہ کسی بادشاہ کے بیٹے تھے نہ پوتے۔ وہ ایک غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انتہائی غربت کے عالم میں قرطبہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور تعلیم سے فراغت کے بعد عرائض نویسی کو بطور پیشے کے اپنا لیا۔ جس وقت محمد بن ابی عامرؒ الحکم الثانی کے محل کے باہر ایک بوریا بچھائے عرائض نویسی میں مصروف ہوتے تقدیر محمد بن ابی عامرؒ کے پیچھے کھڑی مسکراتی رہتی۔ پہلے پہل ابن ابی عامر الحکم کے محل میں اس کے بیٹے عبدالرحمٰن کے اتالیق بن کر داخل ہوئے۔ پھر خزانچی، پھر کوتوالِ شہر۔ طبیعت کی شرافت، فطری جرأت و شہامت اور دیانت داری نے اپنا رنگ دکھایا تو الحکم کے محل کے سامنے عرائض نویسی کرنے والا افریقہ کی مہم پر جانے والے لشکر کا نگران مقرر ہوا۔ فوج کے افسران محمد بن ابی عامرؒ

کی فراستِ ایمانی اور خوش خلقی سے اتنے متاثر ہوئے کہ الحکم الثانی کے انتقال کے بعد تمام ارکانِ حکومت اور اعیانِ مملکت نے بہ اتفاقِ رائے محمد بن ابی عامرؒ کو الحکم الثانیؒ کے تخت پر متمکن کر دیا اور وہ منصور کے لقب کے ساتھ سریر آرائے مملکت ہوئے۔ منصورؒ نے اپنی زندگی میں پچاس مُہمیں سَر کیں اور پچاس بار دشمن کے ملک پر حملہ آور ہوئے مگر کبھی بھی شکست کا مُنہ نہ دیکھا۔

اسی لئے علامہ مُقریؒ نے منصورؒ کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ علامہ کا بیان ہے کہ منصورؒ کو ایک بار معلوم ہوا کہ نبرہ کی عیسائی ریاست کے ایک والی نے ایک بوڑھی مسلمان عورت کو لونڈی بنا رکھا ہے تو پہلے انہوں نے ایک سفارت بھیج کر اس عورت کی واپسی کا مُطالبہ کیا۔ لیکن جب یہ عورت واپس نہ بھیجی گئی تو وہ خود قرطبہ سے چل کر نبرہ آئے۔ نبرہ کا والی ان کو خراج دیتا تھا اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایک غریب بوڑھی عورت کی بازیابی کے لئے سلطان خود آئے گا۔ یہ خبر سُن کر وہ بوکھلا گیا اور اس عورت کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ کر لایا اور اس گرجا کو گروا دیا جس میں اس بوڑھی عورت کو چھپایا گیا تھا منصورؒ اس عورت کو ساتھ لے کر قرطبہ آئے، اسے بیش بہا تحائف دیئے، اس کا وظیفہ مقرر کیا اور بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوم کی ایک بوڑھی عورت کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ قوم کی خدمت کے اسی پاکیزہ جذبے کی بدولت اُندلس کی تاریخ میں محمد بن ابی عامر المنصورؒ کا نام چاند سورج کی طرح درخشندہ رہے گا۔

نورُ الدّینؒ

آدمی کے نام کا اثر اس پر زندگی بھر رہتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں حکم دیا گیا کہ اپنی اولاد کے نام بہتر سے بہتر رکھا کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اگر کوئی غلط نام والا آدمی آتا تو آپ فوراً اس کا نام تبدیل فرما دیتے۔ نورُ الدّین تو

واقعتہً اسم بامسمّٰی تھا یعنی جیسا نام ویسا کام۔ بڑا فرض شناس، نیکوکار اور ہمدرد فرمانروا تھا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں قیامِ عدل پر سب سے زیادہ زور دیا۔ اس کے زمانۂ حکومت میں ساری مملکت میں شرعی قوانین نافذ تھے۔ کسی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے بھی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ اس کے قاضی یا حاکم شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ دمشق اور حلب کی عدالتوں کا وہ خود نگران تھا۔ ہفتے میں چار دن دمشق کی جامع مسجد میں وہ کھلی عدالت منعقد کرتا۔ اس کے دائیں اور بائیں وقت کے بڑے بڑے علماء اور قاضی بیٹھے رہتے۔ رعایا کو عام اجازت تھی کہ جس کے خلاف چاہے آکر مقدمہ دائر کرے۔ خود سلطان نورالدینؒ کے خلاف مقدمے دائر ہوتے اور قاضی سلطان کی موجودگی میں اس کے خلاف مقدمے کی سماعت کرتے اور اگر انصاف کا تقاضا ہوتا تو اس کے خلاف فیصلے کرتے اور سلطان نورالدینؒ زنگی جیسا فاتح اور صاحبِ سطوت حکمران شریعت کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم رعایا بھی سلطان کے خلاف مقدمے دائر کرتی اور اسے انصاف ملتا۔ سلطان نے ایک اور بات کا بھی اہتمام کیا تھا وہ یہ کہ مقدمے زیادہ طول نہ کھینچیں۔ بڑے سے بڑے مقدمے کا فیصلہ دو تین دنوں میں ہو جاتا۔ مدعی اپنے پورے ثبوت اور گواہ لے کر عدالت میں حاضر ہوتے اور انہیں انصاف مہیا کیا جاتا۔ کیونکہ اسلامی نظامِ عدل کا یہ اولین اصول ہے کہ انصاف میں تاخیر بذاتِ خود بہت بڑا ظلم ہے۔ سلطان نورالدینؒ زنگی صوم وصلوٰۃ کا سخت پابند تھا۔ عموماً باجماعت نماز ادا کرتا اور کثرت سے قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا۔ اس کی دلی آرزو تھی کہ بیت المقدس کو غاصب عیسائیوں سے آزاد کرائے۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا اور اس نے ۵۸ برس کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ تمام مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس نے اپنے دورِ حکومت میں اللہ تعالیٰ کی زمین کو عدل و انصاف اور اطمینان و فارغ البالی سے بھر دیا تھا۔ تاریخ کو آج بھی اس کے افسانے یاد ہیں۔

اشاعتِ اسلام

نیشاپور کے قاضی فخر الدینؒ ایک دن بازار سے گزر رہے تھے کہ انھوں نے ایک سیاہ فام بدصورت غلام کو نہایت کم قیمت میں خرید لیا۔ بچے کے سیاہ رنگ اور بدصورتی کے باعث اس کا مالک بھی اس سے بیزار تھا، اس لئے جیسے تیسے اس نے قاضی صاحب کے سر اس غلام کو منڈھ دیا۔ اس وقت قاضی فخر الدینؒ کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ آئندہ چل کر ایک گندے کمبل میں لپٹا ہوا یہ بچہ ہندوستان کا حکمران ہوگا اور اس کے دم سے ہندوستان میں اسلام کی شمع روشن ہوگی۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ کاتبِ تقدیر نے اس کے مقدر میں شہنشاہی لکھ دی تھی۔ قاضی صاحب نے غلام کو تعلیم دی تو وہ عقل و دانائی میں اپنی نظیر آپ تھا۔ قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کے ورثا نے اس غلام کو غلاموں کے ایک تاجر کے پاس بیچ ڈالا۔ تاجر غلاموں کا ایک جتھہ لے کر غور پہنچا اور نہ جانے اس سیاہ فام غلام کی پیشانی پر سلطان شہاب الدین غوریؒ نے کیا دیکھا کہ اسے فوراً خرید کر اپنے خاص خادموں کی جماعت میں شامل کر لیا۔ غلام نے بھی انتہائی وفاداری اور سعادت مندی سے بادشاہ کی خدمت کی۔ ایک مرتبہ سلطان نے اپنے خادموں کے درمیان انعامات تقسیم کئے تو اس سیاہ فام غلام کو سب سے زیادہ دیا جسے غلام نے نہایت فراخ دلی سے شاہی خادموں میں تقسیم کر دیا۔ سلطان شہاب الدین غوریؒ کو جب غلام کی اس سیر چشمی کا پتہ چلا تو وہ بے حد مسرور ہوئے۔ خوارزم کی لڑائی میں وہ غلام سلطان کے ہمرکاب تھا اور اس نے اپنی بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ ہراول دستے کا سردار بنا۔ ہندوستان پر حملے کے وقت شہاب الدین غوریؒ کے لشکر کا وہی سیاہ فام غلام قطب الدین ایبک سپہ سالار تھا۔ آخر کار اپنی دانائی اور فراست کی وجہ سے وہ دہلی میں نائب السلطنت بنا اور رفتہ رفتہ وہی سیاہ فام غلام تختِ ہندوستان کا مطلق العنان حکمران بنا۔ قطب الدین ایبکؒ کو مؤرخین ہندوستان میں اسلام کا عظیم مبلغ کہتے ہیں جس نے رعایا کی دینوی اور مادی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی اصلاح کے لئے بھی حتی المقدور کوشش

کی۔ وہ غریب سے غریب آدمی کی بھی اتنی ہی عزت و توقیر کرتے جتنی کسی امیر کبیر کی۔ اسی لئے صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کی شخصیت زندۂ جاوید شخصیت مانی جاتی ہے۔

سُلطان ٹیپو شہید

وزیر اعظم میر صادق، مشیر اعلیٰ غلام علی اور سپہ سالار میر قمر الدین کی غدّاری۔ غیروں کی ریشہ دوانی، مرہٹوں اور انگریزوں کی یلغار کے باعث چار مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم کے آخری محاصرے میں آزادی کا متوالا، اسلام کا شیدائی، برصغیر پاک و ہند کا واحد مسلم حکمران سلطان ٹیپوؒ عین معرکۂ کارزار میں مقام شہادت پر فائز ہوا۔ اس کا سر تو کٹ گیا مگر باطل کے آگے سرنگوں نہ ہوا کہ ایک مومن کی یہی شان ہے۔ مومن ایک بلند مقصد کے لئے جیتا ہے اور جب اس کے مقصد پر آنچ آنے لگتی ہے تو اپنے سر کا نذرانہ پیش کر کے مقصد کی چنگاری کو شعلہ جوّالہ بنا کر چلا جاتا ہے۔ سب جانے ہی کے لئے آئے ہیں۔ کوئی اس بزم ہستی میں ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آیا۔ مگر کتنے مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنا خون دے کر آزادی، غیرت مندی اور صداقت کے ایسے چراغ روشن کر جاتے ہیں جن کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑتی اور جن کی جوت میں کاروانِ صداقت قیامت تک منزلیں طے کرتا رہے گا۔ حیدر علیؒ کا بیٹا سلطان ٹیپوؒ بھی انہی رہروانِ راہِ مہر و وفا میں سے ایک ہے۔ حیدر علیؒ کی وفات اور ٹیپوؒ کی شہادت کو انگریز مؤرخین نے انگریزوں کی خوش بختی کا سبب قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ جب تک یہ دونوں ہستیاں بقید حیات رہیں انگریزوں کے سر پر ایک تلوار لٹکی رہی۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام کے یہ شیر اور عشق مصطفویؐ کے یہ متوالے نہ خریدے جا سکتے ہیں نہ مرعوب کئے جا سکتے ہیں۔ حیدر علیؒ کی وفات کے بعد حضرت ٹیپو شہید نے جنوبی ہند کی قیادت سنبھالی اور دیکھتے ہی دیکھتے رعایا کو خوش حال بنا دیا۔ سلطان نے سب سے زیادہ کسانوں کے حالات کو سنوارنے کی طرف توجہ کی اور اُس بے چاری مخلوق کو جو ہزاروں سال سے ظالم جاگیرداروں کے مظالم کی چکّی میں پس رہی تھی، خوشحالی سے ہمکنار کیا۔ سلطان ٹیپوؒ نے جاگیردارانہ نظام کو

توڑ کر زمین کسانوں کے سپرد کر دی۔ اس نظام کار کی وجہ سے کئی ایسی زمینیں آباد ہو گئیں جو صدیوں سے ویران پڑی تھیں۔ زرعی حالات سنوارنے کے ساتھ ساتھ سلطان نے تجارت اور صنعت کو بھی فروغ دیا اور ہر قسم کا سامان ملک میں تیار کرنے کا بندوبست کیا۔ فوجی ضروریات کے لیے بھی اسلحہ خود ملک میں تیار ہوتا۔ سلطان ٹیپو شہید نے منشیات کے استعمال پر مکمل پابندی عائد کی۔ شادی بیاہ کی فضول رسموں کو قانوناً ممنوع قرار دیا۔ اور اس قانون پر سختی سے عمل بھی کرایا۔ سلطان بڑی سادہ زندگی گزارتا۔ شریعت کے احکام کی سختی سے پابندی کرتا، سُنّت کا تو وہ والہ وشیدا تھا۔ سلطان اسلام اور صرف اسلام کو وجہ نجات جانتا تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی اسلام کی سربلندی اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ وہ اپنے دَور میں اتحاد بین المسلمین کا سب سے بڑا داعی تھا۔ اس نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ دُنیا بھر کے مسلمان ایک ہو جائیں اور تمام مسلمان تاجدار ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن جائیں۔ مگر افسوس کہ اپنوں ہی نے اس کے سارے عزائم کو ناکام بنا دیا اور ۴ر مئی ۱۷۹۹ء کو جنوبی ہند میں اسلام کی تلوار ٹوٹ گئی ؎

رفتید و لے نہ از دلِ ما

باب ششم

صحابہؓ اور بزرگانِ دینؒ

ایثار کا ایک عجیب نمونہ

ابھی حضور ﷺ عشاء کی نماز سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک مہمان آ گیا۔ مہمان کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ بہت بھوکا ہے۔ سرکار ﷺ نے کاشانۂ نبوت میں سے دریافت کروایا ہر گھر سے ایک ہی جواب آیا کہ پانی کے سوا گھر میں کچھ نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جو شخص آج کی رات اس شخص کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ ایک انصاری کھڑے ہو گئے۔ عرض کیا۔ حضور میں ان کو اپنا مہمان بناؤں گا۔ اور اجنبی کو اپنے گھر لے گئے۔ بیٹھک میں مہمان کو بٹھلایا اور گھر میں جا کر اپنی اہلیہ سے دریافت کیا۔ گھر میں کھانے کو کچھ ہے؟ بیوی نے کہا۔ صرف بچوں کا کھانا ہے۔ " صرف ایک لمحے کا توقف ہوا۔ بیوی سے کہا " بچوں کو بہلا پھسلا کر سلا دو۔" مگر اس سے بھی تو کام نہیں بنے گا؟ بیوی نے کہا۔ اس لیے کہ ہمارے رواج کے مطابق میزبان کو مہمان کے ساتھ کھانا کھانا پڑتا ہے۔ اور کھانا صرف ایک آدمی کو کفایت کر سکتا ہے۔

انصاری سوچ میں پڑ گئے۔ ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ ایک بہت اچھی ترکیب ذہن میں آئی۔ بیوی سے کہا۔ نیک بخت! ایک تدبیر کر۔ وہ یہ کہ جب دستر خوان پر کھانا لگا دیا جائے تو چراغ کی بتی ٹھیک کرنے کے بہانے چراغ بجھا دے پھر میں سب سنبھال لوں گا۔ بیوی نے کہا ٹھیک ہے۔ دسترخوان

پر کھانا لگا دیا گیا۔ میزبان نے مہمان کو دعوت طعام دی۔ جب بھوکا مہمان دستر خوان پر بیٹھ گیا تو انصاری نے اپنی بیوی سے کہا کہ خدا کی بندی ذرا چراغ تو ٹھیک کر دے۔ صحیح طور پر لو نہیں دے رہا ہے بات تو پہلے ہی سے طے شدہ تھی۔ بیوی نے چراغ کی بتی درست کرنے کے بہانے سے ہاتھ بڑھایا اور کمرہ تاریک تھا۔ میزبان نے کہا۔ اللہ کے بندے کھانا شروع کر دیں۔ دوبارہ چراغ جلانے اور بتی کو درست کرنے میں کافی دیر ہو گی۔ مہمان نے عرب کے رواج کے مطابق کہا۔ پہلے آپ بسم اللہ فرمایئے۔ اور میزبان نے شروع کر دیا۔ مگر کھانا کہاں شروع کیا۔ یہ تو صرف کھانا کھانے کی آواز تھی جو انصاری کے منہ سے نکل رہی تھی۔ مہمان کھانے میں مصروف رہا اور غریب سمجھتا رہا کہ میزبان بھی شریک طعام ہے۔ انصاری بھوکا بھی ہے اور دستر خوان پر کھانا بھی رکھا ہوا ہے۔ مگر مجال نہیں کہ ایک لقمہ منہ میں چلا جائے۔ صرف منہ سے کھانا کھانے کی آواز نکل رہی ہے۔ بشریت کا کمال اور ایثار کا ایک ایسا نمونہ ظاہر ہو رہا ہے۔ جس کی مثال تاریخ انسانیت پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اپنی بھوک کو مار رہا ہے۔ اپنی خواہشات کو کچل رہا ہے کہ ایک مومن بھائی شکم سیر ہو جائے۔ بھوک سے بلکتے بچے اب سو چکے ہیں۔ ماں کی ممتا بھی آڑے نہ آئی کہ مومنانہ کردار کے اظہار کا موقع ہے۔ وہ مومن ہی کیا جو اپنے بھائی کے لیے ایثار نہ کر سکے۔ اپنی خواہشات اپنی طلب اور اپنے طبعی و فطری تقاضوں پر اپنے بھائی کی خواہشات اور طلب کو ترجیح نہ دے سکے۔ انصاری کی بھوک ماں کی ممتا اور خاندان کے آرام کی خواہش سب ٹھٹھک کر کھڑے ہیں کہ تقاضائے ایمان آڑے آ گیا ہے۔ مہمان شکم سیر ہو گیا۔ اور دستر خوان اٹھا لیا گیا تو چراغ کی لو بھی ٹھیک ہو گئی۔ اور مکان کا حجرہ بھی روشن ہو گیا۔ مگر حجرے سے زیادہ انصاری کا سینہ اور اس کی نیک بخت بیوی کا دل نور ایمان سے منور تھا۔ صبح ہوئی۔ انصاری اپنے مہمان کے ساتھ نماز میں حاضر ہوا۔ مسلم شریف میں ہے کہ نماز کے بعد سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم

انصاری کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "رات تم نے جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا ہے اس سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوا ہے"
ایک روائیت میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس عمل پہ ملائکہ کے درمیان فخر کیا ہے"

علم اور محنت و ادب

حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے صاحبزادۂ گرامی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے دروازے پہ ہر وقت مشتاقان دید اور طالبانِ علم حدیث کا جمگھٹا رہتا۔ وہ حبر الامہ اور بحر العلم کے لقب سے یاد کیے جاتے۔ جب ان کا وصال ہوا تو وہ طائف میں تھے۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے صاحبزادے جناب محمد نے جنازے کی نماز پڑھائی اور فرمایا کہ آج اس اُمت کا امام ربانی رخصت ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انہیں ممتاز صحابہ کرام کی صف میں جگہ دیتے تھے۔ اور ان سے قران کریم کے اہم نکات پہ گفتگو فرماتے۔ ابن عباس کو یہ مرتبہ یونہی نہیں مل گیا۔ دولت علم بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ تب جا کر علم کا نور قلب کے دہلیز پہ قدم رکھتا ہے۔ محنت شاقہ کے ساتھ ساتھ حصول علم کے لیے ادب بھی شرط ہے۔ مثل مشہور ہے باادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک انصاری سے کہا سرکار ﷺ کی تو وفات ہو گئی۔ تاہم صحابہ کرام کی ایک بہت بڑی جماعت اب بھی موجود ہے آؤ ہم لوگ ان سے پوچھ پوچھ کر مسائل یاد کریں۔ جب اقصائے عرب سے لوگ ہم سے دین کا علم سیکھنے آئیں گے تو انہیں بتلائیں گے۔ انصاری نے کہا۔ صحابہ کرام کی اتنی بڑی جماعت کے ہوتے ہم لوگوں سے کون علم سیکھنے آئے گا؟ خواہ مخواہ محنت کیوں کریں۔ یہ کہہ کر انصاری تو رخصت ہوئے۔ مگر ابن

عباس کے شوق کی آگ بھڑکتی ہی رہی۔ قرآن کی تفسیر سیکھنے کا شوق۔ احادیث کو سُننے اور انہیں یاد کرنے کا شوق۔ بس اگر شوق تھا تو اسی کا کہ سینہ علوم نبوت سے منور ہو جائے۔ اگر سُن پاتے کہ فلاں صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی ہے تو سخت گرمی میں میلوں کا سفر طے کر کے اس کے دروازے پر حاضری دیتے۔ حدیث سُنتے اور مسائل کی تحقیق کرتے۔ معمولی آدمی تو نہیں تھے۔ خانوادۂ نبوت کے ایک معزز فرد تھے۔ دوپہر کے وقت چلچلاتی دھوپ میں اگر کسی انصاری کے دروازے پر پہنچتے اور وہ صاحب سوئے ہوئے ہوتے تو مارے ادب کے ان کا دروازہ کھٹکھٹا کر انہیں بے آرام نہ کرتے بلکہ اپنی چادر چوکھٹ پر رکھ کر بیٹھ جاتے۔ لو چلتی رہتی۔ باد سموم کے جھونکے ابن عباس کے چاند جیسے چہرے کو گرد آلود کرتے رہتے۔ مگر وہ مردِ خدا پہاڑوں جیسے عزم گراں کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا۔ جب انصاری اُٹھتے اور دروازہ کھول کر دیکھتے تو کہتے۔ حضرت آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہو کر کیوں تکلیف فرماتے ہیں۔ ہمیں بلا لیا ہوتا ہم آپ کے در دولت پر خود حاضر ہو کر آپ کو حدیث سنا دیتے مگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک ہی جواب ہوتا۔ میں طالب علم ہوں اس لیے حاضر مجھے ہی ہونا چاہیئے۔ یعنی پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے نہ کہ کنواں پیاسے کے پاس۔ کبھی انصاری کہتے آپ نے ہمیں جگا کیوں نہ لیا۔ ابن عباس فرماتے حصول علم کے لیے ادب شرط اوّلیں ہے۔ میرا دل نہیں چاہا کہ آپ کو بیدار کر کے تکلیف دوں۔ یہ وقت گزر گیا۔ اکثر صحابی اس جہان فانی سے رُخصت ہو گئے۔ مگر ان کا وِرثہ محفوظ تھا۔ چراغ سے چراغ جل رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعہ اُمت کو بکمال حسن و خوبی منتقل ہو رہا تھا۔ ایک جم غفیر تھا کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے دروازے پر جمع تھا۔ علم نبوی کا خزینہ دار دونوں ہاتھوں سے خزانہ لٹا رہا تھا۔ اور لوگ لوٹ رہے تھے۔ مالا مال ہو رہے تھے۔

ایثار کی ایک انوکھی مثال

جنگ اپنے شباب پر ہے۔ سر تن سے جدا ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کا لشکر رومیوں کے ایک عظیم لشکر سے نبرد آزما ہے۔ مگر غازیوں اور مجاہدوں کے چہروں پر شکن ہے نہ تکان۔ سب تازہ دم اور شگفتہ رو۔ شوق شہادت ہے کہ سینوں میں مچل رہا ہے۔ یک بیک ابو جہم بن حذیفہ کو خیال آیا کہ شائد میرا چچا زاد بھائی پیاسا ہو۔ اس لیے کہ اس کے پاس مشکیزہ نہیں تھا۔ مشکیزہ سنبھالا اور میدان کارزار میں اپنے بھائی کو ڈھونڈنے لگے۔ آدھا دن گزر گیا۔ لڑتے جاتے مگر جب موقع ملتا میدان میں نگاہ دوڑا دوڑا کر بھائی کو تلاش کرتے۔ اتفاقاً تھوڑے فاصلے پر ایک شخص کو گرتے دیکھا۔ بالکل ان کے چچا زاد کی طرح تھا۔ لپک کر پہنچے تو دیکھا کہ ان کا چچا زاد بھائی زخموں سے چور سکرات کے عالم میں ہے۔ آواز دی۔ بھائی نے آنکھ کھول دی۔ "العطش" پانی۔ ابو جہم نے مشکیزے کا رُخ اپنے بھائی کی طرف کیا ہی تھا کہ قریب سے آواز آئی "العطش" پانی پلاؤ بھائی نے منہ پھیر لیا۔ نزع کے عالم میں کہا پہلے میرے مسلمان بھائی کو پلا دو تب مجھے دینا۔ ابو جہم کا بیان ہے کہ میں مشکیزہ لیے ہوئے دوسرے زخمی کے پاس پہنچا تو وہ ہشام بن ابی العاص تھے۔ دم اُکھڑ چکا تھا بالکل ہی جاں بلب تھے۔ میرے قدموں کی آہٹ جو سُنی تو آنکھیں کھول دیں۔ پانی پانی۔ میں نے چاہا کہ مشکیزہ ان کے لبوں سے لگا دوں کہ تیسری آواز آئی "العطش العطش" پانی پانی۔ ہشام نے کہا پہلے میرے مسلمان بھائی کو پلاؤ۔ وہ مجھ سے زیادہ پیاسا ہے۔ میں نے کہا تم تو پی لو۔ کہا۔ نہیں۔ یہ غیرت ایمانی کے خلاف ہے کہ میں پانی پی لوں اور میرا مسلمان بھائی پیاسا رہے۔ ناچار مشکیزہ لے کر میں تیسرے زخمی کے پاس پہنچا لیکن افسوس کہ وہ میرے پہنچتے پہنچتے جان جاں آفریں کو سپرد کر چکا تھا۔ میں پلٹا کہ ہشام کو تو آخری وقت میں پانی پلا دوں لیکن ہشام کے پاس پہنچا تو وہ

وفات پا چکے تھے۔ میں آگے بڑھا کہ اپنے چچازاد کے حلق کو آخر وقت میں تر کردوں لیکن وہ بھی راہی ملک بقا ہو چکا تھا۔ تینوں زخمی پیاسے شہید ہو گئے لیکن ایثار واخوت کی ایسی مثال قائم کر گئے کہ جب تک جنگ یرموک کی تاریخ لکھی جاتی رہے گی ایثار و محبت کی یہ داستان شمس و قمر کی طرح اُفق تاریخ پہ درخشندہ رہے گی۔

مُسلمان بھائی کی خیر خواہی

عصر کی نماز ختم ہونے کے بعد بازار میں بھیڑ بھاڑ بڑھ گئی تھی۔ کاروبار کا اصل وقت تو یہی ہوتا ہے اسی لیے قران کریم میں حکم دیا گیا ہے کہ نماز کے اوقات کا خیال رکھا کرو خاص کر صلاۃ وسطی یعنی عصر کی نماز کے وقت کا۔ کیونکہ یہ وقت کاروبار کی تیزی کا ہے۔ نماز پڑھ کر جناب واثلہ بن اُسقع رضی اللہ عنہ بھی بازار میں آ گئے تھے۔ اونٹوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک گاہک آیا اور اس نے ایک اونٹ کی قیمت دریافت کی۔ حضرت واثلہ نے تین سو درہم بتلائے۔ گاہک نے اونٹ کا جائزہ لیا۔ اور جلد ہی اس کی خریداری کا فیصلہ کر لیا۔ تین سو درہم نکال کر حضرت واثلہ کے حوالے کیے۔ اور اونٹ کی نکیل تھام کر روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت واثلہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو سخت پریشان ہو گئے اور دیوانہ وار بازار کا چکر کاٹنے لگے۔ خریدار کا حلیہ بتا کر جو ملتا اس سے اس کے بارے میں دریافت کرتے آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے بڑی مشکل سے وہ گاہک ملا تو حضرت واثلہ نے اس سے دریافت کیا کہ جناب! ذرا یہ تو بتلائیں کہ یہ اونٹ آپ نے کس غرض سے خریدا ہے؟ گاہک نے کہا کیا بات ہے؟ حضرت واثلہ نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ اگر آپ نے یہ اونٹ ذبح کرنے کے لیے لیا ہے تب تو کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن اگر سواری کے لیے خریدا ہے تو میں آپ کو بتلا دوں کہ اس کے ایک پیر میں عیب ہے۔ اور اس کے اگلے ایک

پنجے میں سوراخ ہے۔ خریدار نے کہا کہ جناب میں نے اسے سواری ہی کے لیے خریدا تھا۔ حضرت واثلہ نے فرمایا کہ پھر اس کی قیمت ایک سو درہم کم کر دیں۔ یہ فرما کر حضرت واثلہ نے اسے ایک سو درہم لوٹا دیئے۔ یہ دیکھ کر خریدار کو سخت تعجب ہوا۔ اس نے کہا۔ جناب والا۔ آپ نے تو اپنا نقصان خود ہی کر لیا۔ مستدرک میں ہے کہ جناب واثلہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا بھائی! یہ نقصان تو عارضی ہے۔ آج نقصان ہوا ہے کل انشاء اللہ پورا ہو جائے گا۔ دنیا کی دولت سونا اور چاندی تو آنی جانی چیزیں ہیں۔ آج ہیں کل نہیں رہیں گی۔ مگر ایمان کا کوئی دام نہیں۔ دولت ایمان لٹ گئی تو سمجھ لو کہ سب لٹ گیا۔ ہم نے تو آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اس بات کے لیے بیعت کی تھی۔ کہ زندگی کے ہر لمحے میں اپنے مسلمان بھائی کے خیر خواہ رہیں گے۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کسی شے میں خرابی ہو اور اس خرابی کو بتلائے بغیر کوئی شخص کسی خریدار کے ہاتھ فروخت کر دے تو اس کی قیمت دکاندار کے لیے حرام ہوگی۔ یہ اس لیے کہ اس نے اپنے ایک مسلمان بھائی کو دھوکہ دیدیا۔ جو کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ جو دولت دھوکے اور فریب سے کمائی جاتی ہے وہ دھوکے اور فریب کی راہ سے چلی بھی جاتی ہے۔ حقیقی ایمان تو پہاڑ کی طرح ہوتا ہے جو ہل سکتا ہے نہ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے۔

امانت کی قدر و قیمت

تمیم بن جریر کا بیان ہے کہ ایک دن رباب نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم بصرے والے بھی عجیب لوگ ہو کہ منہ اٹھائے سیدھے میرے پاس مسئلہ پوچھنے چلے آتے ہو حالانکہ تمہارے شہر میں جابر بن زید جیسا فقیہ، محدث، زاہد اور عالم باعمل موجود ہے۔ علم ہونا اور بات ہے اور علم پر عمل کرنا اور بات۔ جابر بن زید عالم باعمل

تھے۔ پوری زندگی حدود شریعت سے قدم باہر نہیں نکالا۔ بصرہ میں مشہور تھا کہ وہ علم کے ایسے چشمہ ہیں جو شاید کبھی خشک نہ ہو گا۔ نوجوانی کے زمانے میں جبکہ وہ محض ایک طالب علم تھے۔ حج کے موقع پر طواف کر رہے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہ ان پر پڑی علم و تقویٰ کا نور ان کی پیشانی پر چمک رہا تھا حضرت ابن عمر نے انہیں اپنے قریب بلایا۔ نام اور وطن پوچھا اور فرمایا جابر بن زید ایک دن تو بصرہ کا فقیہ اور مفتی بنے گا۔ یاد رکھنا فتویٰ دیتے وقت قرآن و سُنت کے مطابق فتویٰ دینا ورنہ تو خود بھی ہلاک ہو جائے گا۔ اور دوسروں کو بھی ہلاک و گمراہ کر دے گا۔ سیدنا ابن عمر نے کچھ اس محبت و شفقت سے نصیحت فرمائی کہ حضرت جابر بن زید کے دل میں بیٹھ گئی۔ آخر وہ وقت آن پہنچا جس کی حضرت ابن عمر نے پیش گوئی فرمائی تھی اور جابر کے علم و فضل۔ تقویٰ و تفقہ کا شہرہ عرب و عراق میں پھیل گیا۔ ایک رات حضرت جابر بن زید اپنے اہل و عیال کے ساتھ اپنے ایک عزیز کے مکان سے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ خالی ہاتھ تھے۔ راستے میں کتوں نے تنگ کرنا شروع کیا۔ اندیشہ ہوا کہ کہیں کتے بچوں کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ ساتھ ہی ایک جھونپڑا تھا۔ جناب جابر نے اس میں سے کھجور کی ایک شاخ کھینچ کر نکال لی۔ کھجور کی لکڑی دیکھ کر کتے بھاگ گئے۔ گھر پہنچ کر حضرت جابر بن زید نے اپنے لڑکوں سے کہا کہ شاخ کے اس ٹکڑے کو حفاظت سے رکھو کل صبح جھونپڑے کے مالک کو پہنچا دیں گے۔ بچوں نے کہا ابا جان! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ کھجور کی یہ شاخ ایسی کونسی قیمتی چیز ہے کہ اب آپ کل صبح اسے لوٹانے کے لیے جائیں گے؟ سیدنا جابر بن زید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا بچو! اگر ہر گزرنے والا شخص اسی طرح جھونپڑے سے ایک ایک شاخ کھینچ کھینچ لیجانے لگے تب تو دوسرے دن جھونپڑے کا وجود ہی نہیں رہے گا۔

میرے بیٹو! امانت امانت ہوتی ہے چاہے قیمتی ہو یا حقیر۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا کمالِ ایثار

بھانجے سے خالہ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ دل ہی دل میں کڑھتے رہتے۔ مگر کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ ادب مانع تھا۔ ادب اور محبت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ ان کی پرورش و پرداخت سب کچھ خالہ ہی کے گھر میں ہوئی تھی۔ اس لئے سچ پوچھئے تو وہ خالہ سے زیادہ ان کی ماں تھی۔ مگر ان کے طرز عمل کو دیکھ کر دکھ ہوتا۔ فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو گھر کے صحن میں درھم و دینار اور سونے چاندی کا ڈھیر پڑا رہتا مگر شام ہوتے ہوتے ایک پیسہ بھی موجود نہ ہوتا۔ پانی سے روزہ افطار کر کے فاقے کے ساتھ سو رہتیں۔ حالانکہ اگر چاہتیں تو اپنے لیے بھی کچھ رکھ لیتیں۔ مگر وہ ایسا نہ کرتیں۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ گھر میں ایک روٹی موجود تھی۔ کہ دروازے پر ایک سائل آیا خادمہ سے کہا کہ روٹی سائل کو دیدو۔ خادمہ نے عرض کیا ام المومنین! آپ روزے سے ہیں۔ افطار کا وقت قریب ہے۔ یہ روٹی اس لیے رکھ چھوڑی تھی کہ افطار کے وقت آپ کی خدمت میں پیش کروں گی اور آپ فرما رہی ہیں کہ سائل کو دیدو۔ اگر روٹی سائل کو دیدونگی تو آپ کس چیز سے افطار کریں گی۔ صدیقہؓ کائنات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ فرمایا۔ سائل کا سوال پورا کردو۔ میرا اللہ مالک ہے۔ سائل روٹی لے کر چلا گیا۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے پانی سے افطار کر لیا اور رات فاقے سے بسر کی۔ یہ انداز دیکھ کر ڈرتے ڈرتے ایک دن ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی خالہ سے عرض کیا خالہ جان! ذرا ہاتھ روک کر خرچ کرنا چاہیئے۔ آپ تو سب کچھ خیرات کر دیتی ہیں اور پھر خود تکلیف اٹھاتی ہیں۔ حضرت عبداللہ کی باتیں سُن کر صدیقہ آگ بگولا ہو گیئں فرمایا اللہ کے بندے مجھے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے منع کرتا ہے۔ تجھ جیسے آدمی سے تو بات بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ اتنا فرمایا اور عبداللہ بن زبیر سے بات نہ کرنے کی قسم کھا

لی. حضرت عبداللہ کو تو ایسا معلوم ہوُا جیسے کہ ان کی دنیا تاریک ہو گئی ہو اس لیے کہ وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بے حد محبت کرتے تھے۔ کیوں نہ کرتے ام المومنین نے اپنی اولاد کی طرح ان کی پرورش کی تھی۔ جب صدمہ ناقابل برداشت ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ننہالی بزرگوں کو سفارشی بنا کر سیدہ کے گھر لائے۔ یہ دونوں بزرگ پردے کے باہر بیٹھے ام المومنین سے بات چیت کر رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے برداشت نہ ہو سکا اور پردے کے اندر جا کر خالہ کے قدموں میں گر پڑے اور زار و قطار رونے لگے۔ ان بزرگوں نے بھی سفارش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیثیں سنائیں جو ترک گفتگو کی ممانعت میں وارد ہوئی ہیں آخر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ کو سُن کر ام المومنین پر بھی رقت طاری ہو گئی اور حضرت عبداللہ بن زبیر سے بولنے لگیں۔ سیدہ صدیقہ نے قسم توڑ دی تھی۔ اس لیے قسم کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ ایک غلام کو آزاد کر دینا کافی تھا۔ مگر سیدہ نے چالیس غلام آزاد کئے۔ پھر بھی اطمینان نہ ہوتا۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ جب کبھی آپ کو قسم توڑ دینے کا خیال آجاتا تو اتنا روتیں کہ آنسوؤں سے ڈوپٹہ تر ہو جاتا۔ صدیقہ لقب تھا تو زندگی کا ہر لمحہ صداقت و ایثار کے سانچے میں ڈھلا ہوُا تھا۔ نور و ہدایت کا سانچہ بحرِ جود و کرم — آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

ہمدردی و غمخواری

حضرت ابوذر غفاری جیسے جلیل القدر صحابی کو ایک پھٹے پرانے کمبل میں دیکھ کر اجنبی کو سخت تعجب ہوُا۔ اس نے پوچھا حضرت! کیا اس بوسیدہ کمبل کے سوا آپ کے پاس کوئی کپڑا نہ تھا کہ آپ اس حال میں نظر آ رہے ہیں۔ فرمایا اگر کوئی دوسرا کپڑا ہوتا تو تم میرے بدن پر ضرور دیکھتے۔ اجنبی سے برداشت نہ ہوُا۔ اس نے کہا جناب گستاخی معاف! ابھی تو دو دن ہوئے میں نے ایک نہایت عمدہ

جوڑا آپ کے بدن پر دیکھا تھا۔ وہ کیا ہوا۔ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ تم ٹھیک کہتے ہو مگر میں نے ایک شخص کو دیکھا جو مجھ سے زیادہ اس جوڑے کا ضرورت مند تھا میں نے اسے دیدیا۔ کہ اخوت اسلامی کا تقاضا یہی تھا اجنبی ہنس پڑا۔ جناب! ایسا تو نہ فرمائیں۔ بھلا آپ سے زیادہ اس کپڑے کا محتاج کون ہو سکتا ہے؟ آپ کے پاس تو بس یہی ایک پھٹا پرانا کمبل ہے۔ اجنبی کا اصرار اور اس کی ضد دیکھ کر ابوذر غفاری کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اور نہائیت ہی کرخت لہجے میں فرمایا اے شخص! اللہ تیری مغفرت فرمائے۔ تو دنیا کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ عمدہ عمدہ لباس۔ اچھے اچھے کھانے۔ آرام دہ مکان خدم و حشم۔ شان و شوکت ہی تیرے نزدیک سب کچھ ہے۔ اجنبی! یہ ساری چیزیں دنیا ہی میں رہ جانے والی ہیں۔ انسان کا خلوص۔ اس کا اخلاق۔ اس کی شرافت۔ ہمدردی مواسات۔ اچھے بھائی کی غمخواری کسی کی مصیبت میں کام آنا۔ اور کمزوروں غریبوں کی دستگیری کرنا یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں لے کر انسان سفر آخرت پر روانہ ہوتا اور اللہ کے مقبول بندوں کی جماعت میں شامل ہوتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے پاس تو بوسیدہ سہی یہ کمبل بھی موجود ہے۔ جسے لپیٹ کر میں نماز پڑھ سکتا ہوں اس شخص کے پاس تو اس طرح کا کوئی بوسیدہ کمبل بھی نہ تھا۔ کہ وہ اپنا تن ڈھانکتا میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے۔ میں نے اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دی۔ اور وہ عمدہ جوڑا جو تو نے میرے بدن پر دیکھا تھا اس کے حوالے کر دیا۔ اے شخص سن! میرے پاس بکریاں ہیں جن کا میں دودھ پیتا ہوں میرے پاس ایک گدھا ہے جس پر سامان لادتا ہوں۔ غلام ہیں جو میری خدمت کرتے ہیں۔ عید بقر عید کے موقع پر پہننے کے لیے میرے پاس ایک عبا ہے۔ تم خود غور کرو کہ ان نعمتوں سے بڑھ کر بھی کوئی نعمت ہو سکتی ہے۔ بلکہ میرے پاس عید بقر عید کے لیے جو عبا ہے میں سمجھتا ہوں کہ میری ضرورت سے زائد ہے۔ مجھے تو یہی ڈر سمایا ہوا

ہے کہ کہیں کل قیامت کے دن مجھ سے اس زائد از ضرورت عبا کے بارے میں سوال نہ کیا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر میرا محاسبہ ہوا تو میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا۔ میرے دوست! دنیا سے اتنا ہی لینا چاہیئے جتنا کہ ضروری ہو۔ ورنہ طلب کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے۔ یہی ہے ہمارے خلیل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم۔

حکیم بن حزام اور ایفائے عہد

زمانۂ جاہلیت ہی سے حضرت حکیم بن حزام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ بعثت کے بعد آپ نے حکیم پر اسلام پیش کیا لیکن انہوں نے اس وقت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک دن حکیم نے ایک قیمتی حلہ خدمت اقدس میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا "ہم مشرکین سے ہدیہ نہیں لیتے اگر آپ چاہیں تو قیمت ادا کر کے ہم یہ حلہ لے سکتے ہیں۔" حکیم بن حزام نامراد واپس آ گئے۔ فتح مکہ کے وقت جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ کے قریب پہنچنے لگے تو آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ مجھے حکیم کا شرک میں مبتلا رہنا سخت ناگوار ہے میری تمنا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں اور ان کے ساتھ تین اور آدمیوں کے بھی نام لیے۔ اللہ تعالیٰ کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمنا کی تھی۔ رد کیسے ہو سکتی تھی۔ حکیم کا سینہ ایمان کے لیے کھول دیا گیا۔ اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے۔ زبان پر کلمہ جاری ہے اور آنکھوں سے سیل اشک رواں۔ صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ تاہم حکیم کی روح نے جب سے حلاوت ایمانی کا مزا چکھا تھا۔ وہ اکثر تاخیر سے مسلمان ہونے پر افسوس کیا کرتے تھے۔ کبھی تنہائی میں بیٹھ کر آنسو بہایا کرتے کہ میں کفر کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا۔ غزوۂ بدر گزر گیا۔ معرکہ احد گزرا۔ خندق کی جنگ گزر گئی۔

کوئی غازی بنا۔ کوئی مقام شہادت پر فائز ہو کر ابد الآباد تک کے لیے فائز المرام ٹھہرا۔ اور میں پیچھے رہ گیا۔

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین پیش آیا تو حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جوہر شجاعت دکھانے کا موقع ملا۔ سابقہ کوتاہی کی تلافی تو بھلا کیا کرتے۔ تاہم کسی قدر دل کی آرزو نکل گئی۔ ایک مرتبہ حضرت حکیم مالی مشکلات سے دوچار ہو گئے۔ جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو دربار گہربار نبوت میں حاضر ہوئے۔ مشکلات بیان کیں تو آپ نے مال زکوٰۃ سے ان کی امداد فرما دی۔ لیکن کچھ دنوں بعد پھر وہی صورت حال پیش آ گئی پھر حاضر ہوئے اور امداد کا سوال کیا۔ آپ نے پھر کچھ رقوم عطا فرمائیں لیکن ساتھ ہی ارشاد فرمایا حکیم! یہ مال لبھانیوالا اور بڑی شیریں چیز ہے جو شخص اسے استغناء کے ساتھ حاصل کرتا ہے اس کے لیے اس میں برکت ہوتی ہے۔ اور جو اسی کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اس مال کو طمع کے ساتھ حاصل کرتا ہے اس کے لیے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اور ایسا ہو جاتا ہے جیسے کہ کوئی شخص کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے۔ یاد رکھو کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے افضل ہوتا ہے۔ زبانِ نبوت سے یہ ارشادات صادر ہو رہے تھے اور حکیم کے دل کی گہرائیوں میں اُترتے چلے جا رہے تھے۔ ارشادات ختم ہوئے تو حکیم نے عرض کیا۔ حضور! اب آپ کے بعد میں کسی کو کچھ دینے کی تکلیف نہ دوں گا۔ اس کے بعد ساری زندگی کسی نے حکیم کو کسی سے کچھ لیتے ہوئے نہ دیکھا۔ حتیٰ کہ وہ مال غنیمت میں بھی اپنا حصہ نہ لیتے۔ بارہا سیدنا ابوبکر صدیق و سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اپنے زمانۂ خلافت میں انہیں مال غنیمت میں سے حصہ دینے کی کوشش کی مگر حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہی حدیث سنا کر عذر کر دیتے کہ میں مہبط ■ حی صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کر چکا ہوں۔ آخری دم تک وعدہ وفا کروں گا۔ تربت میں جانے تک۔

معیارِ فضیلت

جنگ قادسیہ کے آغاز سے پہلے ایرانیوں کے سپہ سالار نے خواہش ظاہر کی کہ مسلمانوں کا کوئی نمائندہ آکر ہم سے گفتگو کرے ممکن ہے وہ گفتگو نتیجہ خیز ثابت ہو اور معاملات طے پا جائیں۔ چونکہ اسلام اپنی نہاد اور فطرت میں امن وسلامتی کا دین ہے۔ خوامخواہ کی خونریزی اور ملک گیری اس کا مقصود نہیں اس لیے مسلمانوں نے رستم کی اس خواہش کا خیر مقدم کیا۔ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمانوں کے نمائندہ بن کر تشریف لائے۔ رستم کو جب معلوم ہوا کہ آج مسلمانوں کا سفیر آ رہا ہے تو اس نے خصوصی طور پر اپنے دربار کو سجایا۔ تمام بڑے بڑے سردار لباس پہن کر دربار میں آئے ہوئے تھے۔ ہر سردار اور اس کے حواری مسلح تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دربار کی شان وشوکت اور درباریوں کے اسلحے کو دیکھ کر مسلمان سفیر مرعوب ہو جائے گا۔ اور اس طرح اسلامی لشکر واپس ہو جائے گا۔ لیکن انہیں پتہ نہیں تھا کہ جو قوم ایک مرتبہ خدائے واحد ذوالجلال والاکرام کے حضور سجدہ ریز ہو کر اس کی بندگی وغلامی کا قلاوہ اپنی گردن میں ڈال لیتی ہے۔ اس کی نگاہ میں کائنات کی ہر قوت واقتدار ہیچ ہو جاتا ہے۔ نہ جلال پادشاہی اسے مرعوب کر سکتا ہے نہ سونے اور چاندی کی چمک دمک۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتہائی بے نیازی سے رستم کے دربار میں تشریف لائے۔ اور آتے ہی رستم کے ساتھ اس کے تخت پر بیٹھ گئے۔ مغیرہ کا یہ طرز دربار کے چوبداروں کو سخت ناگوار گزرا اور انہوں نے جناب مغیرہ کو تخت سے اتار دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارے پاس تو یہ خبریں پہنچتی رہی ہیں کہ تم ایرانی لوگ بڑے عقل مند اور دانا ہو مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ تم نرے احمق اور

غیر مہذب لوگ ہو۔ میں یہاں خود تو نہیں آیا۔ تم نے مجھے بلایا ہے تو آیا ہوں۔ کیا گھر بلائے مہمان کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیئے۔ مہمان خواہ کوئی بھی ہو اس کا احترام تو ہماری شریعت میں واجب ہے۔ اگر تمہیں یہی سلوک کرنا تھا تو مجھے پہلے ہی بتلا دیئے ہوتے کہ تم میں سے بعض خدا ہیں۔ اور باقی سب ان کے بندے بن کر اپنے ہی جیسے گوشت پوست سے بنے ہوئے انسان کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ آج مجھے اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ تم ضرور مغلوب ہو گے کیونکہ مغلوبیت و مقہوریت تمہاری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ کوئی بھی حکومت و سلطنت اس طرح کے بودے اصولوں کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔ ہمارا دین ہمیں حریت فکر، غیرت اور مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک معیار فضیلت نہ خاندان ہے نہ دنیوی مال و متاع اور نہ مادی وجاہت۔ اسلام میں فضیلت کا صرف ایک معیار ہے اور وہ ہے خوف خدا۔ اطاعت رسول اور بس۔ حضرت مغیرہ جب یہ جملے ادا فرما رہے تھے تو بعض ستم زدہ ایرانی ضبط نہ کر سکے اور بول اٹھے یہ عربی جو کہہ رہا ہے بجا اور درست کہہ رہا ہے۔

رفعتِ صحابہ کرامؓ

حضرت جابر بن سُلیم رضی اللہ عنہ نے دربار نبوت میں اپنی پہلی حاضری کی روداد بیان کرتے ہوئے بتلایا کہ وہ عجیب روح افزا اور دل و دماغ کو فرحت و انبساط سے معمور کر دینے والا منظر تھا۔ جب میں پہلے پہل سرورِ کونین، ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار گہر بار میں حاضر ہوا تھا۔ سیدھے سادھے لوگ۔ نورانی چہرے والے۔ وقار و احترام سے ایک حسین و جمیل شخص کے گرد بیٹھے ہیں۔ ان کی زبان مبارک سے جو کلمہ نکلتا ہے اسے وہ لوگ حرز جان بناتے ہیں۔ جو حکم صادر ہو رہا ہے سر آنکھوں پہ لیتے ہیں۔ نہ کہیں سستی ہے نہ مداہنت ہر طرف اطاعت و اتباع۔ والعیت و حکم برداری۔ میں نے ایک شخص سے دریافت کیا۔" یہ کون

صاحب ہیں۔ اس نے کہا۔ یہی ہیں اللہ کے رسول حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یہ جان کر میں نے دو مرتبہ کہا اے اللہ کے رسول علیک السلام۔ آپ نے جواب
نہ دیا۔ پھر فرمایا۔ "علیک السلام" نہ کہو کہ یہ مردوں کا سلام السلام علیک کہو۔
میں نے دریافت کیا۔ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ارشاد ہوا۔ ہاں میں اس
اللہ کا رسول ہوں جسے تم تکلیف میں پکارتے ہو اور وہ تمہاری تکلیف دور کر
دیتا ہے۔ خشک سالی میں جس سے تم دعا کرتے ہو اور وہ تمہاری کھیتیوں کو سیراب
کر دیتا ہے۔ جب تم لق و دق صحرا اور بے نشان بنجر میں ہوتے ہو اور تمہاری
سواری گم ہو جاتی ہے۔ تم ہمت ہارنے لگتے ہو پھر انتہائی اضطراب و کرب میں
تم اس سے دعا کرتے ہو تو وہ تمہاری کھوئی ہوئی سواری کو لوٹا دیتا ہے۔ میں اسی
خدا کا بندہ اور اسی کا رسول ہوں۔ اسی کی طرف تمہیں بلانے اور اسی کے
آستانے پر تمہیں جھکانے آیا ہوں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک!
مجھے کوئی نصیحت فرماؤ ارشاد ہوا۔ "کسی کو بُرا نہ کہو" جابر کا بیان ہے کہ ایسا
معلوم ہوا جیسے کہ آپ کا یہ جملہ میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔ ایسا اثر ہوا
کہ اس کے بعد سے آج تک میں نے کسی شریف یا رذیل۔ آزاد یا غلام حتیٰ کہ
کسی جانور کو بھی بُرا نہیں کہا۔ اس کے بعد آپ نے نصیحت فرمائی کہ "کسی
چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اسے کئے جاؤ اور ہاں! دیکھو اگر اپنے
کسی مسلمان بھائی سے بات کرو تو تمہارا چہرہ کشادہ اور کھلا ہوا ہو یعنی کراہت
کے آثار تمہارے چہرے پر نہ ہوں۔ اور یہ بھی نیکی ہے کہ تمہارا تہ بند آدھی پنڈلی
تک ہو اگر یہ نہیں تو کم از کم ٹخنے سے اونچا ضرور ہو کیونکہ تہ بند کو لٹکانا غرور
کی نشانی ہے اور یاد رکھو کہ غرور کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ اگر بالفرض
تمہیں کوئی گالی دے یا تمہاری کسی برائی پر جو وہ جانتا ہے تمہیں عار دلائے
تو خبردار خبردار تم ان کی کسی ایسی برائی پر جو تمہارے علم میں ہو اس کو عار نہ دلا
کیونکہ اس کا وبال اس کی گردن پر ہو گا۔

یہی وہ دلوں کو موہ لینے والے جلے تھے جنہوں نے ریگزار عرب کے اجڈ اور گنوار بدوؤں کو قوموں کا امام اور امتوں کا نگہبان بنا دیا تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ایک ایک کلمے کو دستور حیات قرار دیا اور اس پر عمل کیا۔

اصل ضرورت

اگر اس نے صحبت میں رہنے اور خدمت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو یہ کوئی بُری بات نہیں تھی۔ بھلی صحبت اور اللہ والوں کا قرب بھلا میسّر کہاں آتا ہے۔ وہ قبیلہ بنو سُلیمؓ کا آدمی تھا۔ سرکار دو عالم ﷺ کی وفات کے بعد گھوم پھر کر اس کی نظر جس آدمی پر ٹکی تھی وہ کوئی معمولی آدمی تو نہیں تھا۔ بعض روائیتوں کے مطابق پانچواں اور بعض کے مطابق چھٹا مسلمان تھا۔ نبی ﷺ کے عشق میں والہ و شیدا، ساری دنیا سے بے نیاز۔ اسرار معرفت کا خزینہ دار اور صرف اپنے رب کی بارگاہ عالی میں سر نیاز خم کرنے والا۔ اس کا فقر آج بھی ضرب المثل ہے اور قیامت تک اُمت کے لیے ایک نمونہ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ربذہ کے ایک غیر آباد علاقے میں اپنے ایک ناتواں سے غلام اور ایک بیوی کے ساتھ مقیم تھا۔ چند اونٹ تھے جنہیں غلام چرایا کرتا اور صبر و قناعت کے ساتھ یہ چھوٹا سا کنبہ گزر اوقات کرتا۔ سُلیمی نے تمنا ظاہر کی کہ میں آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں کہ انوار نبوت کی جو کرنیں آپ اپنے سینۂ بے کینہ میں سمیٹے پھرتے ہیں ان سے استفادہ کروں اور اپنی عاقبت سنوار لوں۔ شاید اس طرح مغفرت کا کوئی سامان ہو جائے۔ میں بے کار نہیں رہونگا۔ اونٹوں کے چرانے میں آپ کے غلام کی مدد کروں گا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا "میرا دوست وہ ہے جو میری اطاعت کرے۔ اگر تم بھی میری اطاعت کے لیے تیار ہو تو بسم اللہ شوق

سے میرے ساتھ رہو۔ اجنبی نے کہا جناب والا آپ کس چیز میں اطاعت چاہتے ہیں؟ فرمایا جب میں اپنے مال میں سے خرچ کرنے کا حکم دوں تو عمدہ سے عمدہ مال خرچ کیا جائے۔ سلیمی نے کہا منظور اور ساتھ میں رہنے لگا۔ اتفاقاً ایک دن سلیمی نے بتلایا کہ چشمے پر کچھ لوگ رہتے ہیں۔ وہ بڑے غریب اور کھانے کھانے کو محتاج ہیں۔ حضرت ابوذر نے فرمایا۔ ٹھیک۔ ابھی جاؤ اور میرے اونٹوں میں سے ایک اونٹ لے آؤ کہ اسے ذبح کر کے ان کے کھانے کا انتظام کروں۔ اجنبی کا بیان ہے کہ میں گیا تو ایک بہت عمدہ اونٹ تھا وہ قیمتی اور کار آمد تھا میں نے سوچا آخر ذبح ہی تو کرنا ہے یہ اونٹ زیادہ کار آمد ہے اسے چھوڑ دینا چاہیئے اور ایک کم درجے کی اونٹنی لے کر چلا آیا۔ حضرت ابوذر نے اونٹنی کو دیکھا تو فرمایا "تم نے خیانت کی" میں سمجھ گیا۔ واپس آیا اور اسی عمدہ اور کار آمد اونٹ کو لے گیا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے ذبح کر کے محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر مجھے بلا کر دریافت کیا یہ تو بتاؤ کہ تم نے میری وصیت جان بوجھ کر چھوڑی تھی یا بھول گئے تھے؟ میں نے سچی سچی بات بتلادی تھی اور کہہ دیا کہ وہ اونٹ چونکہ بہت قیمتی اور کار آمد تھا اس لیے میں نے اسے آپ کی ضرورت کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ حضرت ابوذر نے فرمایا میں اپنی ضرورت کا دن بتلاؤں میری ضرورت کا دن وہ دن ہے جس دن میں قبر کے گڑھے میں اکیلا ڈالا جاؤں گا۔ میرے رفیق یاد رکھو مال کے اندر تین حصے دار ہیں ایک تقدیر جو مال لیجانے میں کسی چیز کا انتظار نہیں کرتی۔ اچھا برا ہر قسم کا مال لیجاتی ہے۔ دوسرا وارث جو اس انتظار میں ہے کہ تو مرے تو وہ مال پر قابض ہو جائے اور تیسرا حصہ دار تو خود ہے اگر ہو سکے تو جو مال سب سے زیادہ پسندیدہ ہو اسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دے کہ یہی تیرے کام آنے والا ہے۔

خلوص نیّت

دنیا کے بازار میں ہو سکتا ہے کہ کھوٹا سکہ چل جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں

صرف خالص عقیدہ خالص عمل اور خالص نیت مقبول ہے۔ اگر نیت عقیدے اور عمل میں معمولی سا بھی کھوٹ ہو تو بڑے سے بڑے عمل کو رد کر دیا جائے گا۔ کہ وہ دربار دربار عالی ہے۔ یہاں الفاظ کی نہیں جذبے کی قدر ہوتی ہے۔ ظاہر کو نہیں باطن کو دیکھا جاتا ہے۔ صورت کو نہیں ارادوں کو معیار قبولیت بنایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر اور علیم بذات الصدور ہے۔ اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں۔ کسی نے حضرت حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا خدا کی رضا کس چیز میں ہے۔ آپ نے جواب دیا خدا کی رضا اس دل میں ہے۔ جس میں نفاق کا غبار نہیں کیونکہ نفاق کا محبت و موافقت سے کوئی تعلق نہیں جہاں نفاق ہے وہاں محبت نہیں اور جہاں محبت ہو وہاں نفاق نہیں سینے کو ریب و ارتیاب، بے یقینی اور تشکیک سے پاک کرو تب اللہ تعالیٰ کی محبت کا نور اور معرفت کی ضیاء تمہارے نہاں خانۂ قلب میں داخل ہوگی۔ حبشی بلال کا رنگ تو کالا تھا۔ زبان عجمی تھی۔ معاشرتی حیثیت تو غلام کی تھی لیکن جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں ان کی وفات کی خبر مدینہ منورہ پہنچی تو امیر المومنین خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسجد نبوی کے منبر پر سے اعلان کیا کہ لوگو! ہمارے سردار حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہو گئی۔ اس لیے کہ بلال عاشقوں کے سردار تھے۔ راہ وفا کے وہ رہرو جسے مصائب و آلام اور ابتلاء و آزمائش کے لرزہ خیز طوفان بھی صراط مستقیم سے نہ ہٹا سکے۔ ایک مرتبہ جو احد کا کلمہ زبان سے نکالا تو پھر اس پر ڈٹ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اِقلیم عشق کے تاجدار قرار پائے اور شب معراج میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوتوں کی آہٹ جنت میں سُنی۔ قبولیت کی راہ میں بلال کا رنگ۔ ان کی عجمیت۔ ان کی زبان اور معاشرتی حیثیت حائل نہ ہو سکی کہ دل جلوہ گاہِ عشق مصطفوی تھا۔ حضرت حبیب

عجمی رحمتہ اللہ علیہ نے ابتداءً حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر توبہ کی اور ان سے اکتساب فیض کیا تھا۔ قلب سلیم پایا تھا۔ جلد ہی منازل عرفان طے کر لیے۔ مگر چونکہ عجمی تھے۔ اس لیے عربی زبان پر دسترس نہیں تھی۔ بلکہ قرآن مجید بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ایک دن خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ شام کے وقت حبیب عجمی کے گھر آئے۔ حبیب مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے مگر چونکہ وہ قرآن مجید پوری صحت کے ساتھ نہیں پڑھ رہے تھے اس لیے خواجہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ان کی اقتدا نہ کی اور اپنی نماز الگ پڑھی۔ اس رات حضرت حسن بصری نے خواب میں خود کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں پایا سوال کیا بارِ خدایا آپ کی رضا کس چیز میں ہے؟ جواب ملا۔ حسن بصری! میری رضا تو تو نے پالی تھی مگر افسوس کہ تو نے اس کی قدر نہ کی۔ سیدنا حسن بصری نے دریافت کیا خدایا! وہ کیا تھی؟ جواب ملا۔ میری رضا یہ تھی کہ تو صحت نیت کے ساتھ بلا تامل حبیب عجمی کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ حسن! الفاظ اور طرز ادا کا میرے ہاں اعتبار نہیں خلوصِ نیت۔ صدقِ جذبہ۔ عشقِ کامل۔ اضطرابِ مسلسل اور طلبِ صادق میری بارگاہ میں معیار قبولیت ہیں۔

عبادات کا صحیح مفہوم

عین حالت طواف میں ایک حاجت مند نے اپنی حاجت امام کے سامنے پیش کر دی۔ ایک لمحے کا تامل تو ضرور ہوا کہ اس کی حاجت پوری کروں یا پہلے طواف مکمل کروں مگر امام کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ ہوئی۔ حاجت مند سے کہا کہ میرے ساتھ چلو اور طواف چھوڑ دیا۔ طواف میں سات چکر لگائے جاتے ہیں ابھی تو چار ہی چکر ہوئے تھے۔ اس کا خیال نہ فرمایا اور چلے گئے۔ اس لیے کہ انہیں اس بات کا پتہ تھا کہ کسی حاجت مند کی حاجت روائی اور درد مند

کی ہمدردی افضل ترین عبادت ہے۔ ان کی شخصیت معمولی شخصیت تو نہ تھی۔ انسان تو انسان مکہ کے سنگریزے بھی ان کے قدموں کی آہٹ کو پہچانتے تھے۔ اُن کی تربیت رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش محبت میں ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں جوانانِ جنت کے سرداروں میں شمار فرمایا تھا۔ اس لیے ان سے بڑھ کر کون عبادت کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہو سکتا تھا۔ سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طواف چھوڑ دیا اور قیام گاہ پر تشریف لے گئے، حاجت مند کی حاجت پوری کی اور واپس آکر طواف کے چھوٹے ہوئے چکروں کو پورا کیا۔ ایک شخص نے سوال کر دیا۔ حضرت! آپ نے طواف چھوڑ دیا اور اس آدمی کے ساتھ چلے گئے۔ کیا اتنی مقدس عبادت کو چھوڑ کر کسی کی حاجت روائی کے لیے چلے جانا درست ہے؟

امام حسن کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ علم و بردباری سے نوازا تھا۔ نہ آپ کی تیوری پر بل آئے نہ آپ نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا۔ فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت پوری کرنے کے لیے جائے اور اس کی حاجت پوری ہو جائے تو جانے والے کو ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملتا ہے اور اگر نہیں پوری ہوتی تو بھی ایک عمرے کا ثواب ملتا ہے۔ تم ہی بتلاؤ کہ بھلا میں کیوں نہ جاتا اِس صورت میں تو میں نے ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب حاصل کیا اور پھر واپس آکر اپنا طواف بھی پورا کر لیا۔ اب سائل کی سمجھ میں آگیا کہ اسلام میں عبادت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

احساسِ ذمّہ داری

سیّدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ اپنے مکان میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ باہر تشریف لائے اور اس شخص کو اپنے

ساتھ نہائیت اعزاز و تکریم سے مکان میں لے گئے۔ اور اس کی خاطر مدارات فرمائی۔ جب اس کی مدارات سے فارغ ہوئے تو اس سے دریافت فرمایا کہ آپ نے کس غرض سے قدم رنجہ فرمایا۔ اس نے کہا۔ اے فرزند رسول! میں مقروض ہوں۔ میرے ذمے چار سو درہم چاندی کے واجب الاداء قرض ہیں۔ قرض خواہوں کا سخت تقاضا ہے۔ ادھر چند دنوں سے میں پریشانی میں ہوں۔ میرے اعزا و اقرباء بھی ہیں اور دوست احباب بھی۔ مگر میں کسی سے سوال کر کے رسوا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ آپ کا دروازہ رحمتہ للعالمین ﷺ کا دروازہ ہے۔ جو بے پناہوں کی پناہ اور بے آسروں کے آسرا تھے۔ آپ کی رگوں میں اس سخی کا خون دوڑ رہا ہے جس کے دروازے سے کوئی حاجت مند محروم نہیں گیا۔ آخر سوچتے سوچتے میں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ آپ ہی کے دروازے پر دستک دوں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میں محروم نہیں کیا جاؤں گا۔ جناب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اس کے معروضات نہائیت صبر و سکون سے سُنے اور اپنے غلام کو بلا کر حکم دیا کہ اسے ابھی چار سو درہم چاندی کے دیدو۔ غلام چار سو درہم لایا اور سائل کے حوالے کر دیئے۔ وہ شخص درہم لے کر چلا گیا تو امام روتے ہوئے اُٹھے اور گھر میں جانے لگے۔ غلاموں نے جو آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو انہیں سخت حیرانی ہوئی۔ آخر ایک غلام سے رہا نہ گیا اور اس نے امام سے سوال کر ہی لیا کہ حضور آپ رو کیوں رہے ہیں؟ کسی نے آپ کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ سائل آپ کے خانوادۂ عالیہ کی روائیت کے مطابق آپ کے دروازے سے خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ اس نے جتنا مطالبہ کیا تھا اتنا آپ نے عطا فرما دیا پھر رونے کی کیا وجہ ہے۔

امام نے فرمایا۔ میں اس لیے رو رہا ہوں کہ اس شخص کا حال دریافت کرنے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی اور آخر کار اس کو سوال کرنے کی ذلت برداشت کرنا پڑی۔ میں آل نبی ہوں۔ نبی ﷺ کی اُمت کی خبر گیری میرا فرض ہے۔

اگر قرض کی ادائیگی میں مجھ سے غفلت نہ ہوتی تو ایک مسلمان کو میرے سامنے سوال کر کے ذلت برداشت کرنا پڑتی۔ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی مسلمان کی عزت اور اُس کے وقار کو ملحوظ رکھے اور وہ اپنے کسی بھائی کو اُن حالات سے دوچار نہ ہونے دے جن حالات سے دوچار ہونے کے بعد مسلمان بھائی کسی ذلت یا رسوائی میں گرفتار ہوتا ہے۔ امام حسن مجتبیٰؓ نے اپنی غلطی کا احساس فرمانے کے بعد ان جذبات کا اظہار فرمایا۔

حقِ ہمسائیگی

آج تہجد کے وقت بڑا سناٹا تھا۔ نہ شور نہ شغب۔ نہ ڈھول نہ تاشے انتہائی پُرسکون فضا میں امام نے تہجد کے نوافل ادا کئے۔ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ روزانہ ایک ختم قران پڑھتے۔ اور تہجد کے وقت تو ایک خاص قسم کی سرشاری اور خود فراموشی کی کیفیت طاری رہتی۔ معلوم ہوتا کہ مصلی پر آدمی نہیں بلکہ ایک ستون کھڑا ہے۔ یہ محویت اور انہماک اذان فجر تک باقی رہتا۔ عجیب بات یہ کہ امام صاحب کے پڑوس میں ایک آوارہ مزاج شخص رہتا تھا۔ وہ کسی دکان پر ملازم تھا۔ دن میں وہ دکان پر کام کرتا اور رات کو شراب پی کر اپنے گھر میں خوب رنگ رلیاں مناتا ساز و آہنگ کا وہ طوفان بپا ہوتا کہ توبہ بھلی۔ وہ اکثر ایک شعر گایا کرتا جس کا مفہوم یہ تھا کہ لوگوں نے مجھے ہاتھ سے کھو دیا اور مجھے کھو کر ایسے شخص کو کھویا جو لڑائی اور فساد کے دن کام آنے والا تھا۔ اگرچہ اس کا یہ ہنگامہ امام کی عبادت و ریاضت میں کسی حد تک خلل پیدا کرتا لیکن محض ہمسائیگی کا خیال کر کے امام صاحب اس کی اس ایذا رسانی پر صبر فرماتے۔ اور اسے کچھ نہ کہتے۔ مگر آج رات خاموشی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ تہجد کا وقت ختم ہو گیا۔ موذن نے فجر کی اذان دی۔ امام نماز فجر کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔ مگر راستے بھر سوچتے رہے کہ آخر آج میرے پڑوس میں سناٹا کیوں چھایا ہوا

ہے۔ کہیں میرے پڑوسی پر کوئی افتاد تو نہیں پڑ گئی۔ نماز فجر سے فراغت کے بعد اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰت کا چراغ۔ علماء کا سرتاج۔ فقہ حنفی کا بانی۔ پیکر صدق وصفا۔ علوم نبوی کا خزینہ دار جسے دنیا امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اپنے اوباش پڑوسی کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ ایک بچی روتی ہوئی باہر آئی اور امام کو بتلایا کہ آوارہ گردی کے جرم میں کوتوال شہر نے اس کے باپ کو گرفتار کر لیا ہے اور وہ اس وقت قید میں ہے۔ امام اپنے گھر میں بھی لوٹ کر نہیں گئے اسی وقت اپنا خچر منگوایا سوار ہوئے اور کوتوالی میں پہنچ کر اطلاع کروائی کہ ابو حنیفہ کوتوال سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں یہ پہلا موقع تھا کہ امام صاحب کوتوالی تشریف لے گئے تھے۔ یہ اطلاع پا کر کوتوال تو حیران رہ گیا۔ اس نے ماتحت افسروں سے کہا کہ امام صاحب کو ان کے خچر سمیت میرے دفتر میں لے آؤ کہ میرے دفتر کا فرش ان کے خچر کے قدموں سے پامال ہو کر متبرک ہو جائے۔ جب امام صاحب تشریف لے گئے تو اس نے تکلیف فرمائی کی وجہ دریافت کی امام نے فرمایا میں اپنے پڑوسی کی سفارش کے لیے آیا ہوں کوتوال نے نہ صرف یہ کہ آپ کے پڑوسی کو رہا کر دیا بلکہ اس رات جتنے لوگ گرفتار ہوئے تھے سب کو معاف کر دیا۔ جب اپنے پڑوسی کو رہا کرا کر امام صاحب اپنے ساتھ لا رہے تھے تو آپ نے اس سے پوچھا کہ بھائی تو اکثر گایا کرتا تھا کہ لوگوں نے مجھے کھو دیا دیکھا! میں نے تجھے ضائع نہیں کیا اب اس اوباش کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ امام کے قدموں میں گرا ہوا کہہ رہا تھا امام اللہ آپ کو جزائے خیر دے آپ نے نہ صرف یہ کہ مجھے ضائع نہ کیا بلکہ مجھ گنہ گار کو آج وہ راہ دکھائی ہے جو زندگی کی حقیقی راہ ہے۔ توبہ کی راہ۔ تقویٰ اور پرہیز گاری کی راہ۔ اب اللہ سے میرے لیے استقامت کی بھی دعا فرمائیں۔ امام دعا فرما رہے تھے اور قبولیت بہر استقبال عرش سے اُتر رہی تھی۔

حضرت امام مالکؒ

حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کو علم حدیث سے جو شغف تھا اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ آپ کی علمی جلالت، امامت فی العلم اور عظمتِ شان پر سب کا اتفاق ہے۔ چونکہ مدینہ منورہ خود علم کی بستی تھی۔ دور دور سے طالبانِ علم سفر کر کے مدینہ آتے اس لئے امام مالک کو طلب علم کے سلسلے میں مدینہ سے سفر کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی ان کا تمامتر سرمایۂ علم حجازی اور مدنی ہے۔ آپ نے سترہ سال کی عمر ہی میں فتویٰ دینا شروع کر دیا تھا۔ اور اسی عمر میں آپ نے اپنا حلقۂ درس بھی قائم کر لیا۔ تھوڑی ہی مدت میں آپ کے علم و فضل کا شہرہ اقطار عالم میں پھیل گیا اور دور دراز علاقوں سے لوگ تحصیل علم کی خاطر آپ کے دروازے پر جمع ہونے لگے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ آپ کے شاگردوں کا شمار دشوار ہے۔ یہ مقبولیت فقہاء اور محدثین میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوئی۔ زرقانی کا بیان ہے کہ امام مالک نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔ مہدی کہا کرتے تھے کہ امام مالک حدیث و سنت دونوں میں امامت کے مقام پر فائز تھے۔ امام مالک کو جب حدیث بیان کرنا ہوتا تو اس کے لئے بڑا اہتمام کرتے۔ غسل کرتے۔ کپڑے تبدیل کرتے۔ عمامہ باندھتے اور خوشبو کا استعمال کرنے کے بعد نہایت وقار و سکون کے ساتھ مسند درس پر تشریف فرما ہوتے گورنر اور بادشاہ تک آپ کے درس میں شریک ہوتے لیکن اقلیم حدیث کا یہ تاجدار ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک نہ کرتا۔ قول رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا جلال مجمع پر ایسا چھایا ہوتا کہ کسی کو حرکت کرنے کی بھی مجال نہ ہوتی خود امام مالک درس حدیث میں نہایت پر سکون ہوتے۔ حدیث کے احترام میں آپ کے جسم میں بالکل کوئی حرکت نہ ہوتی ایک مرتبہ حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ حدیث کا درس دے رہے تھے کہ کسی طرح ایک بچھو پیچھے سے آپ کی قمیص میں گھس گیا اور اس نے ڈنک مارنا شروع کیا۔ مگر آپ نے اپنے جسم میں کوئی حرکت پیدا ہونے دی نہ درس ہی موقوف کیا۔

درس اسی طرح جاری رہا۔ جب بچھو ڈنک مارتا تو تکلیف کی شدت سے آپ کا چہرہ نیلا پڑ جاتا۔ مگر روایت حدیث میں کوئی فرق آتا نہ ذوق و شوق میں۔ درس کے بعد لوگوں نے دیکھا تو امام کی پشت میں بچھو نے سولہ سترہ ڈنک مارے تھے۔ کسی نے کہا۔ امام! بچھو نے جب پہلی مرتبہ ڈنک مارا تھا تو آپ نے اسی وقت کیوں نہ بتلایا۔ فرمایا۔ مجھے شرم آئی کہ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث چھوڑ کر اپنے جسم کی تکلیف کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ ساری زندگی شہر مدینہ میں بسر کر دی۔ کہ یہ محبوب کی سرزمین تھی۔ شہر مدینہ کا اتنا ادب کرتے کہ مدینہ میں رہ کر کبھی جوتے استعمال کئے نہ قضائے حاجت کی۔ جب ضرورت ہوتی شہر سے باہر چلے جاتے۔ امام مالک کے انگ انگ میں دیار حبیب کی محبت سمائی ہوئی تھی ان کے لئے خاک مدینہ سرمۂ چشم اور ہوائے مدینہ پیام حیات تھی۔ عشق صادق تھا اس لئے اتباع بھی کامل تھی۔ ساری زندگی میں ایک عمل بھی خلاف سنت صادر نہ ہوا۔ عشق و اتباع کے امتزاج نے امام مالک کی حیات طیبہ کو مثالی تو بنایا ہی تھا وفات بھی مثالی ہوئی اور ۱۷۹ ہجری میں خزینہ دار علم نبوی سبز گنبد کے قریب جنت البقیع میں خاک کی چادر تان کر سو گیا۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ

اللہ کا کلام قرآن کریم مخلوق ہے یا غیر مخلوق اس مسئلہ پر خلیفہ معتصم باللہ عباسی اور امام احمد بن حنبل کے درمیان اختلاف ہوا۔ اور روز بہ روز اختلاف شدت اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ دار الخلافہ بغداد میں دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ تو گمراہ معتزلی علماء کا تھا جو خلیفہ کے ہم نوا تھے قرآن کو مخلوق کہتے اور طاقت کے زور سے حق کی آواز کو دبا دینا چاہتے تھے۔ اور دوسرا طبقہ علمائے حقانی و ربانی کا تھا جن کا مقصد حیات ہی اعلاء کلمۃ الحق ہوا کرتا ہے اس جماعت کے رہنما حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کا اعلان تھا کلام اللہ ازلی و ابدی اور غیر مخلوق ہے امام احمد بن حنبل کی شخصیت معمولی شخصیت نہیں ہے۔ ان کی ذات گرامی یکسر سنت و اتباع سنت

کا پیکر و مجسمہ تھی ان کے دور کے بڑے بڑے علماء کا قول ہے کہ اگر کسی کو دیکھو کہ امام
احمد بن حنبل سے محبت رکھتا ہے تو جان لو کہ وہ صاحب سُنت ہے۔ جب علمائے
سوء نے دیکھا کہ امام کسی طرح ان کی بات نہیں مانتے تو انہوں نے خلیفہ کو بھڑکایا اور
امام کو قید کر دیا گیا۔ رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا۔ امام کے پیروں میں چار چار بوجھل
بیڑیاں ڈال دی گیئں۔ روزے کی حالت میں اُنہیں دھوپ میں بٹھلا دیا گیا۔ اور
ان کی اس پیٹھ پر جو نبوت کے علوم و معارف کی حامل تھی لگاتار کوڑے مارے جانے
لگے اور وہ بھی اس طرح کہ ایک جلاد صرف دو کوڑے مارتا اور ہٹ جاتا اور نیا تازہ
دم جلاد اس کی جگہ لیتا۔ مگر دین حق کا متوالہ اور عشقِ نبوت میں شمع کی طرح گھلنے والا
عزم و ثبات کا پہاڑ بنا ہُوا ان مصائب کو جھیل رہا تھا۔ زبان پر نہ نالہ و شیون تھے
نہ شور و فغاں۔ صرف ایک جملہ مسلسل جاری تھا القران کلام اللہ غیر مخلوق قران اللہ
کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے۔ امام احمد کے اس عزم صمیم کو دیکھ کر خلیفہ معتصم باللہ لرز
اُٹھا اُس نے آگے بڑھ کر امام سے کہا

اے احمد! خدا کی قسم میں تم پر اپنے بیٹے سے زیادہ شفقت رکھتا ہوں اگر تم
خلق قرآن کا ایک مرتبہ اقرار کر لو تو ابھی اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں
گا۔ مگر اس پیکرِ حق اور مجسمہ سنت کا ایک ہی جواب تھا کہ اپنی اس بات کو اللہ کی کتاب اور
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت کر دو تو میں مان لوں گا اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا۔
وقت گزر گیا اور معتصم باللہ بھی دنیا سے کوچ کر گیا لیکن امام اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔
امام احمد کے لڑکے عبداللہ کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد امام صاحب کی عادت تھی کہ
ہمیشہ اُٹھتے بیٹھتے فرماتے اللہ ابو الہیثم پر رحم فرمائے اللہ ابو الہیثم کی مغفرت فرمائے۔ مجھ
سے نہ رہا گیا تو ایک دن میں نے اپنے والد سے دریافت کر ہی لیا کہ آپ کس ابو الہیثم
کے لئے دعا فرماتے ہیں اور کیوں فرماتے ہیں۔ امام نے کہا بیٹے! جب میں پہلی مرتبہ
اس مسئلہ کے سلسلے میں دربار میں بلایا گیا اور میں جا رہا تھا تو راستے میں مجھے ایک شخص
ملا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا امام! مجھے پہچانتے ہو؟ میں مشہور چور ابو الہیثم حداد

ہوں میں بارہا چوری میں پکڑا گیا میری پیٹھ پر ہزاروں کوڑے پڑ چکے ہیں مگر میری استقامت کا حال شیطان کی اطاعت میں یہ ہے کہ ابھی تک چوری سے باز نہ آیا تم پر افسوس اگر تم اللہ کی اطاعت اور محبت کی راہ میں اتنی استقامت بھی نہ دکھلا سکو۔ جب میں نے ابوالہیثم کی بات سُنی تو اپنے جی میں کہا کہ اگر حق کی خاطر اتنا بھی نہ کر سکے جتنا دنیا کی خاطر ایک چور اور ڈاکو کر رہا ہے تو ہماری بندگی پر ہزار حیف اور ہماری خدا پرستی سے بُت پرستی لاکھ درجہ بہتر۔

روئے گشادہ باید و پیشانیٔ فراخ
آنجا کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند

۷ امام احمد بن حنبلؒ

ہر چند کہ بے سروسامانی بھی غربت اور افلاس تھا لیکن عشق حدود و قیود نہیں پہچانتا نہ سمندر اور پہاڑ اس کا راستہ روک سکتے ہیں یہ وہ سیل رواں ہے جو پہاڑوں کا دل چیر دیتا ہے۔ شرط عشقِ صادق اور جاذبۂ طلب کی ہے۔ عشق میں خلوص ہو اور جاذبہ قوی تو منزل خود سمٹ کر مسافر کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ طلب صادق اور عشق کامل ہی کا تو کرشمہ تھا کہ نہ زادِ راہ ہے نہ سامان سفر مگر سفر طے ہو رہا ہے۔ بغداد سے مکہ کا سفر۔ راہ میں بے آب و گیاہ صحرا بھی ہیں۔ وحشی درندے بھی جسم پر ایک جوڑا کپڑا کتابوں کی ایک گٹھری مصلّٰی اور مسواک اللہ اللہ خیر سلا۔ مگر سفر ہے کہ جاری ہے۔ فرشتے راستے میں اپنے پر بچھا رہے ہیں کیونکہ یہ سفر مال و دولت حاصل کرنے کے لئے یا تعشیات دنیوی سمیٹنے کے لئے نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مقدسہ کی سماعت اور انہیں حرز جاں بنانا مقصود ہے۔ بغداد میں سُنا تھا کہ مکہ مکرمہ میں علم نبوی کا ایک خزینہ دار سفیان بن عیینہ نامی موجود ہے جو طالبانِ علم کے لئے چشمۂ آب حیواں ہے۔ دور دور سے تشنگان علوم نبوت آتے اور سیراب ہوتے ہیں۔ اتنا سننا تھا کہ امام احمد بن حنبل کے دل میں آتش شوق بھڑک اُٹھی اور رخت سفر باندھ لیا۔ منزلوں پر منزلیں طے کرتے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے امام کا شوق علم دیکھا تو ان کو خاص تقرب بخشا

اب روزانہ کا معمول بن گیا کہ صبح کو امام احمد حضرت سفیان کے درس میں حاضر ہوتے اور شام تک تحصیل علم میں مصروف رہتے۔ ایک دن امام درس میں حاضر نہ ہوئے اور جب دن کافی چڑھ گیا تو انتظار کر کے حضرت سفیان نے ایک شخص کو دریافت حالات کے لئے امام احمد کی قیام گاہ پر بھیجا۔ اور جب وہ شخص امام صاحب کے پاس پہنچا تو کیا دیکھا کہ کپڑا کا ایک ٹکڑا لپیٹے امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ تقریباً نیم برہنہ بیٹھے ہوئے ہیں پوچھا۔ حضرت آج آپ تشریف نہیں لے گئے۔ امام نے فرمایا کہ بھائی بات یہ ہے کہ میرے کپڑے بہت میلے ہو گئے تھے۔ میرے دھونے سے صاف بھی نہیں ہوئے تھے۔ آج میں نے کپڑے دھوبی کو دیئے ہیں۔ شام تک کپڑے آجائیں گے تو کل انشاء اللہ حاضر ہوں گا اس شخص نے عرض کی۔ حضرت! مجھے اجازت دیں۔ میں ابھی آپ کے لئے کپڑے خرید کر لاتا ہوں۔ فقر غیور نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا اچھا! یہ نہیں منظور تو میں اپنے کپڑے آپ کو عاریتہً دیتا ہوں آپ آج کام چلالیں کل واپس کر دیجئے گا۔ امام نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ وہ شخص بھی اپنی ضد کا پکا تھا۔ اڑ گیا کہ میں اُس وقت تک واپس نہ جاؤں گا جب تک آپ اس کی کچھ تدبیر نہ کر لیں گے۔ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے جب دیکھا کہ یہ آدمی ٹلنے والا نہیں تو فرمایا کہ، اچھا ایک کام کرو۔ میں نے ایک کتاب لکھی ہے اسے بازار لیجا کر فروخت کر دو اور اس سے جو پیسے ملیں ان سے کپڑا خرید لاؤ۔ امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ جنہیں آگے چل کر حدیث و فقہ کا امام بننا تھا بھلا کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ کسی کی خیرات پر گزارا کریں۔ محنت کش تھے اور اپنی محنت کی کمائی کو ہر قسم کے عطیات سے ہزار گونہ افضل جانتے تھے۔ جس کمائی میں پسینے کی بو بسی ہوئی ہو اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ حدیث میں ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بدرجہا بہتر ہے۔

۷ حضرت عبداللہ بن مُبارکؒ

شام کے قصبہ طرطوس کی سرائے میں جب حضرت عبداللہ بن مبارک نے اپنے سابق طالب علم کو نہ پایا تو وہ سخت پریشان ہو گئے کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ عبداللہ بن

مبارک رحمۃ اللہ، جب بھی طرطوس آ کر اس سرائے میں قیام فرماتے تو وہ نوجوان ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حدیثیں سنتا اور انہیں کو دین کا سرمایہ سمجھ کر یاد کرتا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی محفل درس سونی پڑی تھی۔ انہوں نے سرائے کے ملازمین سے نوجوان کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتلایا کہ جناب! بات اصل میں یہ ہے کہ اس نے ایک آدمی سے قرض لے رکھا تھا۔ قرض خواہ نے جب بار بار تقاضا کیا اور نوجوان قرض کی رقم ادا نہ کر سکا تو اس نے قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی نے نادہندگی کے جرم میں اسے قید کر دیا اب جب تک قرض کی رقم ادا نہ ہو جائے وہ نوجوان رہا کیسے ہو سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے قرض کی رقم اور قرض خواہ کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نوجوان دس ہزار کا مقروض ہے۔ شام تک حضرت عبداللہ بن مبارک انتظار کرتے رہے۔ جب رات ہو گئی تو چپکے سے قرض خواہ کے گھر پہنچے اور اس سے کہا کہ بھائی تم اپنے قرض کی رقم مجھ سے لے لو اور اس نوجوان کو رہا کرا دو۔ میری طرف سے صرف ایک شرط ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اس شرط کی پابندی کرو گے۔ وہ یہ کہ تم میرے سامنے قسم کھاؤ کہ اس کا تذکرہ تم کسی سے نہیں کرو گے۔ قرض خواہ نے حضرت عبداللہ بن مبارک کی شرط کو قبول کیا اور رقم وصول کر لی۔ رقم ادا کر کے نوجوان کی رہائی کا انتظام کرنے کے بعد حضرت عبداللہ سرائے میں واپس آئے اور صبح ہونے تک کا بھی انتظار نہ کیا رخت سفر باندھا اور رات ہی میں روانہ ہو گئے۔ نوجوان جیل سے رہا ہو کر سرائے میں آیا تو کسی نے اسے بتلایا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک آئے اور صرف ایک دن قیام کر کے روانہ ہو گئے۔ یہ سن کر علم دین کے حصول کی آتش شوق نوجوان کے سینے میں بھڑک اٹھی اور وہ اسی وقت حضرت عبداللہ بن مبارک کی تلاش میں چل پڑا۔ کئی منزلوں کے بعد جب حضرت عبداللہ بن مبارک سے اس کی ملاقات ہوئی تو اسے ایسا لگا جیسے اس کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد مل گیا آگے بڑھا اور حضرت عبداللہ بن مبارک سے لپٹ گیا۔ عبداللہ بن مبارک نے حال دریافت کیا تو اپنے قید اور رہائی کی داستان سنائی آپ نے پوچھا کہ رہائی کیسے ہوئی؟ تو بولا کہ اللہ کا کوئی بندہ سرائے میں آ کر ٹھہرا تھا اسی نے اپنی طرف سے میرا قرض ادا کر کے

مجھے رہائی دی افسوس کہ میں اپنے محسن کو جانتا تک نہیں کہ کم از کم اس کا شکریہ تو ادا کر دوں۔ ابن مبارک نے فرمایا خدا کا شکر ادا کرو کہ اس مصیبت سے تمہیں نجات مل گئی۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد قرض خواہ نے جس سے آپ نے قسم لے لی تھی قرض ادا کرنے کا یہ واقعہ لوگوں کو بتلایا تو وہ نوجوان عبداللہ بن مبارک کے مزار پر کھڑا علم و سخا کے اس پیکر کے لئے دعائے مغفرت کر رہا تھا۔

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت　　نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت

ابو منصور کی حق گوئی

سلطان طغرل کا وزیر ابو منصور فہم و فراست۔ سیاسی سمجھ بوجھ اور دیانت و صداقت شعاری میں اپنا نظیر آپ تھا۔ وہ بڑا شجاع اور جری بھی تھا۔ انتہائی خطرناک مواقع پر بھی اس کے اوسان خطا نہیں ہوتے تھے۔ اسی لئے سلطان طغرل اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ جس کے باعث درباری لوگ اس سے حسد کرتے اور ہر وقت لگائی بجھائی میں مصروف رہتے مگر ابو منصور ان حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی طرف التفات بھی نہ کرتا۔ کیونکہ حاسد کے حسد کا بہترین علاج یہی ہے کہ اس کے حسد کی طرف توجہ ہی نہ کی جائے۔ حسد کی مثال تو ایک آگ کی سی ہوتی ہے جو ایندھن چاہتی ہے جس سے حسد کیا جائے اگر وہ اس حسد کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ اس کا ایندھن بن جائے گا لیکن اگر وہ اس کی طرف مطلق توجہ ہی نہ کرے اور اپنے تمام معاملات اپنے خالق و مالک کے سپرد کر دے تو حسد کی آگ حاسد ہی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ ابو منصور بھی اسی اصول پر عمل کرتا تھا۔ ابو منصور کا معمول تھا کہ ہر صبح نماز فجر کے بعد مصلے پر بیٹھا درود و وظائف میں مشغول رہتا سورج طلوع ہونے کے بعد اشراق کی نماز پڑھتا پھر امور دنیا میں مصروف ہو جاتا۔ اتفاقاً ایک مہم پیش آ گئی اور بادشاہ بہت پریشان ہو گیا۔ اس نے فوراً وزیر کو طلب کیا۔ آدمی بلانے گیا تو ابو منصور جانماز پر بیٹھا ہوا تھا۔ ابو منصور نے قاصد سے کہا کہ تم چلو میں وظیفے سے فارغ ہو کر آ رہا ہوں۔ قاصد نے جب دربار میں یہ بات آ کر بتلائی تو حاسدوں کو سنہری موقع مل گیا اور وہ طرح

طرح کی باتیں بنا کر سلطان طغرل کو بھڑکانے لگے۔ حاسدوں نے کہا ظل الٰہی وزیر کی یہ جرأت ملاحظہ فرمائیں شاہی فرمان گیا اور وزیر نے اس کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ اس طرح کی باتیں سن کر بادشاہ کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور وہ پیچ و تاب کھانے لگا۔ اتنے میں ابو منصور اپنے معمولات سے فارغ ہو کر شاہی دربار میں حاضر ہوا۔ سلطان تو آگ بگولا بنا بیٹھا ہی تھا۔ وزیر پر نظر پڑتے ہی اس کا پارا اور چڑھ گیا۔ سخت غیظ و غضب کے عالم میں اس نے وزیر کو مخاطب کر کے کہا "تو نے اتنی دیر کیوں لگائی کیا تیری نظر میں شاہی فرمان کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے؟" دربار کے چاپلوس مصاحبوں کو یقین تھا کہ آج یا تو ابو منصور کا سر قلم کر دیا جائے گا یا پھر وہ معزول ہو جائے گا۔ ابو منصور نے نہائیت علم و وقار سے بادشاہ کا سوال سنا۔ بادشاہ کے لہجے کی تندی اور اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے ابو منصور قطعاً مرعوب نہ ہوا اور برسر دربار کہا۔

"سلطان! میں خدا کا بندہ ہوں اور تیرا نوکر جب تک اپنے مالک کی بندگی سے فارغ نہ ہو جاؤں تیری نوکری پر حاضر نہیں ہو سکتا۔ تیرے ہاتھ میں اقتدار ضرور ہے لیکن مقتدر اعلیٰ میرے رب کی ذات ہے۔"

سلطان اس دلیرانہ جواب کو سن کر آبدیدہ ہو گیا اور کہا ابو منصور! تو مالک کی بندگی کو میری نوکری پر مقدم رکھ اس کی برکت سے انشاءاللہ ہمارے سب کام درست ہو جائیں گے۔ (سلطان کا جواب سن کر حاسد ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کہ حق ہی بلند ہوتا ہے۔)

قاضی ابو زرعہ

مدعیٰ علیہ کو روتا دیکھ کر قاضی ابو زرعہ متعجب بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ انہیں یہ بھی خیال ہوا کہ کہیں فیصلہ کرنے میں ان سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔ مگر معاملہ سیدھا سادہ تھا۔ ایک شخص نے ان کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا کہ میرا فلاں شخص پر اتنا قرض ہے۔ اور وہ ادا نہیں کرتا اس لئے میری رقم دلوا دی جائے۔ قاضی ابو زرعہ تے نئے قاضی بنے تھے۔

مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے اور آپ کا شمار تیسری صدی ہجری کے جلیل القدر محدثین میں ہوتا تھا۔ اسی لئے آپ کو علم حدیث میں امام سمجھا جاتا ہے۔ تقویٰ تو جیسے آپ کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ بڑا درد مند دل پایا تھا۔ ہر وقت خوف خدا سے لرزاں و ترساں کسی کی تکلیف دیکھ نہیں سکتے تھے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ وہ شخص مومن کامل نہیں جو کسی کے دکھ کو دیکھ کر رنجیدہ نہ ہو اور اس کی مدد کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اسی غم گساری اور دردمندی کی وجہ سے لوگ ان کی عزت کرتے اور ان سے محبت رکھتے تھے۔ اسی لئے جب مدعی نے ان کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا تو انہوں نے مدعا علیہ کو طلب کیا اور اس سے سوال کیا کہ کیا مدعی کا دعویٰ درست ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ اس نے مدعی سے قرض لیا تھا؟ مدعیٰ علیہ نے اقرار کر لیا۔ قاضی ابوزرعہ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور مدعیٰ علیہ کو حکم دیا کہ وہ قرض کی رقم ادا کر دے۔ قاضی صاحب کا فیصلہ سن کر مدعیٰ علیہ رونے لگا تو قاضی صاحب کو تعجب ہوا۔ پوچھا تم روتے کیوں ہو؟ مدعیٰ علیہ نے کہا حضرت! یہ صحیح ہے کہ میں نے مدعی سے قرض لیا تھا۔ میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے اقرار کر لیا۔ روتا اس لئے ہوں کہ میرے پاس آپ کے فیصلے کے مطابق قرض ادا کرنے کے لئے رقم نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے جیل بھیج دیجئے۔ امام ابوزرعہ نے یہ سن کر مدعی کو بلایا اس کے قرض کی رقم اپنی جیب سے ادا کر دی۔ اور مدعا علیہ کو رہا کر دیا۔ مدعیٰ علیہ جب رہا ہو کر عدالت سے اپنے گھر واپس جا رہا تھا تب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر یہ آنسو رنج و غم کے نہیں تشکر و احسان مندی کے تھے۔

مالک بن دینار اور ایک یہودی ہمسایہ

حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ خلوت پسند۔ نرم مزاج۔ پابند سنت۔ نیک خو اور ذاکر و شاغل آدمی تھے۔ اکثر فرماتے کہ آدمی کے برا ہونے کو یہی کافی ہے کہ وہ خود نیک نہ ہو اور نیک لوگوں کو برا کہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو عذاب میں گرفتار کرنا چاہتا ہے تو نیکوں کی عداوت اس کے دل میں پیدا

کر دیتا ہے پھر اس کی زبانِ طعن دراز ہو جاتی ہے اور اللہ کے نیک بندوں کی شان میں گستاخی کر کے وہ عذاب الٰہی کا سزاوار قرار پاتا ہے۔ مالک بن دینار کے قریب اگر کوئی کتا بھی آکر بیٹھ جاتا تو اُسے نہ دھتکارتے۔ فرماتے کہ "بُرے دوست سے تو یہی اچھا ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ایک مکان کرایہ پر لیا۔ آپ کے ہمسایہ میں ایک یہودی رہتا تھا۔ آپ کے گھر کی محراب یہودی کے دروازے پر تھی۔ یہودی پڑوسی نے محض آپ کو پریشان کرنے کے لئے اپنے دروازے پر بیت الخلاء بنا لیا تاکہ بدبو سے آپ کو تکلیف پہنچے مگر آپ نے اس کی ایذا رسانی پر صبر فرمایا۔ جب یہودی نے دیکھا کہ میری شرارت کا حضرت مالک بن دینار پر کوئی اثر نہ ہُوا تو اس نے یہ معمول بنا لیا کہ گھر بھر کی غلاظت اور کوڑا کرکٹ اکٹھا کر کے آپ کے گھر میں پھینک دیتا اور محراب کو پلید کر دیتا ایک مدت تک وہ یہی کرتا رہا لیکن آپ نے کسی سے ذکر کیا نہ کبھی اپنے پڑوسی یہودی سے شکایت کی۔ دیکھتے دیکھتے ایک دن وہ یہودی حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہُوا تو آپ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال فرمایا اور عزت کی جگہ پر بٹھلانے کے بعد اس کی اور اس کے اہل و عیال کی خیریت دریافت فرمائی۔ یہودی منتظر رہا کہ شاید مالک بن دینار اس کا گلہ اور شکایت کریں لیکن انہوں نے اس کا ذکر بھی نہ کیا۔ جب یہودی نے دیکھا کہ آپ نے اس کی تکلیف دہی کا تذکرہ بھی نہ فرمایا نہ صراحتہً نہ کنایتہً تو خود ہی بول پڑا مالک بن دینار! میں جو عرصے سے آپ کے گھر میں کوڑا کرکٹ اور غلاظت پھینکتا ہوں اس سے آپ کو تکلیف تو نہیں ہوتی؟ جناب مالک بن دینار نے جواب دیا بھائی! تکلیف تو ضرور ہوتی ہے مگر میں نے ایک جھاڑو اور ٹوکری رکھ لی ہے اس سے صفائی کر کے دھو لیتا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ آپ یہ تکلیف اتنی خاموشی سے کیوں برداشت کرتے رہے۔ مالک بن دینار نے جواب دیا "ہمارے اللہ اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کی تعریف فرمائی ہے جو غصّے کو پی جانے والے لوگوں کو معاف کر دینے والے اور احسان کرنے والے ہیں۔ اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا بار

بار حکم فرمایا ہے۔ میرے پیشِ نظر تو اپنے رب اور رب کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں۔ تیرا جو جی چاہے کر انشاء اللہ تو مجھے جادۂ مستقیم سے ہٹا ہؤا کبھی نہیں پائے گا۔

مالک بن دینار نے اپنی بات ختم کی تو یہودی نے کہا افسوس کہ خدا کا دوست دشمن کے ہاتھوں اتنی تکلیف اٹھائے اور حرف شکایت بھی زبان پر نہ لائے۔ یہودی نے سر جھکایا اور مالک بن دینار کا ہاتھ تھام کر کہا

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمد رسول اللہ

خواجہ معین الدین چشتیؒ

فقیر دنیا اور دولت دنیا سے بے نیاز اپنی کملی میں مست یاد الٰہی میں مصروف بیٹھا ہے۔ نہ اُسے اقتدار کی طلب ہے نہ جاہ و جلال کی۔ اسے ایک حکم دیا گیا ہے جس کی بجا آوری میں مصروف ہے۔ حکم یہ ہے کہ کفرستان ہند میں آوازۂ تکبیر بلند کرے۔ صدیوں سے کچلے ہوئے انسانی طبقات کو شرف انسانیت سے ہم کنار کرے۔ ذروں کو اٹھائے اور آفتاب بنا دے قطروں کو گہر کی آبرو بخش دے۔ وہ انسان جو پتھروں ، درختوں دریاؤں اور سمندروں کے آگے سجدہ ریز ہیں انہیں باطل معبودوں اور طاغوتی طاقتوں کی قید غلامی سے نجات دلا کر توحید کے آستانے پر جھکا دے۔ اور صرف ایک خالق ، ایک مالک اور ایک داتا کے در کا سوالی بنائے۔ فقیر کے پاس توپ و تفنگ ہے نہ لشکر و سپاہ اس کا اسلحہ توکل۔ اس کی قوت ایمان اور اس کا رفیق یقین محکم ہے۔ اس کی سیرت سنت نبوی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اس کی تعلیم محبت۔ پیار۔ اخوت و مساوات کے زریں اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کی دنیا میں دور دور تک نفرت و حقارت ، کبر و نخوت کا وجود نہیں ہے۔ اس کی آغوش محبت سب کے لئے وا ہے۔ بیمار آ رہے ہیں اور شفا یاب ہو کر جا رہے ہیں۔ گمراہ آتے ہیں اور رہبر و رہ نما بن کر واپس جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہے۔ جو ظاہر ہے وہی باطن ہے۔ خلوت و جلوت دونوں ہم رنگ ہیں اس کے اخلاق نے

ایوان کفر میں زلزلہ ڈال رکھا ہے۔ مشورہ ہوا کہ اس گلیم پوش فقیر کو قتل کر کے ہی اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا جا سکتا ہے۔ ایک فاسق و فاجر کا انتخاب ہوا۔ اسے لالچ دیا گیا کہ اگر تو درویش کا کام تمام کر دے تو زر و جواہر سے تیرا منہ بھر دیا جائے گا۔ قتل کے ارادے سے قاتل نے خنجر تیار کیا۔ بغل میں چھپایا اور ٹھیک مغرب کی نماز کے بعد درویش کی کٹیا میں داخل ہو گیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ تن تنہا مصلے پر تشریف فرما تھے۔ قاتل جا کر قریب بیٹھ گیا۔ حضرت خواجہ نے مزاج پرسی فرمائی اور فرمایا "بھائی! تم جس ارادے سے آئے ہو اپنا ارادہ پورا کر لو اس وقت تنہائی ہے۔ تم سے کوئی انتقام نہ لے گا۔ بغل سے خنجر نکالو اور ارادہ پورا کرو۔" قاتل کانپ گیا۔ بغل سے خنجر نکالا اور خواجہ کے قدموں میں ڈال دیا۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ حضرت! آپ مجھے سزا دیں کہ میں سزا کے قابل ہوں۔" خواجہ نے فرمایا ہم درویشوں کا مسلک ہے کہ ہم برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں۔ چھری اٹھا لو۔ آپ نے اٹھ کر قاتل کو سینے سے لگایا اور ایک ہی نظر میں اس کی دنیا بدل دی۔ اب وہ فاسق و فاجر تھا نہ ظالم و قاتل۔ اب وہ ایک زاہد شب زندہ دار اور ولی کامل تھا۔ اور اس کا قلب مہبط انوار الٰہی۔

حضرت جنیدؒ کا جنتؒ کا ساتھی

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار اولیاء اللہ کے سرداروں میں ہوتا ہے۔ آپ علم معرفت و حقیقت میں بے مثال اور شریعت و طریقت کے آداب و اصول سے واقف تھے۔ ہزاروں گمراہوں نے آپ کے ذریعہ راہ ہدایت پائی اور اپنی زندگی کو احکام الٰہی کے مطابق بنایا۔ آپ کے دن دین کی تعلیم اور راتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بسر ہوتیں۔ ایک رات تہجد کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ بار الٰہا! مجھے بتا دے کہ جنت میں میرا ساتھی اور مصاحب کون ہو گا۔ جواب ملا۔ فلاں چرواہا۔ حضرت جنید حیران رہ گئے۔ صبح ہونے کے بعد اس چرواہے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اور جب اس سے ملاقات ہو گئی تو دو تین دن اس کے ساتھ رہے اس کا حال دیکھنے

کے بعد ایک دن حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے اس چرواہے سے دریافت کیا بھائی! میں نے تو دیکھا ہے کہ سوائے پنج وقتہ نماز پڑھنے کے تم ایسا کوئی کام نہیں کرتے جو اس قدر قبولیت کا باعث ہو۔ شاید یہ بلند درجہ تمہیں تمہارے کسی باطنی معاملے کی وجہ سے ملا ہے؟ چرواہا مسکرایا اور کہا خواجہ جنید! میں ایک جاہل آدمی ہوں میں نہیں جانتا کہ معاملہ کس کو کہتے ہیں اور باطن کیا ہوتا ہے۔ میں تو ایک سیدھا سادہ مسلمان ہوں۔ البتہ میرے اندر دو خصلتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سب پہاڑوں کو سونے کا کر دے اور انہیں میرے قبضے میں دیدے اور پھر یہ سب میرے ہاتھ سے جاتے رہیں تو مجھ کو ان کے چلے جانے کا کوئی رنج و غم نہ ہوگا۔ دوسری یہ کہ کوئی میرے ساتھ وفا کرے یا جفا میں اس سے کوئی اثر قبول نہیں کرتا کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہو رہا ہے۔ بندہ بیچارا تو صرف ایک ظاہری سبب ہے۔ خواجہ جنید! میں نے اپنا کام اپنے محبوب رب کے حوالہ کر دیا ہے۔ خواہ وہ مجھے اب زندہ رکھے یا مار ڈالے۔ اس کی مرضی پہ راضی ہوں۔ چرواہے کا جواب سن کر جنیدؒ کی سمجھ میں آ گیا کہ اُسے کیوں جنت میں جنیدؒ کا مصاحب بنایا گیا ہے۔

شانِ توکّل

عصر کا وقت قریب آ رہا تھا اور جوں جوں عصر کا وقت آ رہا تھا کاروبار میں تیزی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ قریب تھا کہ بصرہ کی جامع مسجد سے اذان کی آواز بلند ہو۔ خریدار مال خریدنے کی جلدی میں تھے۔ دکاندار اپنا مال جلد سے جلد فروخت کر دینے کی فکر میں عصر کا وقت ہوتا ہی سب سے کاروبار میں تیزی کا۔ اسی لئے قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی نمازوں کی حفاظت کیا کرو اور خاص کر عصر کی نماز کا۔ کیونکہ اس وقت آدمی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ موذن حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ کا کلمہ بلند کرکے اللہ کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے اور کاروبار کا تقاضا ہے کہ دکان پر آیا ہوا گاہک واپس نہ چلا جائے۔ بس کشاکش شروع ہو جاتی ہے۔ مادی و روحانی اور دنیوی و اُخروی تقاضوں

کے درمیان۔ اگر اللہ کی ذات پر کامل بھروسہ ہو اور دل سے انسان اسی کو رازق مطلق ماننے والا ہو تو مادی فائدوں کو ٹھکرا کر مسجد کی طرف قدم بڑھا دیتا ہے۔ پھر آخرت تو آخرت دنیا بھی اُسے مل جاتی ہے۔ غرضکہ موذن نے عصر کی اذان دیدی اور لوگ جوق جوق مسجد کی طرف بڑھنے لگے۔ ان میں حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ بھی تھے۔ خواجہ صاحب ابھی مسجد کی سیڑھیوں ہی پر تھے کہ ان کی نگاہ سیڑھی کے کنارے پر پڑی ہوئی ایک پوستین پر پڑی۔ خواجہ حسن بصری کو پوستین کو پہچان سے گئے۔ قریب جا کر جب غور سے دیکھا تو ان کا شک یقین میں بدل گیا۔ واقعتہً وہ حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ کی پوستین تھی۔ خواجہ صاحب اس کے قریب کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ حبیب عجمی بھی عجیب لاپرواہ آدمی ہیں پوستین اتار کر یہاں رکھ دی ہے اور خود غالباً وضو کرنے چلے گئے۔ ہزاروں آدمی آجا رہے ہیں۔ بازار کا معاملہ ہے۔ اچھے بُرے۔ چور اُچکے سبھی قسم کے لوگ ہیں اگر کوئی پوستین لے کر چمپت ہو جائے تو کیا بنے گا۔ حضرت خواجہ حسن بصری کھڑے ہو کر اس کی نگرانی لگے۔ کہ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ حبیب عجمی ہاتھ منہ پونچھتے چلے آرہے ہیں۔ فرمایا کہ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ شارع عام کے قریب مسجد کی سیڑھیوں پر پوستین چھوڑ کر چلے گئے، کوئی اٹھا لے جاتا تو کیا کرتے؟ آخر تم نے کس کے بھروسے پر اس کو یہاں چھوڑ دیا تھا؟ حبیب عجمی نے فرمایا "حضرت! اسی کے بھروسے پر جس نے اتنی دیر سے آپ کو اس کی حفاظت و نگرانی پر مامور کر رکھا ہے" معلوم ہوا جیسے حضرت حسن بصری کی آنکھیں کھل گئی ہوں وہ محبت بھری نظروں سے حبیب عجمی کو دیکھنے لگے۔ کہ عجمی۔ حبیب توکل کے اعلیٰ مقام پر فائز تھا۔

زندگی کا حقیقہ لمحہ

بعض لوگوں کو اپنے خوابوں کی تعبیر معلوم کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے لیکن اس درویش کو کوئی پریشانی نہیں تھی اس لئے کہ وہ جو بھی خواب دیکھتا اس خواب کی بعینہ وہی تعبیر ظاہر ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک انعام ہے وہ

جسے چاہے نواز دے۔ درویش کو معلوم ہؤا کہ میرک نامی کوئی بزرگ ہیں اور فلاں مقام پر رہتے ہیں۔ ملاقات کا شوق دامن گیر ہؤا۔ اور آتشِ شوق سے مجبور ہو کر درویش حضرت میرک سے ملاقات کرنے کی غرض سے روانہ ہؤا۔ سفر بڑا دشوار گزار تھا۔ مسافت بھی طویل تھی۔ مگر شوق تھا کہ درویش کو کشاں کشاں لئے چلا جا رہا تھا۔ جب درویش حضرت میرک کی بستی کے قریب پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ وہیں ٹھہر گیا۔ رات میں اس نے خواب میں سُنا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ آج رات حضرت میرک کی وفات ہو گئی۔ یہ آواز سُن کر درویش ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور بہت رنجیدہ ہؤا کہ اتنی محنت اور سفر کی اتنی مشقت برداشت کرنا سب ضائع ہو گیا کہ جس سے ملنے کے لئے اتنی دور سے آیا وہی فوت ہو گیا۔

درویش نے بقیہ رات بڑی مایوسی اور بے چینی میں بسر کی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوتا آخر اس نے فیصلہ کیا کہ جب اتنا طویل سفر طے کر کے آیا ہے اور حضرت میرک کی بستی بھی بالکل قریب ہے تو کیوں نہ چل کر میرک کی قبر ہی کی زیارت کر لے۔ آخر وہ حضرت میرک کی بستی میں آیا۔ اور بستی والوں سے پوچھنے لگا کہ حضرت میرک کی قبر کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ "بندۂ خدا! میرک تو زندہ ہیں اور تو ان کی قبر کی بابت پوچھتا ہے۔ درویش حیران رہ گیا کہ میرا خواب جھوٹا کس طرح ہو گیا۔ الغرض وہ حضرت میرک کی خدمت میں حاضر ہؤا۔ اور سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ جب تنہائی ہوئی تو اس درویش نے اپنے خواب کی روداد حضرت میرک کو سنائی۔

میرک نے کہا: درویش واقعتاً تیرا خواب ٹھیک تھا۔ کیونکہ میں ہمیشہ اپنی راتوں کو یادِ الٰہی میں بسر کرتا تھا مگر گزشتہ رات میں کسی دوسری چیز میں مشغول رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ عالم میں منادی ہو گئی کہ میرک مر گیا۔ زندگی کا حقیقی لمحہ وہی ہے جو مولا کی یاد میں بسر ہو۔ غفلت کے لمحات اللہ کے نزدیک زندگی کے نہیں موت کے لمحات شمار ہوتے ہیں۔

مالک بن دینارؒ

باپ غلام تھا۔ دینار نامی اسکے گھر میں ایک نیک سیرت اور ذہین لڑکا پیدا ہؤا۔

اس دور کے ایک بلند پایہ ولی نے اس کا نام مالک رکھا۔ مالک نے جب ہوش سنبھالا تو لہو ولعب اور گانے بجانے میں مشغول ہو گئے۔ کبھی منہ میں بانسری ہوتی اور کبھی ہاتھ میں ستار۔ دن رات کا یہی مشغلہ تھا۔ اہل طرب کی مجلس میں جب مالک بیٹھتے اور ان کے ہم مشرب لوگ ان کے ارد گرد ہجوم کرتے تو ایسا لگتا کہ چاند کے گرد ہالہ ہے۔ ہر روز، روز عید اور ہر شب شب برات تھی۔ مالک بن دینار جب مجمع میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے تو تقدیر ان کے پیچھے کھڑی مسکراتی رہتی۔ ایک رات محفل کے اختتام پر لوگ اٹھ کر چلے گئے اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ چاندنی رات باغ کا سہانا منظر۔ ہر طرف خاموشی۔ مالک بن دینار کے سینے میں فن نے انگڑائی لی۔ اور ان کی انگلیاں تیزی سے ستار کے تاروں پر پھرنے لگیں۔ ستار کے سینے سے غم واندوہ میں ڈوبا ہوا ایک نغمہ اُبلنے لگا۔ اور وہ تھوڑی دیر کے لئے اس نغمے کے کیف وسرور میں ڈوب گئے۔ عین اسی سرور وسوز کے عالم میں مالک کے باطن سے آواز اُبھری۔ مالک کیا تو توبہ نہیں کرے گا۔ یہ نے نوازی اور بربط سرائی کب تک۔ آخر ایک دن یہ جوانی ڈھل جائے گی۔ قویٰ مضمحل اور حواس مختل ہو جائیں گے۔ پھر ان لوگوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آئے گا۔ قبر کی تنہائی تیرا انتظار کر رہی ہے۔ کیا تیرا یہ فن قبر میں تیرے کچھ کام آئے گا؟ ایسا لگا جیسے کہ مالک بن دینار کسی گہرے خواب سے چونک اُٹھے ہوں۔ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بانسری اور ستار وہیں چھوڑا۔ اور باغ سے نکل کھڑے ہوئے۔ شب کا مسافر آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔ کہ مالک بن دینار نے حضرت خواجہ حسن بصری کے دروازے پر دستک دی۔ حضرت حسن بصری تہجد میں مصروف تھے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ مالک کو دیکھا۔ آغوش محبت وا کر دی۔ مالک آجا کہ میں عرصے سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔ لگ جا میرے سینے سے۔ مالک خواجہ حسن بصری کے سینے سے لگ گئے۔ دونوں طرف آنکھیں بہنے لگیں۔ سیلاب اشک نامۂ اعمال کی سیاہی کو دھو رہا تھا۔ عالم بالا سے توبہ کی قبولیت کا مژدہ جانفزا آیا اور کچھ ہی دنوں بعد حسن بصری کے فیض صحبت سے دینار نامی غلام کا بیٹا اولیاء اللہ کی صف اوّل میں نظر آنے لگا۔

توکّل علی اللہ

حضرت ابراہیم ادھم رحمتہ اللہ علیہ کے مرید خاص، شریعت و طریقت کے عالم بے بدل، راہ عزیمت کے رہرو اور دنیائے زہد و تقویٰ کے صاحب مقامات عالیہ حضرت بو علی شفیق بن ابراہیم بلخی رحمتہ اللہ علیہ کا شمار کبار اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ ان کے خوان نعمت سے بے شمار طالبان حق نے لقمہ چینی کی اور ان کے ذریعہ کثیر بندگان خدا نے راہ ہدایت پائی۔ وہ ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں عام دنیاداروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ پیشہ تجارت تھا۔ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ جناب والا آپ طریقت کی وادی میں کیسے آئے؟ انہوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ بلخ میں سخت قحط پڑا یہاں تک کہ انسانوں نے انسانوں کو کھانا شروع کر دیا۔ ایک عام سراسیمگی اور وحشت کا دور تھا۔ جسے دیکھو غمزدہ اور پریشان پھرتا۔ میں بازار میں اسی عالم میں رنجیدہ و ملول بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے ایک غلام کو دیکھا کہ بہت خوش ہے اور ہنستا پھر رہا ہے۔ اس کی ہنسی اور خوشی دیکھ کر مجھے سخت غصہ آیا۔ میرے ساتھ جو لوگ بازار میں تھے وہ بھی اس کی اس حرکت پر سخت برہم تھے۔ لوگوں نے کہا "تجھے شرم نہیں آتی کہ خلق خدا دانے دانے کو محتاج ہے۔ ہر طرف لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ قحط اور خوراک کی نایابی کے باعث رنج و حرماں کا دور دورہ ہے اور تو ہے کہ اٹھکھیلیاں کرتا پھر رہا ہے۔ ہنستا ہے اور خوشی مناتا ہے؟ غلام نے جواب دیا یارو! مجھے کوئی غم ہے نہ فکر۔ اس لئے کہ میرا آقا معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ پورے ایک گاؤں کا بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ مجھے کیا کمی ہے۔ اس چیز نے میرے دل کو ہر قسم کی پریشانی سے آزاد کر دیا ہے اور میرے سارے غم مٹا دیئے ہیں۔ حضرت شفیق بلخی رحمتہ اللہ علیہ نے بتلایا کہ غلام کا جواب سُن کر مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھوں سے جہالت و نادانی کا پردہ ہٹ گیا۔ حجابات دور ہو گئے اور سخت شرمندگی کے عالم میں میں اللہ تعالیٰ

کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے عرض کیا بار الہا! یہ اس شخص کا غلام ہے جس کی ملکیت میں صرف ایک گاؤں ہے اور یہ اتنی خوشی منا رہا ہے اور مگن ہے۔ ہم تجھ جیسے مالک الملک خالق الارض والسماء کو اپنا پروردگار کہتے ہیں۔ نماز کی ہر رکعت میں تجھے رب العالمین رب العالمین کہہ کر پکارتے ہیں اور پھر اپنی روزی کے لئے اس درجہ فکر مند ہیں۔ میرے مالک! میرے آقا! میرے داتا! مجھے معاف فرما۔ اپنی معرفت کے انوار سے میرے قلب و نظر اور دل و جان کو منور فرما۔ مجھے یقین و ایمان قناعت و توکل کی دولت سے سرفراز فرما۔ میرے باطن کی آنکھوں کو کھول دے کہ تیری قدرت کاملہ اور جلالت و کبریائی کے جلووں کو دیکھ سکوں۔ میرے مالک نے میری دعا قبول فرمالی اور دنیا اور دولت دنیا کی طرف سے میرا دل سرد ہو گیا۔ میں نے تمام بے ہودہ مشاغل سے منہ موڑ کر حق کے راستے کو طے کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے میں پھر کبھی روزی کے لئے غمزدہ نہیں ہوا۔ حضرت شفیق بلخی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اصل میں تو میں اس غلام کا شاگرد ہوں کہ میں نے جو کچھ پایا اسی سے پایا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ اور ایک یہودی

اُس رات تو سلطان بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ دو چار لمحوں کے لئے بھی آنکھ پر آنکھ نہ لگا سکے۔ سوتے بھی تو کیسے رات بھر ساتھ والے مکان سے ایک بچے کے رونے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ ایک تو رونا اور اس پر بچے کا رونا۔ رقیق القلب لوگوں کے لئے تو سوہانِ رُوح ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے رات کٹی اور سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ تو سلطان بایزید پڑوسی یہودی کے دروازے پر کھڑے دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ اندر سے آواز آئی کہ مرد صورت کوئی گھر میں موجود نہیں۔ سلطان نے اپنا تعارف کرایا اور خیریت دریافت کی۔ یہودی کی بیوی نے بتلایا کہ میرا شوہر کئی ماہ سے سفر پر گیا ہوا ہے۔ اس عرصے میں میرے ہاں ولادت ہوئی ہے۔ رات بھر وہی بچہ روتا رہا ہے۔ سلطان نے بچے کے رونے کی وجہ دریافت کی تو عورت نے بتلایا کہ گھر میں اندھیرا رہتا ہے۔ میں ٹھہری پردہ نشین عورت۔ مفلسی الگ

مسلط ہے۔ کوئی تیل لانے والا ہے نہ تیل منگانے کے لئے پیسے۔ تھوڑا بہت غلہ جو میرا شوہر جاتے وقت گھر میں رکھ گیا تھا اسی پر گذارا ہے۔ فجر کی اذان ہو چکی تھی عورت کا جواب سُن کر سلطان مسجد چلے گئے۔ اس دن سے ایسا لگا جیسے کہ عورت کے گھر میں بہار آ گئی ہو۔ ضرورت کی ہر چیز سلطان بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کے گھر سے پہنچنے لگی۔ شام ہوتی تو اللہ کا وہ ولی جسے دنیا آج تک سلطان العارفین کے نام سے جانتی اور مانتی ہے۔ ہاتھ میں تیل کی کُپّی لئے یہودی کے دروازے پر کھڑا رہتا کہ کہیں اس کا مکان تاریک نہ رہ جائے اور اس کا بچہ اندھیرے میں رونے نہ لگے۔ کئی مہینے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ یہودی پڑوسی سفر سے واپس آ گیا۔ وہ دل میں سوچتا آیا تھا کہ گھر میں تو بہت تکلیف ہوئی ہو گی کیونکہ میں خرچ محدود دے کر گیا تھا۔ لیکن جب اس کی بیوی نے بتلایا کہ تکلیف اٹھانے کی نوبت نہ آئی۔ اور سلطان بایزید اور ان کے گھر والے مسلسل اس کی اور اس کے بچے کی دیکھ بھال کرتے رہے تو یہودی بہت خوش ہوا۔ شکریہ ادا کرنے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ میرے عزیز! شکریہ کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کیا۔ اگر میں یہ نہ کرتا تو سخت گناہگار ہوتا۔ کیونکہ ہمارے دین میں پڑوسی کے بڑے حقوق ہیں۔ یہودی نے سلطان بایزید کا ہاتھ تھام کر عرض کیا۔ حضور! مجھے بھی اسی دین کی چادر رحمت میں چھپا لو اور اسی آقا کا کلمہ پڑھا دو جن کی غلامی کے سبب آج تم اس بلند مرتبے پر فائز ہو۔

نگاہِ مردِ مومن

بڑی محنت اور جانفشانی سے نقب لگانے کے بعد جب چور شیخ احمد خضرویہ کے گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوا کہ گھر میں کوئی ایسی چیز ہی نہیں ہے جسے چرا کر لے جانے کے بعد اُسے کوئی مالی فائدہ ہو۔ دیکھا کہ ایک بوریا پر ایک بوڑھا شخص گدڑی لپیٹے پڑا ہے اور مٹی کا ایک لوٹا اور مٹی ہی کا ایک آبخورہ اس کے سرہانے رکھا ہوا ہے۔ باقی مکان خالی ہے۔ نا اُمید اور مایوس ہو کر جب چور مکان سے نکلنے لگا

تو شیخ احمد خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے آواز دی۔ بھائی! تو نے سامان اور نقدی کی تلاش میں بڑا وقت ضائع کیا اب کہاں جا رہا ہے۔ جو کہتا ہوں وہ کر۔ وہ لوٹا لے۔ کنویں سے پانی نکال کر وضو کرلے اور نماز میں مشغول ہو جا۔ صبح اگر کہیں سے روپیہ آ جائے گا تو تجھے دے دوں گا کیونکہ یہ اچھا نہیں لگتا کہ تو فقیر کے گھر سے خالی ہاتھ واپس چلا جائے۔ شیخ نے کچھ ایسی شفقت اور ہمدردی سے یہ بات کہی کہ چور کے دل میں اطاعت و فرماں پذیری کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اس میں اثر ہوتا ہے۔ چور نے بجائے بھاگنے کے شیخ کے حکم کی تعمیل میں لوٹا اٹھایا کنویں پر گیا وضو کیا اور مصلے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اب مصلے پر گناہ گار تھا اور اس کے سامنے تواب الرحیم رب۔ جس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ کافر ہو۔ فاسق ہو۔ بدکار ہو۔ نافرمان ہو۔ سیہ کار ہو۔ کوئی بھی ہو جب ہر طرف سے تھک ہار کر اس کے دروازے پر آکر گر پڑتا ہے تو وہ اپنے بندے کی ضرور دستگیری فرماتا ہے۔ کہ اس کی درگاہ ناامیدی کی درگاہ نہیں ہے۔ چور جب مصلے پر کھڑا ہوا تو اس طرح مشغول ہوا کہ صبح ہو گئی اور اسے پتہ بھی نہ چلا۔ علی الصباح ایک شخص ایک سو دینار لے کر شیخ احمد خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نذر گزرانی شیخ نے دینار لے کر چور کو بلایا اور اسے دینار دے کر فرمایا تم نے رات اللہ تعالیٰ کی نماز پڑھی ہے تو تمہارے رب نے اس عبادت کے صلے میں تمہیں یہ مزدوری عطا فرمائی ہے مگر رب تبارک تعالیٰ کے فضل و کرم اور شیخ کی توجہ کی بدولت اب چور کا باطن منور ہو تھا۔ ندامت کے آنسوؤں نے اس کے نامۂ اعمال کی سیاہی کو دھو دیا تھا۔ شیخ کے قدموں پر گر پڑا۔ عرض کی۔ حضور! مجھے درہم و دینار نہیں چاہئیں۔ مجھے تو نماز کا ایسا طریقہ بتلایئے کہ نماز میں لطف آنے لگے۔ ہر صلے اور انعام سے بے پروا صرف اپنے معبود کے در کا گدا اور صرف اس کی سرکار کا بھکاری بنا رہوں۔ شیخ! آپ نے مجھے مصلے پر کھڑا کیا ہے تو اس کے آداب بھی سکھایئے! کہ مالک کی بارگاہ ادب کی بارگاہ ہے۔ حضرت شیخ احمد خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ نے چور سے توبہ کرائی اور آداب عبودیت سکھائے۔ چند سال بھی نہ گزرے تھے کہ وہی چور جو نقب لگا کر چوری

کی نیت سے شیخ کے گھر میں گھسا تھا اب خود درویش کامل اور مرجع خلائق بن چکا تھا۔ نگاہ مرد مومن سے تقدیریں اسی طرح بدلا کرتی ہیں۔

حاجت روائی

حقیقی توحید یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کیا جائے کیونکہ غیر اللہ سے سوال کرنا خدا سے منہ پھیرنا ہے اور جب بندہ خدا سے منہ موڑتا ہے تو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ درگاہ الٰہی سے رد نہ کر دیا جائے۔ کسی دنیا دار نے رابعہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا سے کہا کہ رابعہ! اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتلائیں میں آپ کی ضرورت پوری کر دوں گا۔ رابعہ نے فرمایا! اے شخص! دنیا تو میں خالق دنیا سے بھی مانگتی ہوئی شرماتی ہوں بھلا اپنے جیسے انسان سے دنیا کیا مانگوں گی۔

شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ خلیفہ ابو مسلم کے زمانے میں ایک درویش کو بے قصور چوری کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور اسے جیل میں بند کر دیا گیا۔ اسی رات ابو مسلم نے خواب میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابو مسلم! اللہ عزّوجل نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے کہ میرا ایک دوست بے قصور تیری قید میں ہے۔ ابھی اُٹھ اور اسے جیل سے باہر نکال۔ ابو مسلم فوراً اپنے بستر سے الگ ہو گیا اور ننگے سر ننگے پاؤں دوڑتا ہوا جیل خانہ پہنچا۔ حکم دیا کہ درویش کو فوراً رہا کیا جائے۔ جیل کا دروازہ کھولا گیا اور درویش کو باہر لایا گیا۔ ابو مسلم نے درویش سے معافی مانگی اور اسے عزت واکرام سے رُخصت کرنے لگا۔ رُخصتی کے وقت اس نے درویش سے کہا کہ اگر آپ کی کوئی حاجت ہو تو مجھ سے فرمائیں۔ میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ امیر ابو مسلم کی بات سُن کر درویش مسکرایا اور کہا اے امیر! جس کا مالک ایسا ہو کہ آدھی رات کو ابو مسلم کو اپنے بستر سے اٹھائے اور اسے بھیجے تاکہ اپنے بندے کو تکلیف اور ایذا سے نجات دلائے اس کے لئے بھلا یہ کب جائز ہو گا کہ وہ دوسروں سے۔

سوال کرتا پھرے اور ان کے سامنے اپنی حاجت پیش کرے۔ درویش کا قلب نورِ ایمان سے منور تھا۔ ذات خداوندی پر کامل اعتماد اور توکل نے اُسے ایقان و ایمان کا پہاڑ بنا دیا تھا۔ وہ صرف ایک در کا گدا تھا۔

(ایک سجدۂ نیاز نے اسے دنیا کے تمام سجدوں سے بے نیاز کر دیا تھا)۔ توحید حقیقی اس کی رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھی۔ چونکہ وہ اللہ کا ہو چکا تھا۔ اس لئے اللہ بھی اس کا تھا۔ اس نے کمال بے نیازی سے ابو مسلم کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تو ابو مسلم کو اپنی حقیقت اور دنیوی اقتدار کی حیثیت کا احساس ہوُا۔ جس وقت درویش یہ کہہ کر اپنی کٹیا کی طرف روانہ ہوُا ابو مسلم کی داڑھی پر آنسوؤں کی برکھا برس رہی تھی۔ شاید عرفان حقیقت کی یہ پہلی منزل تھی جسے ابو مسلم طے کر رہا تھا۔

باب ہفتم

عدل و مُساوات

عدل وانصاف

خیبر فتح ہونے کے بعد حضور ﷺ سے وہاں کے یہودی کاشت کاروں نے درخواست کی کہ اگر آپؐ خیبر کی زمینوں کو حسبِ سابق ہمارے قبضے میں چھوڑ دیں تو ہم آپؐ سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ پیداوار کا نصف ہم آپؐ کو دیا کریں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس تجویز کو قبول فرمالیا اور زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہو گئی۔ اس وقت سے یہ معمول بن گیا کہ جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو حضورِ اکرم ﷺ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خیبر بھیج دیتے اور وہ ایمان داری کے ساتھ پیداوار کے دو حصے کر دیتے اور ان سے کہہ دیتے کہ ان دو حصوں میں سے جو چاہو لے لو۔ زمانۂ قدیم سے یہودیوں میں رشوت دینے اور لینے کا رواج تھا۔ دولت کی ناہموار تقسیم نے انکے درمیان اونچے اور نیچے دو طبقے پیدا کر دیئے تھے۔ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو چکا تھا۔ قانون کی زد سے بچنے کے لئے وہ اعلانیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے کاہن اور قاضی انتہائی بے شرمی سے رشوت کو حق المحنت سمجھ کر لیا کرتے۔ وہ رشوت میں اس قدر ملوث ہو چکے تھے کہ رشوت کی خاطر تورات کے احکام میں تحریف کرنے سے بھی باز نہ آتے۔ علامہ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہودی رؤسا، اپنے علماء کو اس لئے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے جو اوصاف اور آپؐ کی بابت جو پیش گوئیاں تورات میں موجود ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتلائیں۔ دولتِ دُنیا کے پجاری علماء محض دولت کمانے کے لئے کتمانِ حق کرتے۔ اس طرح رشوت جیسی لعنت ان کے معاشرے میں پوری طرح سرایت کر چکی تھی اور رشوت لینا اور دُنیا ان کے نزدیک کوئی معیوب کام نہیں رہ گیا تھا۔ چونکہ عادت پڑی ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھی پرچانا چاہا اور جب حضرت عبداللہ بن رواحہؓ خیبر کی پیداوار کو تقسیم کرنے کے لئے پہنچے تو انہوں نے آپس میں چندہ اکٹھا کیا۔ عورتوں سے

زیورات بھی لئے۔ ساری رقم اکٹھی کی اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پیش کر دی۔ پہلے پہلے تو حضرت عبداللہؓ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا ہے انہوں نے یہودی سرداروں سے دریافت کیا تو انہوں نے بتلایا کہ "آپ اسے قبول کر لیں اور اس کے بدلے میں تقسیم میں ہمارا حصّہ بڑھا دیں۔" اب حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اندازہ ہوا کہ یہ لوگ مجھے رشوت دینا چاہتے ہیں۔ چہرہ تمتما اٹھا اور چہرے پر مومنانہ جلال ایک شعلۂ جوالہ بن کر کوندنے لگا۔ فرمایا :

"یہودیو! قسم ہے خدائے واحد و لایزال کی۔ خدا کی ساری مخلوق میں مجھے تم سب سے زیادہ مبغوض ہو لیکن میرا یہ بغض مجھے تمہارے ساتھ ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ رشوت کی یہ رقم جو تم میرے سامنے پیش کر رہے ہو تو سُن لو کہ یہ حرام ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ خنزیر حرام ہے۔ ہم مسلمان رشوت نہیں کھاتے اس لئے کہ ہمارے نبی فداہ ابی وامی نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ رشوت دینے والے پر اس لئے کہ وہ رشوت دے کر جرم کی اعانت کرتا ہے اور جرم کی اعانت قانوناً و اخلاقاً دونوں حیثیت سے منع ہے۔

یہودی سردار سر جھکائے متعجبانہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گفتگو سنتے رہے۔ جب انہوں نے اپنی گفتگو ختم کی تو انہوں نے یک زبان ہو کر کہا: "یہی وہ انصاف ہے جس سے آسمان و زمین قائم ہیں"۔

عدلِ فاروقی

اگر وہ خود کو بڑا آدمی سمجھتا تھا تو غلط نہیں تھا۔ بڑے باپ کا بیٹا بڑا ہی ہوتا ہے اس کا باپ ملک مصر کا گورنر تھا۔ ہر کوئی اس کی عزت کرتا۔ جب بازار سے اس کی سواری گزرتی تو لوگ اسے سلام کرتے اور عزت و تکریم سے پیش آتے۔ دراصل عزت حاصل کر لینا اتنا مشکل کام نہیں جتنا کہ عزت پانے کے بعد اپنے نفس پر قابو رکھنا مشکل ہے۔ جاہ و منصب پا لینے کے بعد بڑے بڑے بڑوں کا ہوش درست نہیں رہتا۔

لوگ اپنی حقیقت اور حقیقی عزت دینے والے کو فراموش کر دیتے ہیں اور پھر ان کی تباہی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جاہ و منصب پا لینے کے بعد اپنے جامے میں رہنا اور دوسروں کو حقیر نہ گردانا ہی انسان کو عزّت دوام عطا کرتا ہے۔ شجر ثمر بار ہی جھکا رہتا ہے اور اس کی یہ عاجزی ہی اسے مولائے کائنات کے دربار میں مقبولیت بخشتی ہے، مگر مصر کے گورنر کا بیٹا ایسا نہیں تھا وہ خود کو بہت بڑا آدمی سمجھتا اور دوسروں کو اپنے مقابلے میں ہیچ۔ ایک دن بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک دیہاتی کی کوئی بات اسے ناگوار گزری، کوڑا ہاتھ میں سنبھالا اور اس بے چارے کو دھنک کر رکھ دیا۔ غریب دیہاتی کرتا تو کیا کرتا۔ خاموش کھڑا پٹتا رہا۔ زخموں سے چُور اور قلب رنجور کے ساتھ اپنے گاؤں چلا آیا۔ گورنر عمرو بن العاص رضؓ کے بیٹے کے خلاف کس سے فریاد کرتا۔ بھلا کہیں پلکوں کی شکایت آنکھوں سے کی جا سکتی ہے؟ چند ماہ گزرنے کے بعد اتفاقاً اسے کسی ضرورت کے تحت مدینہ جانا پڑا۔ کسی نے اسے مشورہ دیا کہ یہ داستانِ غم حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سُنائے۔ بعض لوگوں کی حوصلہ افزائی پر اس نے دربارِ خلافت میں حاضر ہو کر پوری داستان سُنائی۔ فوراً فرمان صادر ہوا۔ مصر کے گورنر کو حکم دیا گیا کہ فوراً اپنے بیٹے کو دار الخلافت روانہ کرو اور قلیل ترین عرصے میں گورنر کا بیٹا دربارِ خلافت میں حاضر تھا۔ مقدمہ پیش ہوا۔ فریادی نے فریاد کی اور جلد ہی گورنر کے بیٹے نے اقبالِ جرم کر لیا۔ خلیفہ نے کوڑا دیہاتی کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا کہ اس ظالم سے اپنا بدلہ لے لو۔ ایک طرف گورنر کے بیٹے کی ننگی پیٹھ تھی اور دوسری طرف ایک دیہاتی کا کوڑا۔ کوڑا پیٹھ پر برس رہا تھا اور عالم ملکوت کے باسی آسمان کے جھروکوں سے جھانک کر حیرت و استعجاب سے عدلِ فاروقی کے اس نادر مظاہرے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ سزا جب پوری ہو گئی تو فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے ایک ایسا جملہ نکلا جسے تاریخ چودہ سو برس سے بطور امانت اپنے حافظے میں محفوظ کئے ہوئے ہے:

"عمرو بن العاص رضؓ کے بیٹے! جنہیں ان کی ماؤں نے آزاد جنم دیا تھا۔ تجھے یہ کس نے اختیار دے دیا ہے کہ تو انہیں اپنا غلام بنا لے۔ رعایا حکمران کی غلام نہیں ہوتی۔

حکمران رعایا کا خادم و نگران ہوتا ہے"۔

غیر مسلموں سے حُسنِ سلوک

لشکرِ اسلام آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ریگ زارِ عرب کے بادیہ نشینوں کا سیلِ رواں کہیں تھمتا ہی نہیں تھا۔ دمشق، حمص اور شام کے بڑے بڑے شہروں پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ حالانکہ ان علاقوں کے اکثر باشندے عیسائی یا یہودی تھے۔ مگر مسلم فاتحین نے کبھی کی جان و مال اور عزت و آبرو کو نقصان نہ پہنچایا صرف انہی سے نبرد آزما ہوئے جو اُن سے لڑنے کے لئے میدان میں آئے تھے۔ جب یہ شہر فتح ہو گئے تو اسلام کے عادلانہ نظام کے تحت غیر مسلموں پر ان کی جان و مال اور عقیدہ و ایمان کی حفاظت کے عوض جزیہ عائد کر دیا گیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی لشکر شہر پر حملہ آور ہو گا تو وہ غیر مسلم اپنے گھروں میں محفوظ رہیں گے، نہ انہیں لڑنا ہو گا اور نہ ان پر حفاظت کے سلسلے میں کسی قسم کی ذمے داری ہو گی۔ اسلامی لشکر ان کی حفاظت کا فریضہ انجام دے گا۔ غیر مسلموں سے جزیہ کی یہ تھوڑی سی رقم اسی حفاظت کے عوض میں لی جاتی ہے۔ جزیہ وصول کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد اسلامی لشکر کو یہ اطلاع ملی کہ ہرقلِ رُوم نے ایک لشکرِ جرار تیار کیا ہے اور وہ اسے مسلمانوں کے خلاف ایک فیصلہ کُن معرکے میں اتارنے والا ہے۔ دارالخلافہ کو مطلع کیا گیا تو وہاں سے حکم نامہ آیا کہ شام کے اکثر مفتوحہ علاقے خالی کر دیئے جائیں اور سارا اسلامی لشکر ایک ہی مقام پر جمع ہو کر ہرقلِ رُوم کی تیار کردہ بھاری فوجی طاقت کا مقابلہ کرے۔
حکم نامہ کے ملتے ہی اسلامی لشکر نے مفتوحہ علاقے یعنی دمشق اور حمص وغیرہ کو خالی کرنا شروع کیا۔ لیکن ایک سال کا جزیہ تو حفاظت کے عوض غیر مسلموں سے وصول کیا جا چکا تھا اور اب اسلامی لشکر جنگی مصلحتوں کے تحت شہر خالی کرنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے حمص کے باشندوں کو، حضرت ابو عبیدہؓ نے دمشق کے ذمیوں کو اور دوسرے شہروں کے کمانڈروں نے اپنے اپنے مفتوحہ علاقوں کے شہریوں کو جمع کر کے فرمایا۔
ہم نے آپ لوگوں سے جو جزیہ کی جو رقوم لی تھیں وہ اس لئے تھیں کہ ہم آپ کی جان و مال

کی حفاظت کریں گے اور بیرونی حملہ آوروں سے آپ کا بچاؤ کریں گے۔ لیکن اب ہم آپ سے جُدا ہو رہے ہیں اور آپ کی حفاظت اور دفاع نہیں کر سکتے۔ اس لئے یہ آپ کی رقومات ہیں آپ انہیں اٹھالیں ہم انہیں واپس کر رہے ہیں۔

ان علاقوں کے عیسائیوں اور یہودیوں نے اس کا جو جواب دیا وہ آج بھی تاریخ کے حافظے میں موجود ہے۔ انہوں نے کہا:

"اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو فتح یاب کرے اور یہاں دوبارہ لوٹائے۔ آپ کی حکومت اور آپ کے عدل نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ کیونکہ ہم مذہب ہونے کے باوجود ہمیں رومیوں کے جور و ظلم کے بڑے تلخ تجربات ہوئے ہیں۔ خُدا کی قسم اگر تمہاری جگہ وہ لوگ ہوتے تو وہ ہم سے لئے ہوئے اموال میں سے ایک کوڑی بھی نہ لوٹاتے، بلکہ اپنے ساتھ وہ تمام چیزیں بھی اٹھا کر لے جاتے جنہیں وہ اُٹھا سکتے تھے۔

اسلامی نظامِ عدل

وہ کوئی ایرا غیرا نہیں تھا۔ شاہزادہ تھا اور امید کی جا رہی تھی کہ عنقریب باپ کے بعد تختِ حکومت پر متمکن ہو گا۔ اس کا حکم بھی سلطان کے حکم کے برابر مانا جاتا۔ معاملات میں بھی کھرا تھا۔ لہٰذا اگر اس نے کسی تاجر سے ساٹھ ہزار کا مال خرید لیا تھا اور وعدہ کر دیا کہ جلد ادائیگی کر دوں گا۔ تو یہ کوئی بُری بات نہ تھی۔ تاجر کو شاہزادے کے قول اور وعدے پر اعتماد کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن بے چارا تاجر کسی قدر تھُڑدلا تھا، گھبرا گیا اور سلطان محمودؒ کے دربار میں حاضر ہو کر عرض کیا جہاں پناہ! میرا مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش کر دیا جائے تاکہ میں انصاف حاصل کر سکوں۔ شاہزادہ مسعود نے مجھ سے ساٹھ ہزار دینار کا مال خریدا تھا اور قیمت کے بارے میں وعدہ کیا تھا کہ جلد ادا کر دوں گا۔ مجھے وطن واپس جانا ہے، کاروباری آدمی ہوں، تاخیر ہونے سے مجھے نقصان ہو گا۔ مجھ میں ہمت نہیں کہ شاہزادے کے پاس جا کر بار بار رقم کا تقاضا کروں۔ مبادا ناگوارِ خاطر ہو۔ اس لئے آپ کے دربار میں آیا ہوں۔ آپ کا شہرہ سُنا ہے کہ آپ کے دَر سے سائل محروم نہیں

جاتا. ہر شخص کو انصاف ملتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری دشوار نہیں۔ آپ کے کان رعایا کی فریاد کی طرف لگے رہتے ہیں میری مدد فرمائیں۔ میری رقم دلوانے کے لئے قاضیٔ شہر کی عدالت کی طرف رجوع کرنے کی اجازت دیں سلطان محمود غزنویؒ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اس لئے نہیں کہ تاجر نے اس کے بیٹے کی شکایت کی تھی بلکہ اس لئے کہ شہزادہ مسعود نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا کہ رعایا کے ایک فرد کو تکلیف پہنچی۔ فوراً شہزادہ مسعود کو پیغام بھیجا "یا تو تاجر کا حق ادا کرو یا قاضی کی عدالت میں حاضر ہو کر فیصلہ کراؤ۔" ادھر تاجر نے قاضی کی عدالت کا رُخ کیا۔ ادھر شہزادہ باپ کا فرمان پا کر پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنے خزانچی کو بُلا کر دریافت کیا میرے خزانے میں کتنی رقم ہے؟ خزانچی نے بتلایا "بیس ہزار دینار۔" شہزادے نے حکم دیا کہ "یہ بیس ہزار دینار تو ابھی تاجر کے حوالے کر دو اور اس سے تین روز کی مہلت مانگ لو۔" ساتھ ہی اس نے ایک قاصد سلطان کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ "بیس ہزار دینار تو ابھی تاجر کے پاس بھجوائے جا رہے ہیں۔ بقیہ رقم تین روز میں ادا کی جائے گی۔ مَیں کپڑے پہن کر تیار بیٹھا ہوں جس وقت جنابِ والا طلب فرمائیں گے مجلسِ خاص میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

سلطان محمود غزنویؒ نے قاصد سے کہا "جا کر شہزادے کو میرا پیغام دے دینا کہ وہ میری صورت اس وقت تک نہ دیکھے جب تک تاجر کی پوری رقم ادا نہ کر دے۔" یہ بات سُن کر شہزادہ اور بھی پریشان ہوا اور اپنے قاصد کو ہر طرف بھیج کر قرض منگوائے اور ظہر کی نماز کے وقت تاجر کو ساٹھ ہزار دینار مل گئے۔ اب شہزادے کو اجازت ملی کہ دربارِ شاہی میں باریاب ہو کہ عدلِ اسلامی کا تقاضا یہی تھا۔ اسلامی نظامِ عدل میں فرقِ مراتب کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ انصاف کے تقاضے بہر حال اور بہر صورت پورے کئے جاتے ہیں۔ چاہے کوئی شہزادہ مسعود غزنوی کہ ایک فقیرِ بے نوا۔

عدل و انصاف

امیرالامراء اسدالدین شیرکوہ نے اپنے تمام ماتحت امراء کو بلا کر کہا کہ اگر تم میں سے کسی کی وجہ سے مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑا تو میں اسے سولی پر چڑھا دوں گا اور کوئی داد فریاد نہیں سنوں گا۔ امیرالامراء کی گفتگو سن کر سارے امراء جو چند گھنٹے پہلے ظلم و جبر کے پیکر اور قوت و شان کے نشے میں بدمست تھے لرزہ براندام ہو گئے۔

انسان کو صرف ایک چیز راہِ راست پر رکھتی ہے اور وہ ہے خوفِ خدا۔ اگر دل سے خوفِ خدا رخصت ہو جائے تو انسان اور درندے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ سلطان نورالدین نے جب مستقلاً دمشق میں قیام کر لیا تو اس کے توسط سے بہت سے امراء وہاں آباد ہو گئے۔ ان امراء نے پڑوسی زمینداروں کو ڈرا دھمکا کر بہت سی املاک اور جائیدادیں بنالی تھیں۔ قاضی کمال الدین کے پاس روزانہ سینکڑوں استغاثے آنے لگے۔ قاضی صاحب امراء کی تو کوئی رعایت نہ فرماتے۔ لیکن امیرالامراء اسدالدین شیرکوہ کے جاہ و اقتدار کی وجہ سے اس کے خلاف کارروائی میں قاضی صاحب کو دشواری پیش آتی۔ اس لئے انہوں نے سلطان نورالدین کی ادھر توجہ دلائی۔ سلطان بڑا انصاف پسند حکمران تھا۔ اس کا تو عقیدہ تھا کہ مملکت کی بنیاد ہی عدل و انصاف پر ہے۔ چنانچہ اس نے امراء کے مقدموں کی سماعت کے لئے دمشق میں ایک عدالت قائم کی اور اس میں خود بیٹھنا شروع کیا تاکہ امراء کے خلاف مقدمات کی سماعت کر سکے۔

امیرالامراء اسدالدین شیرکوہ سمجھ گیا کہ یہ سارا اہتمام اسی کی وجہ سے کیا گیا ہے اس لئے اس نے اپنے تمام امراء کو بلا کر کہا کہ جس قیمت پر ہو سکے مدعیوں کو رضامند کرو۔ امراء نے کہا سردار! اگر مدعیوں کو معلوم ہو گیا تو ان کے مطالبات بہت بڑھ جائیں گے۔ اسدالدین شیرکوہ نے کہا میری کل املاک کا ہاتھ سے نکل جانا مجھے گوارا ہے لیکن یہ گوارا نہیں کہ میں سلطان نورالدین کے سامنے ایک ظالم امیر کی شکل میں پیش ہوں۔ آخر کار تین دنوں تک ایک مقدمہ بھی پیش نہ ہوا اور جب نورالدین نے قاضی کمال الدین

سے دریافت کیا اور اسے پتہ چلا کہ علاقہ سے ظلم کا خاتمہ ہوگیا ہے تو سجدہ شکر بجالایا اور کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میرے ساتھی خود ہی انصاف کر لیتے ہیں اور ان کو میرے پاس آنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

مسندِ قضا کے تقاضے

قاضی محمد بن عمر نے مدعیان کے بیانات سننے کے بعد جب اپنے پیش کار ابن نمر سے سمن لکھنے کو کہا تو پیش کار کانپ اٹھا۔ اس نے کہا حضور! ذرا سوچ سمجھ کر سمن لکھوائیں۔ اتنا اہم اور خطرناک قدم آپ اٹھائے جا رہے ہیں۔ آپ نے نہ تو غور کیا نہ کسی سے مشورہ کیا۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟۔

جنابِ والا! عہدہ تو عہدہ آپ کی تو جان کے لالے پڑ سکتے ہیں۔ کم از کم آپ میرے اوپر تو رحم کریں میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ اگر میں مارا گیا تو میرے بچوں کو سہارا دینے والا کون ہوگا؟ میں معافی چاہتا ہوں براہِ کرم آپ یہ سمن کسی دوسرے سے لکھوالیں۔

قاضی محمد بن عمر پیش کار کی باتیں سن کر خوفزدہ ہونے کے بجائے طیش میں آگئے۔ فرمایا میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جو عبارت میں لکھوا رہا ہوں اسی عبارت میں خلیفہ کے نام سمن جاری کرو۔ میں جس منصب پر فائز ہوں میرے اوپر واجب ہے کہ اس کے تقاضے پورے کروں۔ فریادیوں نے فریاد کی ہے۔ میں دعوے کی سماعت کر چکا۔ گواہوں نے بیانات دے دیئے۔ مدعا علیہ چاہے بڑے سے بڑا آدمی ہو مجھے تو ازروئے شرع فیصلہ کرنا ہوگا۔ نتیجہ کیا ہوگا مجھے اس کی فکر نہیں۔ فرض جب پکارے تو فرض کی پکار کا جواب دینا ایک حاکم کے کردار کا اہم ترین جزو ہے۔ خلیفہ منصور عباسی خلیفہ ہے تو ہوا کرے۔ اس نے جب اونٹ والوں سے بار برداری کا کرایہ طے کیا تھا اور خلیفہ کی مرضی کے مطابق اس کا مال و اسباب ساربانوں نے لاد کر مدینہ پہنچا دیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ طے شدہ مزدوری اونٹ والوں کو ادا کر دے، اس نے کیوں نہیں ادا کی۔ لہٰذا تم خلیفہ منصور عباسی کے نام میری

جانب سے سمن جاری کرو کہ کل وہ فلاں وقت میری عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرے۔ پیش کار بے چارا روتا پیٹتا رہا مگر قاضی محمد بن عمر نہ مانے اور اس کو اتنا مجبور کیا کہ اسے تعمیل کرنا پڑی۔ جب ابن نمر پیش کار سمن لکھ چکا تو قاضی نے حکم دیا کہ اب یہ سمن تم ہی منصور کے پاس لے جاؤ۔ اس لئے کہ وہ اس وقت مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ ہلتا کانپتا ابن نمر سمن لے کر خلیفہ کی قیام گاہ پر گیا اور پہلے خلیفہ کے وزیر ربیع کو ساری رُوداد سُنائی۔ ربیع نے ابن نمر کو فوراً خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا۔ سمن پڑھ کر منصور میں ذرا بھی تغیر نہ پیدا ہوا۔ اس نے کہا کہ تم اعلان کر دو کہ قاضی کے حکم کے مطابق میں مدعا علیہ بن کر کل عدالت میں حاضر ہوں گا اور کوئی شخص بھی میرے ساتھ نہ چلے۔ دوسرے دن منصور وقت مقررہ پر عدالت میں حاضر ہوا۔ جب مقدمہ پیش ہوا تو سماعت کے بعد فوراً ہی قاضی نے خلیفہ منصور کے خلاف مدعیوں کو ڈگری دلوا دی اور حکم دیا کہ خلیفہ ساربانوں کو فی القوران کی مزدوری کی رقم ادا کرے۔ رقم ادا کرنے کے بعد منصور آگے بڑھا قاضی سے بغل گیر ہوا اور کہا قاضی محمد بن عمر! اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے کسی خوف و خطر کے بغیر اسلامی عدل کے تقاضوں کو پورا کیا اگرچہ آپ نے میرے خلاف فیصلہ دیا ہے لیکن آپ کا یہ اقدام مجھے اتنا پسند آیا کہ میں نے حکم دے دیا ہے کہ بیت المال سے آپ کو ایک لاکھ درہم بطور انعام کے ادا کئے جائیں۔

اسلامی مساوات —— معیارِ فضیلت

جب اسلامی لشکر مصر کے علاقے میں دُور دُور تک پہنچنے لگا تو مقوقس شاہِ مصر بوکھلا اٹھا اور اس نے خواہش کی ظاہر کی کہ مسلمانوں کا کوئی وفد اس سے ملاقات کرکے اسے بتلائے کہ آخر مسلمان چاہتے کیا ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی نے دس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد اس سے ملاقات کرنے کے لئے بھیجا اور وفد کا سربراہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر کیا۔ حضرت عبادہ رضی طویل القامت

اور سیاہ فام آدمی تھے۔ جب یہ وفد مقوقس کے دربار میں پہنچا اور بحیثیت قائد وفد کے حضرت عبادہؓ آگے بڑھے تو ان کی شکل و شباہت اور قدو قامت دیکھتے ہی مقوقس ہیبت زدہ ہوگیا اور اس نے وفد کے دوسرے ارکان سے کہا کہ خُدا کے لئے اس سیاہ فام کو تو مجھ سے دُور ہی رکھو۔ مجھے تو اسے دیکھ کر ہی وحشت ہو رہی ہے۔ کسی دوسرے آدمی کو سامنے لاؤ۔ وفد کے ارکان نے بیک زبان کہا کہ "بادشاہ! یہ شخص علم و فہم کے اعتبار سے ہم سب پر فائق ہے۔ دین کے ساتھ اس کی بے پناہ محبت ضرب المثل ہے۔ اس کے تقویٰ اور پاکیزگی کا بڑے بڑوں کو اعتراف ہے۔ یہ ہمارے سربراہ ہیں۔ ہم لوگ تمام معاملات میں ان کی رائے کی طرف رجوع کرتے اور ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے امیر نے انہیں کچھ خاص ہدایات دی ہیں اور ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ان کی رائے کی خلاف ورزی نہ کریں۔ مسلمان ارکان کی یہ گفتگو مقوقس کو کچھ عجیب سی لگی۔ اس نے ارکانِ وفد سے کہا کہ آخر تم لوگ اس بات پر راضی کیسے ہوگئے کہ ایک سیاہ فام تمہارا امیر بنے۔ اسے تو تمہارے ماتحت ہونا چاہیئے تھا۔ وفد نے جواب دیا بادشاہ! اصل بات یہ ہے کہ تو ہمارے دین کی تعلیمات سے ناواقف ہے۔ ہمارے دین میں وجہِ فضیلت رنگ و نسل نہیں نہ قبیلہ و خاندان ہے۔ ہمارے دین میں فضیلت کا معیار علم و تقوےٰ اور بصیرت و شرافتِ نفس ہے۔ یہ شخص علم اور رائے، نیکی اور پرہیز گاری کے اعتبار سے ہم سب سے زیادہ افضل ہے۔ رہی سیاہ فامی تو یہ ہمارے معاشرے میں کوئی عیب نہیں۔ یہ باتیں سُن کر مقوقس نے کہا۔ اے سیہ فام آگے آؤ۔ لیکن بات ذرا نرمی سے کرنا۔ کیونکہ تمہاری ظاہری شکل و شباہت ہی دیکھ کر میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو رہی ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ مسکرائے اور فرمایا: بھائی! ہماری فوج میں تو ایک ہزار ایسے سیاہ فام موجود ہیں جو مجھ سے بھی زیادہ سیاہ فام ہیں۔ چمڑے کا رنگ ہمارے دین میں معیار نہیں بلکہ سینے کے اندر دھڑکنے والا گوشت کا وہ لوتھڑا جسے دل کہتے ہیں اہمیت کا حامل ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہی تو فرمایا تھا کہ لوگو! انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ اگر وہ صحیح ہے تو سارا جسم صالح ہے اور اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ کان کھول کر سن لو! کہ "وہ دل ہے"۔

اسلامی معاشرہ

عین اس وقت جب کہ امیر عید الفطر کی نماز پڑھا رہے تھے۔ قشتالیہ کے عیسائی بادشاہ کے ایک فرستادہ نے صف کے اندر سے نکل کر امیر پر قاتلانہ حملہ کیا اور چند ہی لمحوں بعد امیر کی زندگی ان سے رُوٹھ گئی۔ غرناطہ شہر ہی نہیں بلکہ پوری مملکت ماتم کدہ بن گئی۔ ریاست غرناطہ کے پچاس لاکھ باشندے ایسا محسوس کر رہے تھے گویا کہ وہ یتیم ہو گئے۔ امیر کی موت پر جتنا ماتم ہوا شاید ہی کسی شخص کی موت پر ہوا ہو۔ پورا ملک ایک سال تک روتا رہا۔ یہ رونے کی بات ہی تھی۔ امیر کے دَور میں کیا کچھ نہ ہوا۔ علوم و فنون کو ترقی ہوئی۔ شریعت حقّہ کی روشنی میں ملک کا دستور مرتب کیا گیا۔ حکام کو عوام سے برتاؤ کرنے کے انداز سکھائے گئے۔ ان کے ذہن میں عوام کی خدمت کرنے کا احساس پیدا کیا گیا۔ امیر نے ہر بستی میں جہاں بارہ آدمی بھی بستے تھے ایک مدرسہ اور ایک مسجد سرکاری خرچ سے تعمیر کی تھی۔ مسجد کا امام بچوں کا معلّم بھی تھا اور انسانی کردار کا محافظ بھی۔ وہ صرف بچوں ہی کو تعلیم نہیں دیتا تھا بلکہ ان کے والدین کو بھی اچھے اخلاق سکھاتا۔ امیر نے نماز کو انسانی فرائض میں سے اہم فریضہ قرار دے دیا تھا۔ غرناطہ میں کوئی ایسی بستی نہ تھی جس کے باشندے حکماً مسجد میں نمازِ جمعہ کے لئے جمع نہ ہوتے ہوں۔ امام جُمعہ کی نماز میں شریک ہونے والوں کو اسلام کے مجلسی آداب بھی سکھاتے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنے کا حکم دیتے۔ اگر بستی کا کوئی شخص بیماری کے سبب نمازِ جُمعہ میں شریک نہ ہوتا تو امام پوری جماعت کے ساتھ نماز کے بعد اس کی بیمار پُرسی کے لئے جاتا۔ ہر بستی کے صحت مند اور مال دار افراد حکماً اس بات کے پابند تھے کہ

بستی کے معذوروں، بیماروں اور مجبوروں کے اخراجات کی کفالت کریں۔ اگرچہ غرناطہ میں مختلف جگہوں کے لوگ آباد تھے۔ ان کی مختلف نسلیں، قبائل اور تہذیب تھی۔ مگر امیر نے انہیں متحد الخیال افراد و قبائل میں تبدیل کر دیا تھا جن کے لباس یکساں، مزاج یکساں اور عادتیں یکساں بن گئی تھیں۔ امیر نے سات سو میل طویل و عریض آبادی کی ہر بستی اور قریہ میں اسلامی زندگی کی رَو دوڑا دی تھی۔ اس نے حکماً تمام غیر اسلامی رسوم و رواج کو مٹا کر شریعت کے احکام نافذ کئے تھے۔ امیر یوسف بن اسماعیل نے تقریباً بیس سال غرناطہ پر حکومت کی۔ لیکن اس کے دورِ حکومت میں چوری، ڈاکہ، قتل و غارت کا نام و نشان نہیں ملتا اور شہری اس کے دَور میں اس طرح رہتے جیسے کہ وہ ایک ہی خاندان کے فرد ہوں۔ امیر نے ہر شہری کے لئے روزگار کا بندوبست کیا تھا۔ کپڑے کی صنعت تو اتنی فروغ پا چکی تھی کہ عورتیں گھروں میں بیکار نہیں بیٹھتی تھیں۔ دو دو چار کرگھے ہر غریب گھرانے میں موجود ہوتے اور ان پر تیار ہونے والے ریشمی کپڑے دُنیا کی منڈیوں میں فروخت ہوتے۔ ہر شہر اور بستی میں معذوروں کے لئے محتاج خانے قائم تھے جہاں سے انہیں زندگی کی ہر ضرورت مہیا کی جاتی۔ گو آج کی متمدن دُنیا نے اُونچے اُونچے محلّات اور عمارتیں تعمیر کر لی ہیں۔ شہروں کے پُر رونق بازار آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں۔ نئی نئی ایجادات نے زندگی کو آسان سے آسان تر بنا دیا ہے۔ آج کا انسان ستاروں اور سیّاروں پر کمندیں بھی ڈال رہا ہے۔ لیکن روز بروز زندگی تاریک سے تاریک تر ہوتی جا رہی ہے۔ محبت اخوت، مساوات، ہمدردی، غم خواری اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شرکت کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ انسانیت تو اُنس کا نام ہے۔ اُنس نہیں تو انسانیت کہاں؟ امیر یوسف بن اسماعیل نے ایک حقیقی اسلامی و فلاحی مملکت کا جو نمونہ پیش کیا اس نے امیر کو تاریخ عالم میں وہ مقام عطا کر دیا جو بڑے بڑوں کو میسر نہیں نہ کوئی ہمیشہ رہا ہے نہ ہمیشہ رہے گا۔ مگر کامیابی اسی کو کہتے ہیں کہ انسان دُنیا میں نیک نام چھوڑ کر جائے۔

انسانی مساوات

وقت اب گزر چکا تھا اس لئے ندامت کے آنسو اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اب اگر وہ چاہتا بھی کہ دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے تو اس کے لئے ممکن نہ تھا اس لئے کہ اب وہ سراسر رُومیوں اور رُومی فوجوں کے گھیرے میں تھا۔ نعمت کی قدر بعد از زوال ہی معلوم ہوتی ہے۔ اسلام سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس نعمت سے مالا مال فرمایا تھا۔ حرا سے نورِ حق طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے سوادِ یمن کو منور کر دیا۔ یمن جو ماضی کا امین اور قدیم ترین تمدن کا خزینہ دار تھا یمن کے قبیلہ غسان کا وہ شہزادہ تھا۔ قبیلہ غسان نے جب اسلام قبول کر لیا تو وہ خود کو قبیلہ سے الگ کیسے رکھ سکتا تھا۔ اس نے بھی سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے دورِ خلافت میں اسلام قبول کر لیا اسلام قبول کر لینا اور بات ہے اور اسلام کا دل کی دھڑکن، آنکھوں کا نور اور قلب کا سرور بن جانا اور بات ہے۔ غسانی شہزادے نے اسلام تو قبول کر لیا مگر ابھی تک حلاوتِ ایمانی کا مزا نہیں چکھا تھا اور نہ ایمان پورے طور پر باطن میں سرایت کر سکا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد حج کا زمانہ آ گیا اور قبیلہ کے بہت سارے افراد کی معیّت میں وہ سفرِ حج پر روانہ ہو گیا۔ امیر المومنین سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ بھی حج پر آئے ہوئے تھے۔ غسانی شہزادہ جبلۃ بن الایہم ابھی تک خود کو قدیم امیرانہ تصورات اور فخر و غرور کے جذبات سے پاک نہ کر سکا تھا۔ احرام باندھے طوافِ کعبہ میں مصروف تھا کہ اس کی چادر کسی بدّو کے پاؤں تلے دب گئی۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اتنی بڑی بے عزّتی بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زنّاٹے دار طمانچہ بدّو کے چہرے پر جڑ دیا۔ بلد الامین میں کعبہ کی چھاؤں میں اس نے بدّو کے چہرے پر طمانچہ رسید کیا تھا۔ بدّو اسے برداشت کیسے کرتا۔ طواف سے فارغ ہو کر وہ خلیفہ کی قیام گاہ پر حاضر ہوا اور غسانی شہزادے

جبلہ بن الایہم کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ خلیفہ نے جبلہ کو طلب کر کے دریافت کیا کہ اس نے ایسی حرکت کیوں کی۔ جبلہ نے بتلایا کہ اس نے میری چادر پر پیر رکھ دیا تھا چونکہ یہ ایک شاہی خاندان کے فرد کی توہین تھی۔ اس لئے میں نے اسے سزا دی۔ خلیفہ نے مقدمے کا فیصلہ سنا دیا۔ قصاص، یعنی بدّو بھی شہزادے کے چہرے پر طمانچہ رسید کرے۔ شہزادے کے تو پیر تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ اس نے کہا خلیفہ! ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ کیا میں ایک بدّو کے برابر ہوں؟ کیا میرا کوئی وقار اور کوئی حیثیت نہیں ہے؟ سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، شہزادے! اللہ تعالیٰ کے دربار میں کوئی اونچا ہے نہ نیچا۔ یہاں تو شاہ و گدا، امیر و غریب سب یکساں ہوتے ہیں۔ اس لئے آپ کو سزا بھگتنی ہوگی۔ انتہائی لجاجت سے شہزادے نے خلیفہ سے صرف ایک رات کی مہلت طلب کی جو دے دی گئی۔ جب رات ہو گئی تو رات کے سنّاٹے میں، جبلہ بن الایہم اسلامی مقبوضات کی حدود سے باہر نکل رہا تھا۔ چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ قسطنطنیہ پہنچ کر جبلہ مُرتد ہو گیا۔ مگر ایمان تو ایک روشنی تھی جو اس کے سینے سے چھن چکی تھی۔ جلد ہی جبلہ کو اندازہ ہو گیا کہ جذبات کی رَو میں اس نے ایک غلط فیصلہ کر لیا۔ ترکِ اسلام پر وہ اکثر تنہائی میں آنسو بہاتا۔ ندامت کے آنسو۔ حسرت و حرماں کے آنسو۔ مگر ان آنسوؤں سے کُفر کی تاریکی تو دُور نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک صحیح اسلامی مملکت کا تصوّر

شہر کی فصیل واقعۃً گر چکی تھی۔ اس زمانے میں فصیل ہی کے ذریعہ شہر کی حفاظت کی جاتی تھی۔ ورنہ دشمنوں کو جب بھی موقع ملتا چڑھ دَوڑتے۔ یہ کم پریشانی کی بات نہیں تھی۔ اس لئے حمص کے گورنر نے اعیانِ حکومت سے مشورہ کیا۔ قرار پایا کہ خلیفہ کو اطلاع دی جائے اور جب مرکز سے منظوری آجائے تو فصیل کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے۔ خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو جب یہ اطلاع ملی تو انہوں نے جواب میں لکھا۔ اینٹ اور پتھر کی دیوار سے شہر کی حفاظت

نہیں ہو سکتی۔ اگر واقعتہً تم چاہتے ہو کہ شہر ہر لحاظ سے محفوظ و مامون ہو تو حمص کو عدل و انصاف سے آباد کرو۔ راہوں سے ظلم و خوف کا خاتمہ کرو۔ ظالم کو اس کے ظلم پر ایسی سخت سزا دو کہ وہ دوسروں کے لئے سامانِ عبرت بن جائے۔ جب انصاف کے تقاضوں کی تکمیل کا وقت آئے تو ضروری ہے کہ تمہاری نظر میں امیر و غریب، نامور اور گمنام شریف و رذیل سب برابر ہوں۔ کسی کے ساتھ کسی قسم کا ترجیحی برتاؤ نہ کیا جائے علاقے سے جبر و استحصال، ظلم و تعدّی کا مکمل استیصال کیا جائے۔ غریبوں اور کمزوروں کی کفالت کی جائے۔ ان کے ساتھ شفقت و رحمت کا سلوک کیا جائے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا یہی تقاضا ہے۔ کسی شخص کو کسی عہدے پر متمکن کرتے وقت سب سے بہتر آدمی کو منتخب کیا جائے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے جان بوجھ کر کسی ایسے شخص کو عامل بنایا جس سے زیادہ باصلاحیت لوگ ملک میں موجود ہوں اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے خیانت کی۔

مسلمانوں پر حکومت کرنا درحقیقت ادائے امانت ہے۔ سب ایک دوسرے کے غم خوار و غم گسار ہوں اور کوئی کسی پر دستِ تعدّی دراز نہ کر سکے۔ یہ ہے دراصل شہرپناہ کی ایک ایسی دیوار جسے کوئی دشمن ڈھا سکتا ہے نہ اس میں نقب لگا سکتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے اسی جذبۂ عدل گستری کے باعث مسلم مؤرخین نے ان کے دورِ حکومت کو خلافتِ راشدہ کے دور میں شمار کیا ہے۔

اسلامی عدل

ابتدا میں اسلامی یا رُومی مقبوضات میں تجارت کرنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ مسلمان تاجر اپنا مال رُومی مقبوضات میں فروخت کرتے اور رُومی اسلامی مقبوضات میں۔ مگر نہ جانے رُومیوں کو کیا سوجھی کہ انہوں نے اپنے مقبوضات میں بیرونی تاجروں پر ٹیکس لگا دیا یعنی دس ہزار درہم کے مال پر ایک ہزار درہم۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا تو آپ نے بھی اسی قسم کا ٹیکس بیرونی تاجروں پر عائد

کردیا اور زیاد بن حُدیر نگراں مقرر کیے گئے۔ ایک مرتبہ ایک رُومی تاجر بیس ہزار کا ایک گھوڑا لے کر فروخت کرنے کی غرض سے اسلامی مقبوضات میں آیا تو جناب زیاد نے اس سے ایک ہزار درہم وصول کر لیے۔ سال کے اندر ہی وہ تاجر وہی گھوڑا لے کر گزرا تو زیاد نے دوبارہ ایک ہزار درہم کا مطالبہ کیا۔ حج کے ایام تھے۔ تاجر سیدھا مکہ معظمہ چلا آیا اور زیاد سے کہا کہ میں واپسی پر رقم ادا کروں گا۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ بھی حج میں تشریف لائے تھے۔ عیسائی تاجر نے انہیں ساری رُوداد سنائی اور کہا کہ یہ درست ہے کہ جتنی بار بھی میں گزروں آپ کی حکومت مجھ سے ایک ہزار درہم وصول کرے گی؟ سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ مناسب نہیں۔ میں اس کا بندوبست کردوں گا۔ اس کے سوا خلیفہ نے کچھ نہیں فرمایا۔ تاجر سمجھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یونہی یہ بات فرمادی ہے اور ذہنی طور پر وہ ایک ہزار درہم دوبارہ ادا کرنے پر تیار بھی ہوگیا۔ لیکن واپسی پر جب سرحد پر پہنچا اور اس نے دوبارہ ایک ہزار درہم ادا کرنے کا ارادہ کیا تو زیاد نے لینے سے انکار کردیا کیونکہ عامل کے پاس خلیفہ کا حکم پہنچ چکا تھا کہ جس چیز پر ایک بار ٹیکس وصول کیا جاچکا ہو اگلے سال اسی تاریخ تک دوبارہ اس پر کچھ نہ لیا جائے۔

نصرانی نے زیاد سے کہا "میں تو ایک ہزار درہم دوبارہ ادا کرنے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ مگر تمہارے حاکم کا انصاف دیکھ کر یہ اقرار کرتا ہوں کہ آج سے میں اسی شخص کے دین پر ہوں جس نے آپ کو یہ حکم بھیجا ہے۔

اسلامی انصاف

جس زمانے میں ابنِ ابی عامر کو قرطبہ کا وزیرِ داخلہ بنایا گیا۔ ایسا لگتا جیسے کہ معاشرے میں بہار آگئی ہو۔ ابنِ ابی عامر کسی سے دبتے تھے نہ کسی کی رعایت کرتے حقیقی چچازاد بھائی ناز و نعمت کا پلا۔ نوجوان، توانا و تنومند کہ دیکھنے والا اسے دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ ابن ابی عامر اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ حقیقی

بھائیوں سے بھی زیادہ۔ چچازاد نے خیال کیا کہ میں تو وزیرِ داخلہ کا قریب ترین عزیز ہوں اور بھائی بھی مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔ جو چاہوں کر ڈالوں مجھ سے پوچھنے والا کون ہے۔ کسی بات پر ناراض ہو کر ایک غریب نوجوان کو بلا وجہ بید مارے۔ بے چارہ ملازم لہولہان ہو گیا۔ نوجوان کے اعزّا نے ابنِ ابی عامر سے شکایت کی اور جب انہوں نے ان کے چچازاد عزیز ترین بھائی کا نام لیا تو ابنِ ابی عامر کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور محبّت و فرض میں کشاکش شروع ہو گئی۔ کبھی بھائی کی محبت کا طوفان ابنِ ابی عامر کے اعصاب کو شل اور ذہن کو مفلوج کر دیتا اور کبھی فرض کی پکار دامن گیر ہوتی۔ یہ کش مکش تھوڑی ہی دیر تک رہی۔ آخر کار فرض محبت پر غالب آ گیا اور ابنِ ابی عامر کے عزیز ترین چچازاد بھائی کو اسی بید کے ساتھ جلاّد کے حوالے کر دیا گیا۔ ناز و نعمت میں پلا ہوا چچازاد بھائی بھلا بید کی مار کو کیا سہارتا تین چار ہی ضربات کے بعد اس کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ جلاّد نے اطلاع دی۔ ابنِ ابی عامر نے دیکھا کہ پھول سا چہرہ خاک و خون میں لتھڑا پڑا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ابنِ ابی عامر اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا۔ نوجوان کی لاش محل میں لائی گئی تو کہرام مچ گیا۔ چچی کا بین اور بہنوں، بھائیوں کے نالہ و شیون کی وجہ سے خود ابنِ ابی عامر کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا مگر لبوں پر مسکراہٹ تھی کہ بھائی تو ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا مگر اسلامی انصاف کو رسوا ہونے نہ دیا۔

جلال الدولہ اور عدل و انصاف

عمائدین و ارکینِ دولت کے ہمراہ سلطان جلال الدولہ شکار کے لئے نکلا ہوا تھا۔ سرکاری حاجبوں اور افسروں کی اچھی خاصی تعداد بھی ساتھ تھی۔ ایک جنگل میں پڑاؤ ہوا۔ اتفاقاً ایک دن سلطان شکار کی تلاش میں نکلا ہوا تھا کہ سر براہ اس نے ایک دیہاتی کسان کو روتے ہوئے دیکھا۔ سلطان نے سواری روکی اور گھوڑے سے

اُتر کر کسان کے پاس گیا۔ پوچھا کیوں رو رہے ہو؟ کسان نے کہا حضور! میں اپنے کھیت سے خربوزے نکال کر لا رہا تھا۔ خیال تھا کہ اسے فروخت کر کے کھانے پینے کا کچھ سامان کروں گا۔ راستے میں تین نوجوان لڑکے ملے اور میرے سارے خربوزے چھین کر رفوچکر ہو گئے۔ یہی خربوزے ہی میرا سارا اثاثہ تھا۔ اب میں کیا لے کر گھر جاؤں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ گھر میں ایک دانہ موجود نہیں، بیٹھا اپنی قسمت کی خرابی پر آنسو بہا رہا ہوں۔ سلطان معاملے کی نوعیت کو سمجھ گیا اور اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس نے کسان سے کہا کہ تم سیدھے چلے جاؤ۔ آگے جا کر تمہیں ایک میدان میں بہت سے خیمے نظر آئیں گے۔ ان خیموں میں جو سُرخ رنگ کا خیمہ ہو اس کے دروازے پر بیٹھ رہنا۔ میں تھوڑی دیر کے بعد آ کر انشاءاللہ تمہاری پریشانی کو رفع کرنے کی کوئی تدبیر کروں گا۔ سلطان جلال الدولہ کی ہدایت کے مطابق کسان گیا اور سُرخ رنگ کے خیمے کے دروازے پر چپکا بیٹھ رہا۔ دو تین گھنٹے کے بعد سلطان شکار گاہ سے واپس آیا اور اپنے سیکرٹریوں کو بُلا کر کہا کہ مجھے خربوزہ کھانے کی خواہش ہو رہی ہے۔ شہر تو یہاں سے کافی دُور ہے، آنے جانے میں خوامخواہ تکلیف ہو گی۔ تلاش کرو اگر کسی ساتھی کے پاس خربوزے ہوں تو لے آؤ۔ یہ سُن کر تمام سیکرٹری گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک حاجب نے تین چار خربوزے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ یہاں جنگل میں یہ خربوزے تمہیں کہاں سے مل گئے۔ حاجب نے بتلایا کہ میرے ساتھ میرے تین بیٹے بھی ہیں۔ آج صبح وہ یہ خربوزے لائے تھے۔ اتنا سننا تھا کہ سلطان کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا۔ حکم دیا کہ فوراً اپنے بیٹوں کو حاضر کرو۔ حاجب سمجھ گیا کہ بیٹوں کے ساتھ کیا ہو گا۔ کیوں کہ سلطان کا معمول تھا کہ عمالِ حکومت یا ان کے قریبی عزیزوں سے اگر کوئی جرم یا ظلم صادر ہوتا تو وہ عام مجرموں کے مقابلے میں انہیں نہایت سخت سزا دیتا۔ اس لئے اس کے لڑکے بھاگ گئے۔ سلطان نے کسان کو بُلا کر دریافت کیا۔ پہچانو! یہی تو تمہارے خربوزے ہیں؟ کسان نے کہا جی ہاں! سلطان نے کہا اپنے خربوزے سنبھالو۔ اتنے میں حاجب نے آ کر جواب دیا کہ لڑکے

خیمے میں موجود نہیں ہیں۔ سلطان آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے حاجب کا ہاتھ پکڑا اور دیہاتی کے حوالے کیا۔ کہا یہ آج کے دن سے تیرا غلام ہے۔ جب تک کہ خربوزے چھیننے والے نوجوان حاضر نہیں ہوتے۔ خدا کی قسم اگر تو نے اس حاجب کو چھوڑا تو میں تیرا سر قلم کر دوں گا۔ کسان جب حاجب کو لے کر خیمے سے نکلا تو حاجب نے رہائی کے بدلے کسان کو تین سو اشرفیوں کی پیش کش کی وہ دوبارہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی عالی جاہ مجھے تین سو اشرفیاں مل رہی ہیں۔ اس لیے میں نے اس غلام کو فروخت کر دیا۔ سلطان نے دریافت کیا تو اس پر راضی ہے؟ دیہاتی نے کہا، جی ہاں۔ اس نے کہا اچھا تو پھر تین سو اشرفیاں لے اور راستہ لے۔ یہ سلطان جلال الدولہؒ کی حکومت ہے۔ اس میں کسی پر ظلم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر ظلم ہوا تو حشر کے دن میں جواب دہ ہوں گا۔

شیر شاہ سوری اور عدل و انصاف

مورخوں نے لکھا ہے کہ شیر شاہ سوری کا دور نظم و نسق کے لحاظ سے ایک مثالی دور تھا۔ اس کے دور میں کوئی جاگیر دار یا زمیندار کسی بھی کاشت کار پر زیادتی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے امراء اور اعیانِ سلطنت کو ہر لمحہ عدل و احسان کی تلقین کرتا اور رعایا کو حقیر جاننے سے روکتا رہتا۔ جُوں ہی کوئی مظلوم کمزور اور بے بس آدمی اس سے فریاد کرتا۔ وہ ہر کام چھوڑ کر اس کی فریاد سنتا۔ اس نے اپنے پہرہ داروں کو یہ مستقل حکم دے رکھا تھا کہ جب بھی کوئی مظلوم ہمارے دروازے پر آئے اور ہمیں پکارے خواہ کوئی بھی وقت ہو اور ہم کیسے بھی مصروف ہوں اسے ہمارے پاس لے آؤ۔ وہ کہا کرتا کہ میرے نزدیک ظالم سب سے بڑا مجرم اور سب سے بڑا گنہگار ہے۔ بادشاہ رعایا کا نگہبان ہوتا ہے اور اس پر اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کی حفاظت لازم ہے اگر میں یہ ذمے داری نہ نبھا ہوں گا تو خدا کے ہاں کیا جواب دوں گا۔ اس ذمے داری کو نباہنے کے لئے اس نے پوری قلمرو کو ایک لاکھ سولہ ہزار پرگنوں میں تقسیم کیا تھا اور

ہر پرگنہ کی دیکھ بھال کے لئے ایک فرض شناس، شقدار، ایک افسر مال، ایک محتسب ایک بڑے قاضی اور ایک بڑے حساب دان کو مقرر کیا تھا۔ کیا مجال تھی کہ ان حکام میں سے کوئی حاکم رعایا کے ساتھ زیادتی کر پاتا۔ اس نے قابل اعتماد پرچہ نویس مقرر کر رکھے تھے جو اُسے ہر حاکم کی حرکت سے باخبر رکھتے تھے۔ اس نے ہر ہر علاقہ میں وہاں کے معتبر آدمی کو بحیثیت مقدم کے مقرر کیا تھا جو علاقے میں امن وامان برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ اگر کسی جگہ قتل ہو جاتا یا ڈاکہ پڑ جاتا تو قاتلوں اور ڈاکوؤں کا سراغ لگانا ان کی ذمہ داری تھی۔ اس سختی اور انتظام نے ملک سے قتل وراہزنی کا نام ونشان مٹا دیا تھا اور لوگ چین اور اطمینان سے زندگی گزارتے تھے۔ ایک دن شیر شاہ سُوری کے سامنے ایک قتل کا مقدمہ پیش ہوا جس میں قاتل کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یہ قتل اٹاوہ کے کسی علاقے میں ہُوا تھا۔ شیر شاہ سُوری نے مقدمے کی سماعت کی۔ اس نے اٹاوہ کے شقدار کو حکم بھیجا کہ جس علاقہ میں قتل ہوا ہے اس کے آس پاس واقع کسی درخت کو دو آدمی بھیج کر کٹوائے اور جو سرکاری عامل اس درخت کے کاٹنے کی اطلاع پا کر آئیں انہیں پکڑ کر ہمارے پاس بھیج دو۔ شقدار نے شاہی فرمان کے مطابق دو آدمی درخت کاٹنے کے لئے موقعۂ واردات پر بھیجے۔ وہ ابھی درخت کاٹ ہی رہے تھے کہ علاقے کے مقدموں اور معتبروں نے انہیں موقع پر آن پکڑا۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس اشخاص نے درخت کاٹنا چھوڑ دیا اور ان معتبروں کو شاہی فرمان کے مطابق پکڑ کر بادشاہ کے حضور لے گئے۔ تاریخ داؤدی کے مصنف نے لکھا ہے کہ صبح کے وقت جب شیر شاہ سوری دربار میں آیا تو ان معتبروں کو پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے ان سے دریافت کیا کہ تمہیں درخت کٹنے کی خبر تو ہو گئی لیکن ایک انسان کی گردن کٹ گئی اور تم اس سے بے خبر رہے۔ میں اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تین دن کے اندر اندر قاتل کو پیش کرو ورنہ سزا میں تم قتل کر دیئے جاؤ گے معتبروں کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور تیسرے دن کا سُورج ابھی طلوع بھی نہ ہُوا تھا کہ "قاتل شاہی دربار کے دروازے پر زنجیر وسلاسل میں جکڑے ہوئے حاضر تھے۔"

عدل وانصاف کی اسی پاسداری کی وجہ سے برصغیر کا ہر دیانت دار مورخ شیر شاہ سوریؒ کا نام ادب سے لیتا ہے۔

تہذیب جدید کی چمک دمک

ملک اور بیرون ملک میں آپ نے ایک سے ایک بڑھ کر ہسپتال اور کلینک دیکھے ہوں گے جو ہر قسم کی جدید سہولتوں سے مزیّن ہیں۔ جدید آلات، جدید ادویہ بڑے بڑے سپیشلسٹ ڈاکٹر۔ کیا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ ان سے کتنا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ آیئے آج تاریخ کی سُوئی کو پیچھے کی طرف موڑ دیں اور چند لمحوں کے لیے ماضی کے جھروکوں میں جھانکیں۔ یہ بیمارستان قلاودن ہے۔ یہ ہسپتال ۶۸۳ ہجری یعنی آج سے تقریباً سات سو برس قبل ملک منصور سیف الدین کے ہاتھوں دمشق میں قائم ہوا تھا۔ پہلے یہ ہسپتال کسی امیر کا محل تھا جسے منصور نے ——— ہسپتال میں تبدیل کر دیا اور اس پر ایک بڑی جائیداد وقف کر دی۔ یہ ہسپتال اپنی ترتیب و تنظیم کے اعتبار سے دُنیا کا واحد ہسپتال مانا جاتا تھا۔ کسی کے لیے کوئی تخصیص نہ تھی۔ مُسلم، غیر مُسلم، مقامی، مسافر ملکی غیر ملکی، غلام آقا، غریب امیر، مرد و عورت ہر ایک کے لیے ہسپتال کی خدمات حاضر تھیں۔ علاج معالجے کے لیے ہر قسم کی بیماری کے الگ الگ ڈاکٹر اور شعبے موجود تھے۔ مریض جب داخل ہوتا تو صاف وشفاف لباس اسے ہسپتال سے فراہم کیا جاتا۔ مریضوں کے کپڑے دھونے، نہلانے، لباس تبدیل کرانے، کمروں اور بستروں کی صفائی کے لیے مستقل عملہ تعینات تھا۔ اس طرح ہر مریض کے لیے دو خادم اور ایک نگران مقرر ہوتا۔ ہر مریض کا کھانا علیحدہ اور مخصوص برتن میں دیا جاتا اور یہ لازمی تھا کہ کھانا اسے ڈھانپ کر دیا جائے۔ ڈاکٹر جس قسم کی مقوی غذا یا دوا تجویز کرتے ہسپتال کی طرف سے مفت مریض کو فراہم کی جاتی۔ اس ہسپتال کی ایک یہ بھی خصوصیت تھی کہ جو مریض ہسپتال کے بجائے اپنے گھر میں رہنا پسند کرتا اسے اسی قسم کی سہولتیں ان کے گھر میں بہم پہنچائی جاتیں۔ ہسپتال کے سارے کمروں

کا فرش سنگ مرمر کا تھا اور ہر کمرے کے اندر سے ایک نہر گزرتی۔ بے خوابی کے مریضوں کے وارڈ علیحدہ ہوتے جہاں خوش کن موسیقی سے ان کی تواضع کی جاتی۔ ہسپتال میں طبیہ کالج بھی تھا۔ اس ہسپتال کے آنکھوں کے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ محض آنکھوں کے شعبہ میں داخلی اور خارجی مریضوں کو ملا کر روزانہ چار مریضوں کا علاج کیا جاتا تھا۔

اس ہسپتال کا ایک ضابطہ یہ بھی تھا کہ مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے بعد جب مریض رخصت ہونے لگتا تو اسے کپڑوں کے جوڑے اور اتنی نقدی دی جاتی کہ وہ ہسپتال سے باہر ہوتے ہی دوسروں کا محتاج نہ ہو جائے جو مریض بیماری کی وجہ سے بیروزگار ہو چکے ہوتے انہیں اتنی رقم ہسپتال کے فنڈ سے مہیا کی جاتی کہ وہ معاشی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ ہسپتال کی طرف سے ہر وارڈ کے لیے دو تنخواہ دار آدمی مقرر تھے جو روزانہ اپنے اپنے وارڈ میں جا کر بیماروں کے قریب سرگوشی کے انداز میں آپس میں اس طرح باتیں کرتے کہ مریض سن لے اور اس گفتگو سے یہ اثر لے کہ اب اس کی حالت اچھی ہو رہی ہے اور اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے۔ اس طرح نفسیاتی طور پر مریض اچھا ہوتا اور تیزی سے صحت یاب ہو جاتا۔

یہ داستان سات سو سال پرانی ہے۔ اب نہ وہ وقف ہے نہ ہسپتال۔ جدید تمدن کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ تو ضرور کر رہی ہے۔ مگر زندگی کی شب تاریک سے تاریک تر ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ تمدن کی ترقی اونچی اونچی عمارتوں زرق برق لباس اور باہمی تفاخر کا نام نہیں۔ شرافت و محبت کی قدروں کے فروغ کا نام ہے جس کے نقوش روز بروز مدھم ہوتے جا رہے ہیں۔

باب ہشتم

جہاد فی سبیل اللہ

ایمان کی فتح

آج رمضان کی ۱۷ تاریخ اور ہجرت کا دوسرا سال ہے۔ آسمان سے آگ برس رہی ہے زمین توے کی طرح تپ رہی ہے۔ حق و باطل اور کفر و اسلام کا یہ پہلا اہم ترین معرکہ ہے ایک طرف بے سرو سامانی کا یہ عالم ہے کہ چند گھوڑے چند اونٹ اور گنی چنی دندانے دار چند تلواریں ہیں۔ باقی لوگوں کے ہاتھوں میں کھجور کی شاخیں۔ شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاؤں میں جوتے بھی سلامت نہیں۔ چیتھڑا لپیٹ رکھا ہے۔ صرف تین سو تیرہ سرفروش ہیں۔ نہ ساز و سامان جنگ ہے نہ رسد۔ اور مقابلے پر کفر اپنی تمام تر جولانیوں۔ قہرمانیوں۔ اسلحوں سواریوں اور فخر و غرور کے ساتھ صف بستہ ہے۔ چھ ماہ تک کی رسد کا سامان موجود ہے۔ بڑے بڑے سورما شہ سوار۔ پختہ کار۔ جنگ آزما اور سرداران قریش قیادت کر رہے ہیں۔ تعداد بھی مسلمانوں کے مقابلے میں تین گنی سے زیادہ ہے۔ ابو جہل۔ ابو سفیان۔ عتبہ۔ عتیبہ۔ سبھی تو ہیں۔ ناز ہے اپنی تعداد پر۔ اسلحے پر۔ سواریوں پر۔ تجربے اور مشاقی پر۔ آج یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے نمٹ جائے گا۔ عزم ہے کہ توحید کا نام و نشان مٹا دیا جائے گا کہ پھر کبھی کوئی کلمۂ حق بلند نہ کر سکے۔ اور جبر و ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے۔ معرکہ کار زار اب گرم ہونے کو ہے۔ ارض و سما اور ملک و ملکوت پر سکتہ طاری ہے۔ تاریخ ٹکٹکی باندھے یہ منظر دیکھ رہی ہے اور نتیجے کی منتظر ہے۔ میدان بدر کے ایک گوشے میں پتوں کا ایک سائبان بنا دیا گیا ہے۔ مولائے کائنات ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ ریز ہیں اور چشم مبارک سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہے۔ زبان پر یہ کلمات جاری ہیں۔

"اے میرے اللہ! یہ قریش اپنے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے ساتھ ہمارے اوپر ٹوٹ پڑے ہیں انہوں نے تیرے رسول

کی تکذیب کی ہے اے اللہ! اپنی مدد کا وعدہ وفا کر اگر یہ گنے چُنے مسلمان آج ہلاک ہو گئے تو پھر قیامت تک تیری پرستش کوئی نہ کرے گا"

بیم و رجا کی ملی جلی کیفیت میں الحاح و زاری کے ساتھ یہ دعا ہو رہی تھی کہ نبی کریم ﷺ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور غیب سے وعدہ کر دیا گیا۔

معرکہ گرم بھی ہوا۔ تلواروں سے تلواریں اور نیزوں سے نیزے ٹکرائے اور شام تک پرچم اسلام سربلند تھا اور کفار مقتولین کی لاشیں اور اتنے ہی قیدی چھوڑ کر مکہ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ بدر کی فتح نے کفر کے قلعہ میں زلزلہ ڈال دیا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ جنگ سامان حرب۔ سپاہیوں کی تعداد اور سامان رسد سے نہیں لڑی جاتی میدان میں ایمان و یقین لڑتا ہے۔

استقامت فی الدین

احد کا معرکہ اختتام کو پہنچ چکا ہے مسلمانوں کے لشکر نے قریش کا تعاقب کیا تو انہوں نے راہ فرار اختیار کر لی۔ رحمتہ للعالمین سید المرسلین ﷺ اگرچہ زخمی ہیں مگر اپنے جاں نثاروں سے غافل نہیں۔ آپ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ ذرا سعد بن ربیع انصاری کو تو تلاش کرو کہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ مل جائیں تو میرا اسلام کہنا اور ان کا حال دریافت کرنا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آپ کا حکم سنتے ہی میں شہیدوں اور زخمیوں میں سعد بن ربیع کو ڈھونڈنے لگا۔ میدان احد کے ایک کنارے میں دیکھا کہ سعد بن ربیع زخموں سے چور پڑے ہیں جسم پر تیر اور تلوار کے تقریباً ستر زخم ہیں۔ اور سرزمین احد ان کے گرم گرم خون سے سیراب ہو رہی ہے۔ قریب گیا تو دیکھا کہ ابھی حیات کی کچھ رمق باقی ہے۔ اور اللہ کی محبت کا متوالا نبی کا

جاں نثار حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میں جو قریب پہنچا اور سعد نے میرے قدموں کی آہٹ سُنی تو آنکھیں کھول دیں اور بڑی مشتاقانہ نگاہوں سے مجھے دیکھا میں نے کہا سعد! تمہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کہا ہے اور تمہارا حال دریافت کیا ہے۔ اتنا سُننا تھا کہ معلوم ہوُا جیسے سعد کے بے جان جسم میں حیات تازہ کی لہر دوڑ گئی۔ سعد نے کہا! رسول اللہ پر سلام اور تم پر بھی سلام۔ آقا میرا حال پوچھیں تو کہہ دینا کہ میں اس وقت جنت کی خوشبو سونگھ رہا ہوں آپ نے جو کہا تھا سچ کہا تھا۔ اور میری قوم انصار سے کہنا کہ اگر تم میں سے ایک انسان بھی زندہ رہ گیا اور رسول اللہ کو کسی قسم کی تکلیف پہنچی تو سمجھ لینا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارا کوئی بھی عذر مقبول نہ ہوگا۔ یہ جملے زبان سے ادا ہوئے اور اس شہید وفا نے جسے تاریخ سعد بن ربیع کے نام سے قیامت تک یاد رکھے گی اپنی جان کا نذرانہ بارگاہِ حمدیت میں پیش کر دیا۔

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیازمندے
کہ بوقتِ جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واپس آکر جب سعد بن ربیع کا پیغام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا تو آپؐ نے بے ساختہ ارشاد فرمایا

اللہ سعد پر رحم فرمائے ساری زندگی اللہ اور اس کے رسول کا خیرخواہ و وفادار رہا اور مرتے وقت تک اپنی وفاشعاری پر قائم رہا۔

دین پر استقامت دراصل اس کا نام ہے کہ ایک مرتبہ جو پیمان وفا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باندھا جائے اسے آخری وقت تک نباہ دیا جائے۔

اقامتِ دین

زمانہ جاہلیت کی مشہور شاعرہ حضرت خنساؓ کو کون نہیں جانتا ہوگا ان کے

اشعار زمانۂ جاہلیت میں زبان زد خاص و عام تھے۔ مگر قرآن سُنا تو اپنی شاعری اپنے کلام کی روانی اور فصاحت سب بھول گیئں اور قرآن کی فصاحت کے آگے سپر انداز ہو گیئں اپنی قوم کے کئی معززین کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ آیئں اور دامان نبوت سے وابستہ ہو گیئں۔ وابستگی بھی شاعری کی طرح بے مثال۔ اسلام کی محبت اور عقیدے کی عظمت ہر بن مو میں سرایت کر چکی تھی۔ اگر سر میں کوئی سودا تھا تو اسلام کا۔ اسلام پھیلے۔ اسلام بڑھے۔ اور اسلام ایک عظیم قوت بن کر اُفق کائنات پر چھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے چار بیٹے عطا کئے تھے۔ ایک سے ایک تنومند و توانا۔ مردانہ جاہ و جلال والے۔ ماں کی تربیت نے ہر بچے کو اسلام کا والہ و شیدا بنا دیا تھا۔ بیوہ خنساء اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ اس کے قویٰ مضمحل تھے مگر اسلام سے اس کا عشق جوان تھا۔ چاہتی تھی کہ جس طرح اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد زندگی کے بقیہ ایام اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے میں گزار دیئے اسی طرح اس کے بیٹے بھی اقامت دین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایئں۔ کیونکہ زندگی بغیر نصب العین کے چراغ بے نور اور کشتی بے پتوار کے مثل ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں قادسیہ کی لڑائی ہوئی لشکر اسلام روانہ ہونے لگا تو خنساء بھی اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ چل پڑیں۔ قادسیہ پہنچیں تو انہیں ایسا لگا جیسے زندگی بھر کی بے قراریوں کو قرار آ گیا ہو۔ اپنے لڑکوں کو لڑائی سے ایک دن پہلے جمع کیا اور بہت ساری نصیحتیں کیں۔ لڑائی کی شرکت پہ اُبھارا۔ اور فرمایا میرے بیٹو! تم اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے ہو اور اپنی ہی خوشی سے تم نے ہجرت کی ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں تم ایک شریف باپ کے لڑکے ہو۔ تمہاری شرافت کو کوئی دھبہ نہیں لگا سکتا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ میں کیا کیا ثواب رکھا ہے۔ یاد رکھو کہ آخرت کی باقی رہنے والی زندگی دنیا کی فانی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ کل صبح جب تم صحیح و سالم اُٹھو تو بہت ہوشیاری سے شریک جہاد ہو۔

اللہ کے دشمنوں سے لڑتے وقت صرف اللہ سے مدد مانگنا اور جب تم دیکھو کہ لڑائی زور پر آگئی اور اس کے شعلے بھڑکنے لگے تو اس کی گرم آگ میں گھس جانا اور کافروں کے سردار کا مقابلہ کرنا انشاء اللہ جنت میں عزت و اکرام کے ساتھ داخل ہوگے۔ صبح ہوئی اور جب معرکہ کارزار گرم ہؤا۔ (تلواروں سے تلواریں اور نیزوں سے نیزے ٹکرانے لگے) حضرت خنساء کے چاروں بیٹے میدان میں آگے بڑھے۔ ایک ایک لڑکا اپنی ماں کی نصیحت کے مطابق آگے بڑھتا اور رجز پڑھتا ہؤا شہید ہونے تک لڑتا رہتا۔ آخر کار چار کے چار بیٹوں نے راہ حق میں جام شہادت نوش کیا۔

(اب ضعیفہ بیوہ کی گود خالی تھی) کسی نے جا کر خبر دی ماں! تیرے چاروں کڑیل جوان موت کی آغوش میں چلے گئے۔ بیوہ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور فرمایا اس اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ان کی شہادت سے مجھے شرف بخشا۔ اور اس بڑھیا کو سُرخ رو کیا۔ مجھے اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ اس کی رحمت کے سایہ میں ان چاروں کے ساتھ میں بھی رہوں گی کہ سُرخ رو شہیدوں کی سُرخ رُو ماں ہوں۔

شوقِ شہادت

خلفائے عباسیہ کے دورِ حکومت میں غلام الخلیل نامی ایک مکار اور ریاکار درویش تھا۔ بڑے بڑے امراء اور اعیانِ حکومت اس کے مکر کے جال میں پھنس چکے تھے۔ اس کو اگر نفرت تھی تو شریعت اور پابند شریعت علماء اور صلحاء سے یہ طریق صرف اسی کا نہیں تھا بلکہ وہ تمام لوگ جو شریعت سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں علمائے حقانی و ربانی اور شریعت پر عمل کرنے والے مشائخ اور بزرگانِ دین کو اپنا دشمن تصور کرتے اور ان کے سایہ سے بھاگتے ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ قرآن وسنت کی بینات کے سامنے دنیا کا

کوئی مکر و فریب ٹھہر نہیں سکتا۔ غلام الخلیل نے بھی امراء اور حکام سے سفارش کر کے حضرت ابوالحسن نوری حضرت رقام اور جناب ابو حمزہ رحمہم اللہ جیسے پابند شریعت علماء اور صوفیہ کو گرفتار کروا کر خلیفہ کے روبرو پیش کر دیا۔ اور اس سے کہا کہ یہ لوگ بے دینوں کے گروہ کے سردار اور واجب القتل ہیں ان کو قتل کرا دینا نیکی کا اتنا بڑا کام ہے کہ جس کے ہاتھ سے یہ کام انجام پائے گا میں اس کو خدا کے ہاں اجر دلانے کا وعدہ کرتا ہوں۔ خلیفہ اس مکار کے فریب میں آ گیا اور اس نے ان تینوں حضرات کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ جلاد انہیں قتل کرنے لے گئے اور ان کے ہاتھ باندھ دیئے جلاد نے ان میں سے حضرت رقام کو قتل کرنے کا پہلے ارادہ کیا یہ دیکھ کر حضرت ابوالحسن نوری اٹھے اور رقام کی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے تاکہ وہ رقام سے پہلے قتل کر دیئے جائیں اس وقت حضرت ابوالحسن نوری کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ نوری کے اس عمل کو دیکھ کر جلاد کو سخت تعجب ہوا اس نے کہا جواں مرد! تلوار ایسی چیز نہیں کہ اتنی رغبت کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کیا جائے جیسا کہ تم نے کیا ہے۔ تم ہٹ جاؤ اس لیے کہ ابھی تمہاری باری نہیں آئی ہے۔ حضرت نوری رحمتہ اللہ علیہ نے جواب دیا میں اس بات کو جانتا ہوں مگر انسان کے پاس جان سے بڑھ کر کوئی عزیز چیز نہیں ہے میں چاہتا ہوں کہ چند سانس جو ابھی باقی ہیں ان کو اپنے بھائیوں پر نثار کر دوں اس لیے کہ یہ دنیا خدمت و ایثار کی اور آخرت قرب خداوندی کی جگہ ہے اور اللہ کا قرب انسانوں کی خدمت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ قاصد نے یہ خبر خلیفہ کو پہنچائی تو وہ بھی تعجب میں پڑ گیا اور اس نے قتل کے حکم کی تعمیل روک دی۔ اس نے قاضی القضاۃ ابوالعباس کو بلا کر ان تینوں حضرات کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا۔ قاضی نے جب شریعت کے معاملات میں ان حضرات سے گفتگو کی تو ہر لحاظ سے انہیں کامل پایا اور ان کی تاثیر کلام اور صحت حال سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے خلیفہ کو لکھا کہ اگر

یہ لوگ بے دین ہیں تو پھر دنیا میں دیندار کون ہے؟ خلیفہ نے ان حضرات کو بلا کر اپنی پشیمانی کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر کوئی حاجت ہو تو ہم سے طلب کریں۔ حضرت نوری، رقام اور ابو حمزہ نے بیک زبان جواب دیا۔

جناب والا! ہماری آپ سے صرف یہی حاجت ہے کہ آپ ہمیں بالکل فراموش کر دیں نہ ہمیں نوازیں نہ ہماری راہ میں حائل ہوں۔ ان کی باتیں سُن کر خلیفہ رو پڑا اور بڑی عزت کے ساتھ ان حضرات کو رُخصت کیا۔

تمنّائے شہادت

وہ کوئی بڑا عالم و فاضل یا محدث و مفسر نہیں تھا۔ سیدھا سادہ بدو تھا مگر اس کا سینہ آنحضرت ﷺ سے پہلی ہی ملاقات میں نورِ ایمان کا خزینہ بن چکا تھا۔ ایک دن آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسلام قبول کیا اور ساری زندگی آپ کے دامانِ رحمت سے وابستہ رہنے کا عہد کر لیا۔ رزق حلال کمانے کے لیے لوگوں کے اونٹ چرایا کرتا۔ اور مزدوری کے بعد جو وقت ملتا دربار نبوت میں حاضر رہتا۔ اگر غزوات پیش آتے تو ان میں شرکت کرتا۔ اور واپس آکر پھر اپنے کام میں لگ جاتا۔ سوائے حضور ﷺ کے اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ نہ ماں نہ باپ نہ بھائی نہ بہن۔ نہ جورو نہ جاتا۔ اس کی نگاہیں صرف ایک ذات پر مرکوز تھیں۔ وہی ذات اس کی مطلوب و مقصود تھی۔
ایک دن غزوہ سے واپس آکر لوگوں کے اونٹ لیے اور چرانے کے لیے جنگل کی طرف نکل گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو صحابہ کرام نے مال غنیمت کا حصّہ اس کے حوالے کیا۔ مال غنیمت لے کر وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک یہ کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا تم نے غزوے میں شرکت کی تھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب کی اور مال غنیمت حاصل ہوا۔ اسے مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا گیا اور تمہارا حصّہ

تمہیں دیدیا گیا۔ اسے قبول کر لو۔ بدو کی آنکھیں ڈبڈبا گیئں۔

آقا! میں نے مال غنیمت کے لیے تو اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ میری تو صرف ایک آرزو ہے کہ میرے حلق کے اس حصے پر دشمن کا ایک تیر لگے اور میں مر کر جنت میں داخل ہو جاؤں۔ اس کے سوا میری کوئی تمنا ہے نہ آرزو۔ دل کی گہرائیوں سے یہ آواز نکل رہی تھی اور اجابت خداوندی ہمہ استقبال عرش سے اُتر رہی تھی۔ تو اللہ تجھے سچا ہی کر دکھائے گا۔ بدو کو یقین ہو گیا۔ اور وہ پہلے کی طرح اپنے کام میں لگ گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک غزوہ پیش آیا اور وہ بدو بھی اس غزوے میں شریک ہوا۔ چونکہ آرزو سچی تھی۔ نیت میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس لیے شام کے وقت جب شہداء کی لاشیں اٹھائی جانے لگیں تو اس بدو کی لاش بھی سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور لائی گئی۔ اسے ٹھیک اسی جگہ تیر لگا تھا جہاں تیر لگنے کی خواہش اس نے ظاہر کی تھی۔ روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ بدو اپنی مراد کو پہنچ چکا تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا "یہ وہی شخص ہے جس نے حلق پر تیر کھانے اور جام شہادت نوش کرنے کی آرزو ظاہر کی تھی؟ لوگوں نے کہا "جی ہاں! یہ وہی شخص ہے آپ نے ارشاد فرمایا "یہ سچا تھا اللہ تعالیٰ نے بھی اسے سچا ہی کر دکھایا۔ نسائی شریف میں حضرت شداد بن الہاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی رحمت نے اسی وقت اپنا جبہ مبارک اتارا اور اس میں اس شہید وفا کو کفنایا پھر اس کی نماز جنازہ ادا فرمائی اور دعا فرمائی "مولا! یہ تیرا بندہ ہے جو تیری راہ میں مہاجر بن کر نکلا اور تیری ہی راہ میں شہید ہو کر مرا مولا! میں اس کی ہجرت و شہادت کا گواہ ہوں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

جہاد فی سبیل اللہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے صاحبزادہ

گرامی حضرت اسامہ بن زید حضور ﷺ کو بہت عزیز تھے فتح مکہ کے موقع پر حضرت اسامہ کی شان دیکھنے کے لائق تھی کہ جب سرور دو عالم ﷺ فاتحانہ مکہ معظمہ میں داخل ہو رہے تھے تو آپ نے حضرت اسامہ بن زید کو اپنی سواری پر پیچھے بٹھا رکھا تھا۔ جب آپ تطہیر کعبہ کے بعد کعبہ شریف کے اندر تشریف لے گئے تو آپ نے جناب اسامہ کو بھی اپنے ساتھ لیا۔ غزوۂ موتہ کے وقت ان کے والد بزرگوار جناب زید بن حارثہؓ نے جام شہادت نوش کیا تو آپ نے شہداء کے انتقام اور شامی حکومت کے حوصلے پست کرنے کے لیے ایک لشکر تیار فرمایا۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ ﷺ کو مرض وفات لاحق ہو چکا تھا۔ آپ نے اس لشکر کی کمان نوجوان اسامہ کے سپرد کی اور حضرت فاروق اعظم حضرت ابو عبیدۃ بن الجراح جیسے جلیل القدر، آزمودہ کار اور معمر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اس لشکر میں شامل فرمایا۔ آنحضرت ﷺ کی علالت ہی کے دوران یہ لشکر روانہ ہوا۔ ابھی مدینہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر گیا تھا کہ آپ ﷺ کی وفات ہو گئی۔ لشکر اسامہ کو جب اس کی اطلاع ملی تو حضرت اسامہ، فاروق اعظم اور حضرت ابو عبیدہ کے باہمی مشورے سے واپسی کا پروگرام بنایا گیا اور لشکر نے واپس آکر تجہیز و تکفین میں شرکت کی امیرالمومنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب دوبارہ لشکر اسامہ کو روانہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو بعض لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ اسامہ کے بجائے کسی پختہ کار اور جہاندیدہ آدمی کو سپہ سالار مقرر کیا جائے۔ اور خود حضرت اسامہ نے بھی درخواست کی کہ میرے بجائے کسی بزرگ صحابی کو لشکر کی قیادت دی جائے لیکن سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صرف ایک جواب تھا جسے رسول ﷺ نے سالار لشکر بنا دیا اسے ابو بکر معزول نہیں کر سکتا۔ لشکر مدینہ سے اسامہ کی قیادت میں اس شان سے روانہ ہوا کہ خود امیرالمومنین خلیفۃ المسلمین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ،

لشکر کو رخصت کرنے مدینہ سے باہر سے تشریف لے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور اُمت کا صدیق پا پیادہ گھوڑے کی باگ تھامے چل رہا تھا۔ اسامہ نے عرض کیا۔ خلیفہ یا تو آپ میرے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو جائیں یا پھر مجھے بھی پا پیادہ چلنے کی اجازت دیں یہ بے ادبی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ صدیق اکبر نے فرمایا "اسامہ تم گھوڑے پر سوار رہو اور میرے پیروں کو راہ خدا میں غبار آلود ہونے دو کہ جو قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوتا ہے ہر قدم پر سات سو نیکیاں نامۂ اعمال میں درج کی جاتی ہیں۔

شوقِ شہادت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بدر میں فتح کی بشارت دیدی گئی تو آپ اس سائبان سے نکلے جسے صحابہ کرام نے آپ کے قیام کے لیے میدان بدر میں تیار کر رکھا تھا اور اس جگہ پر تشریف لائے جہاں مجاہدین سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ کھڑے تھے صحیح مسلم شریف میں ہے کہ آپ نے لشکر اسلام کو مخاطب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا لوگو! سبقت کرو اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے۔ بہشت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ حضرت عمیر بن الحمام انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا واہ واہ آپ نے سوال کیا عمیر تو نے واہ واہ کیوں کہا؟ عمیر نے جواب دیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک خدائے ذوالجلال کی قسم اور کوئی وجہ نہیں صرف اس اُمید میں میں نے یہ جملہ کہا کہ شاید جنت والوں میں میں بھی شامل ہو جاؤں۔ آپ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ تو اہل جنت میں سے ہے۔ ایسا لگا جیسے مدتوں کا پیاسا چشمۂ حیواں کے پاس پہنچ گیا ہو۔ عمیر کے دل کی کلی کھل اُٹھی۔ حیات ولذت حیات کے شوق میں نہیں۔ زندگی کی رعنائیوں سے ہم کنار ہونے کے لیے بھی نہیں۔ بلکہ اس موت کی آغوش میں جانے کی

خوشی میں جس پر ہزاروں زندگیاں قربان۔ قلب کی پہنائیوں میں شوق شہادت انگڑائیاں لینے لگا۔ عمیر بن الحمام انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سرو بال دوش لگنے لگا۔ کھجوریں توشہ دان میں سے نکال نکال کر کھا رہے تھے۔ فوراً ہی پھینک دیں اور کہا کہ اگر ان کے کھانے میں ہی لگا رہا تھا تو زندگی بہت طویل ہو جائے گی۔ تلوار اٹھائی اور قتال میں مشغول ہو گئے۔ ابن اسحاق کی روائیت میں ہے کہ حضرت عمیر کی زبان پر یہ کلمات جاری تھے کہ ہر توشہ فنا ہو جانے والا ہے مگر تقویٰ اور پرہیزگاری کا توشہ۔ رشد و ہدایت کا توشہ نہ کبھی خراب ہو سکتا ہے اور نہ فنا۔ ایک مرتبہ گرد اڑی اور لوگوں نے دیکھا کہ عمیر کا سر قلم ہو چکا ہے اور جسم خون سے تر بتر ہے مسافر اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے۔ صدق اللہ و صدق رسولہ النبی الامی الکریم۔

جہاد فی سبیل اللہ

اس کو جہاد سے اتنا شغف تھا کہ دل و دماغ پر ہر وقت اس کے یہی دھن اور یہی سودا سوار رہتا۔ صحت ہو یا بیماری۔ گرمی ہو کہ سردی کوئی بھی صورتِ حال پیدا ہو جائے اس کی مجاہدانہ سرگرمیوں میں ذرہ برابر فرق نہ آتا۔ اس کی فیاضی بھی عموماً جہاد ہی کے سلسلے میں ہوتی۔ اور اسی کے فائدے کی غرض سے ہوتی جہاد کے علاوہ نہ وہ کسی موضوع پر گفتگو کرتا نہ کوئی گفتگو سنتا جہاد کے آلات اور ساز و سامان کے علاوہ کسی ساز و سامان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ غرض جہاد ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس نے بیوی بچے وطن گھر بار اور لذت و راحت کے سارے ساز و سامان چھوڑ کر خیمہ کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اور مقصود یہ تھا کہ رب تبارک و تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو۔ اور ختمی مرتبت حضرت محمد رسول اللہ کا پرچم

چار دانگ عالم میں اونچا ہو۔ جہاد سے سلطان کو اتنا شغف تھا کہ جو عالم اس کے دربار میں قرب حاصل کرنا چاہتا جہاد کے موضوع پر کتاب لکھ کر سلطان کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتا۔ اور سلطان اس پر انعام و کرام کی بارش کر دیتا۔ ایک مرتبہ اپنے ایک سردار سے مخاطب ہو کر سلطان نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام ساحلی علاقے مجھے فتح کروا دے تب بھی میں اسے مسلمانوں میں تقسیم کر کے سمندر کے جزائر کی تلاش میں نکل کھڑا ہونگا تاکہ روئے زمین پر کوئی منکر خدا باقی نہ رہے یا اسی راہ میں مجھے موت آجائے۔ ایک مرتبہ جنگ کے دوران میں اس کے نوجوان لڑکے اسماعیل کی موت کی خبر آگئی۔ مگر سلطان نے نہ تو یہ خبر کسی سے بیان کی اور نہ اپنے کسی طرز عمل سے اس کا اظہار کیا البتہ موت کی اطلاع کا جب خط پڑھتا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں حالتِ جنگ ہو یا امن سلطان ظہر کی نماز کے بعد حدیث یا فقہ کی کوئی کتاب ضرور پڑھوا کر سنتا۔ سارا یورپ فوج در فوج ہجوم کر کے بار ہا حملہ آور ہوا لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی کی شمشیر خارا شگاف کے سامنے کوئی ٹھہر نہ سکا۔ بیماری میں روزے چھوٹ گئے تھے بعدِ رمضان قضا روزے رکھنا شروع کئے حکیم نے منع کیا لیکن سلطان نے جواب دیا کہ نہیں پتہ نہیں آئندہ کیا ہو۔ مرض بڑھ گیا اور صفر کی ۲۷ تاریخ کو فجر کے وقت سلطان صلاح الدین ایوبی سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔ جامع دمشق میں سپرد خاک کیا گیا اور لاش کے ساتھ وہ تلوار بھی جو اللہ کی راہ میں ہمیشہ بے نیام رہی دفن کر دی گئی کہ اب اس کا چلانے والا ہاتھ باقی نہ رہ گیا تھا۔

غزوۂ اُحد اور حضرت زیادؓ

جبلِ اُحد کے دامن میں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی معمولی سی چوک نے جنگ کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا اور فتح شکست میں تبدیل ہونے لگی۔ لشکر

اسلامی کے علم بردار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو صورتاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے تھے ابن قمیہ نے شہید کر دیا اور غل مچا دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی۔ بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اُکھڑ گئے بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر لوٹ پڑیں۔ اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔ اس ہلچل اور اضطراب میں اکثروں نے تو بالکل ہی ہمت ہار دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کو خبر نہ تھی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چچا حضرت ابن نضر نے دیکھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیا ہے پوچھا کہ یہاں کیا کر رہے ہو حضرت عمر بولے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی تو اب لڑکے کیا کریں گے۔ ابن نضر نے کہا کہ "ان کے بعد ہم جی کے کیا کریں گے یہ کہہ کر دشمنوں کے لشکر میں گھس پڑے اور اسی سے زیادہ تیر تلوار اور نیزوں کے زخم کھا کر جام شہادت نوش کیا۔ جنگ جاری تھی کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر کعبۂ مقصود حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی آپ کو پہچان کر پکارا مسلمانوں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادھر موجود ہیں شہادت کی خبر جھوٹی تھی۔ اتنا سننا تھا کہ ہر طرف سے جانثار پروانہ وار لوٹ پڑے اور سب کے دل میں ایک نئے جوش اور ولولے نے جنم لے لیا۔ کفار کو جب پتہ چلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحیح سلامت ہیں تو انہوں نے ہر طرف سے ہٹ کر اسی رُخ پر زور دینا شروع کر دیا۔ دَل کا دَل ہجوم کر کے آگے بڑھتا مگر جاں نثاروں کی تلواروں سے ایسی بجلی کوند رہی تھی کہ جو سر آگے بڑھتا قلم ہو جاتا۔ حرارت ایمانی کے آگے بھلا کون ٹھہرتا۔ کافروں نے جب دیکھا کہ کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو رہی ہے تو انہوں نے اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کیا اور ایک ہی دفعہ ہلّا بول دیا۔ یہ بڑا نازک موقع تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "کون مجھ پر اپنی جان قربان کرتا ہے؟ صحیح مسلم شریف کی روایت کے مطابق حضرت زیاد بن مسکن

سات انصاریوں کو لے کر خدمت ادا کرنے کو آگے بڑھے۔ ان میں سے ہر ایک نے جانبازی و جاں نثاری سے لڑ کر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ جب کفار کا بادل چھٹ گیا اور ریلا تھم گیا تو حضور ﷺ نے دیکھا کہ حضرت زیاد بن مسکن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دم لبوں پر ہے جسم زخموں سے چور ہے۔ مگر وہ اپنے زخمی بدن کو گھسیٹتے ہوئے سرکار ﷺ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح پروانہ شمع کی طرف، چکور چاند کی طرف اور تھکا ماندہ مسافر اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ آقا نے حکم دیا زیاد کا لاشہ اٹھا لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے۔ کچھ کچھ جان باقی تھی۔ آقا نے بیٹھ کر زیاد کو اپنی آغوش میں لینا چاہا لیکن غلام نے آقا کے قدموں پر سر رکھا اور جان جاں آفریں کو سپرد کر دی کہ مسافر اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔

بچہ ناز رفتہ باشد زِ جہاں نیاز مندے
کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

جہاد فی سبیل اللہ

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی قیادت میں لشکر اسلام جا رہا تھا کہ راستے میں ایک غار کے قریب پڑاؤ ہوا۔ چھوٹا سا غار۔ اس کے سامنے صاف و شفاف ٹھنڈے پانی کا چشمہ پانی کی وجہ سے آس پاس کا علاقہ سرسبز و شاداب تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ نہ شور نہ شغب۔ بڑا ہی دلفریب منظر تھا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص سے رہا نہ گیا۔ غار کے قریب گیا۔ سبزہ۔ پانی اور غار کا پُرسکون منظر دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اسی جگہ ٹھہر جاؤں۔ چشمے کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیوں گا دو چار مویشی پال لوں گا۔ سبزہ موجود ہی ہے۔ گزر اوقات کی صورت نکل ہی آئے گی۔ غار کی تنہائی

میں بیٹھ کر اللہ اللہ کروں گا۔ دُنیا کے جھمیلوں اور بکھیڑوں میں پڑ کر تو سکون سے اللہ کا نام بھی نہیں لیا جاتا۔ فکر معاش۔ بال بچوں کے بکھیڑے۔ اعزاء و اقرباء کی دیکھ بھال یہ چیزیں تو اللہ کی یاد میں خارج ہوتی ہیں۔ یہ پُرسکون جگہ اس کام کے لیے بہت موزوں معلوم ہوتی ہے مسند امام احمد میں ہے کہ وہ شخص ہمت کر کے سرور کونین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہؤا اور آپ سے مستقل طور پر غار میں قیام کرنے اور یاد الٰہی میں مشغول ہو جانے کی اجازت طلب کی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا" میں دنیا میں یہودیت اور عیسائیت لے کر نہیں آیا ہوں بلکہ خالص توحید کے دین کے ساتھ میری بعثت ہوئی ہے۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد رسول اللہ ﷺ کی جان ہے اللہ کی راہ میں صبح یا شام کے وقت سفر کرنا دنیا و مافیہا سے زیادہ بہتر و افضل ہے۔ اور اے شخص سن لے کہ تھوڑی دیر تک مجاہدوں کی صف میں دشمن کے مقابلے میں کھڑا رہنا ساٹھ برس تک مسلسل نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

اسلام کو جو چیز دیگر ادیان عالم سے ممتاز کرنے والی ہے وہ یہی ہے کہ اسلام زندگی کو خانوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ نہ تگ و تاز حیات سے فرار اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ دنیا کا ہر وہ عمل جس سے خالق کائنات کی رضا مطلوب ہو دین ہے بشرطیکہ نیت خالص ہو اور بڑی سے بڑی عبادت شرک ہے۔ اگر عبادت سے مقصود خالق کے بجائے مخلوق کی رضامندی حاصل کرنا ہو۔ تمام عبادتوں میں سب سے افضل عبادت جہاد فی سبیل اللہ ہے کہ بندہ اپنے خون سے رب کریم کی ربوبیت اور رسول رحیم کی رسالت کی شہادت دیتا ہے ایسی شہادت جسے جھٹلایا جا سکے نہ کجلایا جا سکے اور بھلایا بھی نہ جا سکے۔

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سایہ میں   نماز عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایہ میں

اب سورج ڈھلنے لگا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ شہدا کی لاشیں لا لا کر رکھ رہے تھے۔ انہی میں سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بھی مثلہ شدہ لاش تھی۔ ناک کان کٹے ہوئے۔ سینہ شق۔ آنکھیں نکال لی گیئں تھیں۔ کم و بیش بدن پر اسّی زخم تھے۔ لاش کا پہچاننا دشوار ہو رہا تھا کہ حمزہ کی بہن سیدہ صفیہ تشریف لائیں۔ پیر کے انگوٹھے سے پہچانا کہ بھائی کی لاش ہے۔ مگر صرف ایک جملہ زبان سے نکلا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ چونکہ بھائی کی شہادت کی خبر سن چکی تھیں۔ اس لیے دو چادریں کفن کے لیے ساتھ لے آئی تھیں۔ اپنے بیٹے حضرت زبیر کو چادریں دیں۔ اور کہا کہ میرے بھائی کو کفن پہنا دینا۔ حضرت زبیر سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو کفنانے چلے تو کیا دیکھا کہ ان کے ساتھ ہی حضرت سہیل انصاری کی لاش بھی پڑی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ یہ تو اچھی بات نہیں کہ امیر حمزہ کو دو چادروں میں کفن دیا جائے اور ایک انصاری شہید کے پاس ایک چادر بھی نہ ہو۔ آخر فیصلہ ہوا کہ ایک چادر میں امیر حمزہ کو کفن دیا جائے اور ایک میں انصاری کو مگر عجیب اتفاق کہ جب چادریں کھولی گیئں تو ایک چادر بڑی تھی اور ایک چھوٹی ایک مرتبہ تو دل میں آیا کہ امیر حمزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں جلیل القدر صحابی ہیں سابق الایمان ہیں۔ سید الشہداء ہیں بڑی چادر میں ان کو کفن دیدیا جائے اور چھوٹی چادر میں انصاری کو۔ انصاری کو لپیٹ کر دفن کر دیا جائے پھر خیال آیا کہ کہیں بے انصافی نہ ہو جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا قرعہ ڈال لو۔ قرعہ ڈالا گیا تو بڑی چادر انصاری کے حصے میں اور چھوٹی امیر حمزہ کے نام پر نکلی۔ امیر حمزہ کا قد چونکہ نکلتا ہوا تھا اس لیے اُس چھوٹی سی چادر سے ان کا سر چھپایا جاتا تو پیر کھل جاتے اور پیر چھپائے جاتے

تو سر کھل جاتا۔ نبی ﷺ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا۔ ارشاد فرمایا چچا کا سر چھپا دو۔ اور پاؤں پر پتے ڈال دو ملتِ اسلامیہ کے اس شہید وفا کا جنازہ اس شان سے اُٹھا کہ اسے سالم کفن بھی میسر نہ تھا۔ لیکن انہی شہیدوں کے لہو کی بدولت شجرِ اسلام آج تک سرسبز ہے۔ اور انشاءاللہ قیامت تک سرسبز رہے گا۔

پہلی شہادت

یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ کسی عورت کو کبھی نبوت نہ ملی لیکن اسلام میں نبوت کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والی ذات ایک خاتون سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی ذات ہے۔ کہ جب غار حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ گھبرائے ہوئے در دولت پہ تشریف لائے تو سب سے پہلے حضرت خدیجہ نے آپ کو تسلی دی۔ اور آپ کی صداقت و دیانت، مہمان نوازی و کرم گستری، شرافت و صلۂ رحمی کا اقرار کیا۔ اور آپ کی تصدیق کی پھر جب آپ نے اعلان نبوت فرمایا اور تبلیغ کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کا جو کمزور و مظلوم طبقہ آپ پر ایمان لایا اور مصائب و آلام کا شکار ہوا تو اس میں بھی صہیب رومی، بلال حبشی، خباب بن الارث کے ساتھ ساتھ صف اوّل میں ایک عورت بھی نظر آتی ہے۔ یہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی والدۂ ماجدہ حضرت سمیہ بنت خیاط ہیں یہ چھوٹا سا کمزوروں کا گھرانا جس کے سربراہ حضرت یاسر تھے جب اسلام میں داخل ہوا تو نہ پوچھیئے کہ اس گھرانے کو کیسی کیسی طوفاں بدوش مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک طرف یاسر کے جسم پر کوڑوں کی بارش ہوتی تو دوسری طرف عمار نشانۂ ستم بنائے جاتے اور عمار کی والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو خاص طور پہ ستائی جاتیں مگر اسلام کی محبت چونکہ دل میں گھر کر چکی تھی اس لیے باوجود بڑھاپے اور کمزوری کے حضرت سمیہ کی پیشانی پہ بل بھی نہ پڑتے۔

اور نہایت خندہ پیشانی سے قسم قسم کی تکلیفیں اور مشقتیں جھیلتیں انہیں سخت دھوپ میں کنکریوں پر لٹا دیا جاتا اور کبھی لوہے کی زرہ پہنا کر دوپہر میں مکہ کی سنگلاخ چٹانوں کے درمیان کھڑا کر دیا جاتا۔ دھوپ سے لوہا تپنے لگتا اور جسم جھلس جھلس جاتا لیکن کیا مجال کہ جادۂ حق سے انحراف ہو۔ صبر و ضبط کا پیکر بنی کھڑی رہتیں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اس حال میں دیکھا تو جنت کی بشارت دی۔ اسی کے کچھ دنوں بعد ایک دن غصے میں آکر ابوجہل نے تاک کر آپ کے پیٹ پر ایسا برچھا مارا کہ آپ شہید ہو گئیں۔ محدثین نے لکھا ہے کہ اسلام کی خاطر پہلی شہادت ایک عورت ہی کی ہوئی۔ اور یہ سعادت حضرت سمیہ ام عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نصیب ہوئی۔

صلۂ شہید

اس کا کڑیل جوان بیٹا بدر میں شہید ہو گیا تھا۔ اب اس کی زندگی میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کے باطن میں شدید جنگ جاری تھی۔ ایک طرف فرض کی پکار تھی تو دوسری طرف ممتا کی آگ۔ ربیع بنت نضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دو تقاضوں کے درمیان مبتلائے کشمکش تھی۔ فرض نے پکارا اس نے اپنے خوبصورت، تنومند اور البیلے جوان بیٹے کے بدن پر اپنے ہاتھوں سے ہتھیار سجائے۔ اس کے گھونگھریالے بالوں کو سنوارا۔ شفقت سے سر پہ ہاتھ پھیرا اور میدانِ کارزار میں اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سر کٹانے کے واسطے روانہ کر دیا۔ امید صرف اتنی تھی کہ اگر بیٹا مقامِ شہادت پر فائز ہوا تو نہ صرف یہ کہ وہ خود بخشا جائے گا بلکہ اس کے طفیل میں اس کے والدین کی بھی مغفرت ہو جائے گی۔ بدر سے خبر آئی کہ ربیع بنت نضر کا بیٹا حارثہ شہداء بدر کی جماعت میں شامل ہو گیا۔ سینے میں ممتا کا الاؤ دہکنے لگا۔ مگر اسلام کی محبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے عشق اور حق کی سربلندی کی آرزو

آخر کار مامتا پر غالب آکر رہی۔ رُبیع بنت نے انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ بیٹے کی شہادت کی خبر سُنی۔ اگرچہ اس کی آنکھیں نم تھیں اور اگرچہ اس کے سینے میں جذبات کا جوالا اُبلنے کے لیے جوش مار رہا تھا۔ لیکن اس کی زبان پر صرف ایک کلمہ تھا انا للہ و انا الیہ راجعون غم و الم کی اس تاریکی میں ربیع کو کچھ نہ سوجھا سیدھی آقائے دو عالم سید الانبیاء ﷺ کے دربار گہربار میں حاضر ہوئی اور صرف ایک سوال کیا۔ صرف ایک۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک! آپ جانتے ہیں کہ مجھے حارثہ سے کتنی محبت تھی۔ میں نے اپنا خون پلا کر بڑے چاؤ سے اسے پالا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے دین کی نصرت کے لیے طلب کیا میں نے اسے بنا سنوار کر پیش کر دیا۔ اور اسے مقام شہادت ملا۔ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ وہ جنت میں ہے تو میں صبر کروں اور اللہ سے ثواب کی اُمید رکھوں اور اگر کوئی دوسری صورت ہے تو پھر آپ دیکھ لیں گے کہ میں گریہ و زاری کر کے آسمان سر پر اٹھا لوں گی۔ ربیع کی بات سُن کر حضور ﷺ نے فرمایا ربیع! کیا تو دیوانی ہو گئی ہے۔ ارے تیرا بیٹا حارثہ جنت کے معمولی درجے میں نہیں بلکہ جنت الفردوس میں ہے۔ ربیع کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے غم کے نہیں خوشی اور شکر گزاری کے۔

حیاتِ جاوید

آج تمہاری تعداد بھی کم ہے۔ وسائل بھی محدود ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں عزت و سربلندی عطا کر رکھی ہے۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب دوسری قومیں مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جسطرح بھوکے دسترخوان پر ٹوٹتے ہیں۔ صحابہ کرام کی مجلس سجی ہوئی تھی اور سرور کونین ﷺ کے لبہائے مبارک موتی برسا رہے تھے کہ ایک شخص نے سوال کر ہی دیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک آپ جس زمانے کا حال بیان فرما رہے ہیں

اس زمانے میں کیا مسلمان تعداد میں اتنے کم اور اتنے کمزور ہونگے کہ دوسری قومیں انہیں نگل لینے میں تُل جائیں گی؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ نہیں اس زمانے میں تمہاری تعداد کم نہ ہوگی بلکہ اُس وقت تو آج کے مقابلے میں تمہاری تعداد بہت ہی زیادہ ہوگی۔ لیکن تم اس وقت سیلاب کے جھاگ کی طرح ہو جاؤگے اور تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب اور ہیبت نکل جائے گی۔ تم پست ہمت ہو جاؤگے اور ہمت و جرأت کی یہی پستی تمہیں دشمنانِ اسلام کے لیے لقمۂ تر بنا دے گی۔

صحابی نے پھر سوال کیا اللہ کے رسول! آپ پر صلوٰۃ و سلام۔ آخر یہ تو بتلائیے کہ یہ پست ہمتی کیوں آجائے گی؟

صادق و مصدوق ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ سن لو یہ پست ہمتی اس لیے آئے گی کہ تم آخرت سے محبت کرنے کے بجائے دنیا سے محبت کرنے لگوگے اور خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو کے بجائے تم موت سے بھاگنے اور نفرت کرنے لگوگے۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیں تو شفیع مکرم نبی اعظم ﷺ کے قول کی صداقت آئینہ کی طرح واضح نظر آئے گی۔ موت ان کی محبوب ترین چیز تھی۔ کہ ان کے نزدیک اس موت میں جو راہِ خدا میں نازل ہو ایک خاص کرامت و عظمت تھی۔ یہ وجود مستعار تو ڈھلتی چھاؤں ہے ہے ہے نہیں ہے۔ البتہ جب زندگی کلمۂ حق کو بلند کرنے کے عظیم مقصد پہ قربان ہو جائے تو یہی بے حقیقت زندگی حیاتِ جاوید بن جاتی ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

بچّوں کا شوقِ جہاد

بدر کے لیے لشکر تیار ہو رہا ہے۔ مجاہدین خوشی خوشی ہتھیار جمع کر رہے ہیں۔ تلواروں پر سان چڑھائی جا رہی ہے۔ اونٹ اور گھوڑے تیار کیے جا رہے ہیں۔ لیکن عمیر بن ابی وقاص ہیں کہ چھپتے پھر رہے ہیں۔ کبھی اس مکان میں کبھی اُس مکان میں تاہم بڑے غور سے تمام تیاریوں کا جائزہ بھی لے رہے ہیں۔ آخر ان کے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص سے نہ رہا گیا۔ عمیر سے پوچھ ہی بیٹھے۔ عمیر آخر تم چھپتے کیوں پھر رہے ہو؟ کیا تمہیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف لشکر میں شامل کر لیا جائے گا۔ ارے بندۂ خدا! تمہاری تو عمر ہی ابھی بہت کم ہے۔ بچوں کو تو جہاد میں شامل ہی نہیں کیا جائے گا۔ پھر چھپنے کی وجہ؟ حضرت عمیر نے جواب دیا کہ چھپنے کی وجہ تو یہی ہے۔ سعد نے کہا ذرا وضاحت سے بتلاؤ۔ اب عمیر بن ابی وقاص نے سارا قصہ من وعن سنا دیا۔ کہا۔ بھائی! میں جہاد میں شرکت کے ڈر سے چھپتا نہیں پھر رہا ہوں۔ بلکہ یہ شوق جہاد ہے جس نے مجھے اس امر پر مائل کیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کو جہاد میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ چاہے جو بھی ہو جہاد میں شرکت کروں اور جام شہادت نوش کروں۔ مجھے دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لشکر کے ساتھ دیکھ لیا تو پھر ممانعت فرما دیں گے اور میری تمنا دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔ اس لیے اِدھر اُدھر چھپ کر وقت گزاری کر رہا ہوں۔ خیال ہے کہ لشکر جب روانہ ہونے لگے گا تو چپکے سے شامل ہو جاؤں گا۔ ایک بچے کے دل میں شوق جہاد اور اشتیاق شہادت دیکھ کر سعد چپ ہو رہے۔ جب لشکر روانہ ہونے لگا تو عمیر چپکے سے اس میں شامل ہو گئے۔ مگر ہوا وہی جس کا عمیر کو اندیشہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر بن ابی وقاص کو دیکھا تو کم عمر ہونے کی وجہ سے آپ نے انہیں ساتھ لے جانے سے انکار فرما دیا اور حکم دیا کہ گھر واپس جاؤ۔ معلوم ہوا جیسے کہ عمیر کی نگاہ میں دنیا تاریک

ہو گئی۔ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے اور آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگا۔ سرکار دوعالم ﷺ نے شوق و اضطراب کا یہ عالم دیکھا تو آپ سے رہا نہ گیا اور انہیں غزوۂ بدر میں شرکت کی اجازت دے دی۔ عمیر کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا۔ اور خوشی سے کھل اُٹھے۔ عمیر کا قد چھوٹا تھا۔ اور تلوار جس تسمے میں لٹک رہی تھی وہ بڑا۔ کبھی کبھی تلوار زمین پر گھسٹنے لگتی تو بڑے بھائی سعد بن ابی وقاص ان کے قریب جاتے اور گرہ لگا کر تسمے کو چھوٹا کر دیتے۔ عمیر کا رب عمیر کی معصوم تمناؤں کو رد کیسے کر سکتا تھا۔ جبکہ ان تمناؤں میں خلوص کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ بدر کی لڑائی اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ شام کی سیاہی اُفق پر چھا رہی تھی۔ مولائے کل فخر الرسل ﷺ ایک معصوم شہید کے سرہانے کھڑے تھے۔ اس لیے کہ معصوم عمیر کی دونوں تمنائیں پوری ہو چکی تھیں۔ بدر میں شرکت اور میدان کارزار میں نصرت حق کے لیے شہادت۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

حضرت عبداللہؓ اور حضرت سعدؓ کی دُعا

جنگ اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ میدان میں گہرا سناٹا ہے۔ ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ مُثلہ شدہ شکم چاک ہے۔ ناک اور کان کٹے ہوئے ہیں۔ زخموں سے خون بہہ بہہ کر جم چکا ہے۔ شام کا اندھیرا عنقریب چھانے والا ہے۔ لاش کے سرہانے ایک شخص کھڑا سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا ہے۔

"خدا تمہارے اُوپر اپنی بے پایاں رحمتوں کی بارش کرے۔ خدا کی قسم تمہاری دُعا میری دُعا سے بدرجہا بہتر تھی۔ جاؤ کہ حوران بہشت تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ بڑھو کہ عالم ملکوت کے باسی تمہارے استقبال کے لیے چشم براہ ہیں کہ تم قافلۂ سالار عشق بازاں اور سرخیل وفا شعاراں ہوں۔ لوگ تو حیات مانگتے ہیں۔ تم نے موت طلب کی تھی۔ ایسی مقدس موت جس پر ہزاروں

زندگیاں قربان۔ میدان میں جب دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے۔ جنگ شروع ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی کہ تم نے مجھ سے کہا تھا " سعد! آؤ سب سے علیحدہ ہو کر چند لمحوں کے لیے ایک گوشے میں چلیں اور اپنے معبود سے خلوص قلب کے ساتھ سرگوشی کریں۔ " میں تمہارے ساتھ چلا آیا تھا۔ تم نے کہا " سعد دعا مانگو کہ یہ قبولیت کا وقت ہے۔ میں نے دعا مانگی تھی۔ بار الہا! آج ایسے دشمن سے مقابلہ ہو جو نہایت شجاع، دلیر اور نہایت غضب ناک ہو کچھ دیر تک میں اس کا مقابلہ کروں اور وہ میرا مقابلہ کرے اس کے بعد اے اللہ! مجھے اس پر فتح نصیب فرما۔ یہاں تک کہ میں اسے قتل کر دوں اور اس کا سامان چھین لوں۔" تم آمین کہتے رہے۔ پھر میں نے کہا " اب تم دعا مانگو " تم نے دست دعا دراز کیا لیکن تم نے دعا کے کلمات دہرائے تو میں تصویر حیرت بن گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میری زبان پر تالے لگ گئے۔ عقل کند اور دماغ مختل ہو گیا تھا۔ عبداللہ بن جحش! تمہیں یاد ہو گا۔ تم نے کہا تھا۔ " اے اللہ! میں تجھے تیرے عزّ و جلال کی قسم دیتا ہوں آج جب لڑائی کا آغاز ہو اور اللہ کے رسول کی قیادت میں تیرے دوستوں اور دشمنوں کی تلواریں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں تو میرا سامنا ایسے دشمنوں سے کرانا جو معرکہ کارزار میں میرے اوپر ٹوٹ پڑیں۔ اور میں تیرے نام صرف تیرے نام کی عظمت کی خاطر اُن سے رزم آرا ہو جاؤں پھر وہ مجھے قتل کر دیں، میرا شکم چاک کر دیں۔ میری ناک اور کان کاٹیں، مجھے زخموں سے چور کر دیں۔ دامن اُحد کی سرزمین میرے خون سے رنگین ہو جائے اور پھر میرا تار حیات ٹوٹ جائے۔ اور اسی حالت میں مَیں تیرے دربار میں حاضر ہو جاؤں اور تو مجھ سے دریافت کرے " عبداللہ! یہ تیرا کیا حال ہے؟ تیری ناک تیرے کان اور تیرا شکم کہاں ہے؟ یہ تیرا کیا حال ہو گیا ہے؟ اور میں تجھے جواب دوں مالک! یہ سب کچھ محض تیری وجہ سے ہوا۔ میں نے اپنا سب کچھ صرف اس لیے لٹا دیا کہ تیرے نام کی عظمت قائم ہو۔ تیرا کلمہ بلند ہو۔ تیرے دین کا

پرچم اُونچا ہو اور قیامت تک میناروں سے تیرا اور تیرے رسول کا نام پکارا جائے۔" عبداللہ! نہ جانے اجابت کی وہ کونسی گھڑی تھی کہ میری دعا بھی قبول ہوئی اور تمہاری دعا بھی شرف قبول سے نوازی گئی۔ مگر بخدا! تمہاری دعا میری دعا سے بدرجہا بہتر تھی۔ آج اُحد سے دولہا تم ہی ہو۔ تم ہار کر جیت گئے۔ تم نے تاریخ اسلام کے صفحات پر اپنے خون سے مہر وفا کی جو داستان رقم کی۔ وقت کا کوئی انقلاب اور شام و سحر کی کوئی گردش نہ اُسے بھلا سکے گی۔ نہ کجلا سکے گی۔ عشق و مستی کا جب کوئی افسانہ لکھا جائے گا تمہارا خون اس افسانے کا عنوان اور تمہاری مقدس شہادت اس کی سُرخی بنے گی۔ تم نے جان دے کر حیات جاوداں خریدی ہے۔ حق و باطل کے معرکے میں جب کبھی قوم مسلم صف آراء ہو گی تمہاری یہ مثلہ شدہ لاش اس کے لیے منارۂ نور اور نشان منزل ثابت ہو گی۔ عبداللہ بن جحش! شہادت کے معنی گواہی کے ہیں۔ تم نے اپنے زخموں کی زبانؓ سے گواہی دی ہے۔ خدا کی قسم ابد تک اس گواہی کو کوئی جھٹلا نہ سکے گا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

حضرت خثیمہؓ اور شوقِ شہادت

شاید تاریخ کی آنکھوں نے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا ہو گا کہ ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا۔ جاہ و منصب، عزت و وقار، مال و دولت اور تخت و تاج کی نہیں زندگی اور زندگی کی لذتوں کی بھی نہیں۔ مانگنے والا موت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ زندگی سے بیزار تھا۔ اس لیے بھی نہیں کہ اس کا ارادہ خود کشی کا تھا۔ خودکشی تو بزدلوں کا کام ہے۔ جو لوگ زندگی کے حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور ہمت ہار دیتے ہیں خودکشی کی آغوش میں پناہ ڈھونڈتے ہیں یہ تو

بہادر تھا۔ جری اور دلیر اگرچہ اس کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ بڑھاپا انگ انگ اور عضو عضو پر حاوی ہو چکا تھا۔ مگر شوقِ شہادت تھا کہ انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اضطراب وکرب کا مجسمہ بنا ہوا بوڑھا خیثمہ سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سوالی تھا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیک ایک نگاہِ کرم میری طرف بھی۔ یہی محروم و مہجور ایک سال سے والہانہ جل رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب معرکہ بدر کے لیے آپ روانہ ہو رہے تھے تو میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلیں اور میں کفر کے مقابلے میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے خالق و مالک کے آگے سرخرو ہو جاؤں مگر اُس وقت میرا بیٹا سعد بن خیثمہ آڑے آ گیا۔ میں نے کہا تھا کہ گھر میں عورتیں اور چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ تم ٹھہر جاؤ، مجھے جانے دو۔ مگر وہ راضی نہ ہوا یارسول اللہ آپ پر صلوٰۃ وسلام آپ کو یاد ہو گا کہ آپ ہی کے حکم سے قرعہ نکالا گیا اور سعد کا نام نکل آیا۔ اس وقت میں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ بیٹے تم ایثار کر لو اور مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے دو مگر اس نے جواب دیا کہ ابّا جان! جنت کے سوا اگر اور کوئی معاملہ ہوتا تو میں ضرور ایثار کرتا اور آپ کو اپنے نفس پر ترجیح دیتا لیکن میں اس سفر میں اپنے شہید ہو جانے کی قوی اُمید رکھتا ہوں اس لیے یہ موقع میں ہاتھ سے جانے نہ دوں گا۔ یارسول اللہ! وہ آپ کے ساتھ چلا گیا اور بدر میں عمرو بن عبدود کے ہاتھوں شہید ہوا۔ گزشتہ شب میں نے اپنے بیٹے کو خواب میں دیکھا ہے۔ نہایت حسین و جمیل جنت کے باغات اور نہروں میں تفریح کرتا پھرتا ہے۔ اس نے خواب میں مجھ سے کہا ہے کہ ابّا جان! تم بھی یہاں آ جاؤ دونوں مل کر جنت میں ساتھ رہیں گے۔ مجھ سے میرے رب نے جو وعدہ کیا تھا میں نے اسے حق پایا۔ یارسول اللہ اس وقت سے میں اپنے بیٹے کی ملاقات کا مشتاق ہوں۔ اب صرف میری ایک تمنا ہے کہ کسی طرح اپنے رب سے جا ملوں۔ حضور! آج معرکہ احد گرم ہونے والا ہے۔

آپ دعا فرمایئے کہ مجھے شہادت کا مرتبہ اور جنت میں اپنے بیٹے کی رفاقت حاصل ہو جائے۔ طلب صادق تھی اور جذبہ معصوم۔ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست دعا بلند فرما دیا۔ اور قبولیت فوراً ہی عرش سے اُتر آئی۔ احد کا معرکہ بپا ہوُا اور تھوڑی ہی دیر بعد حضرت خثیمہ رضی اللہ عنہ کی روح مبارک اعلیٰ علیین کی طرف محوِ پرواز تھی۔ خثیمہ نے بارگاہ رسالت سے شہادت کی بھیک مانگی تھی۔ سخی نے سائل کا سوال پورا کر دیا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

نفع کا سَودا

یہ بھی زمانے کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ چشم زدن میں ایک ہی خاندان تین حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ لیکن صبر کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹا۔ کفار کے مظالم سے تنگ آ کر حضرت عبداللہ اور ان کی بیوی ہند حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ اللہ نے حبشہ کے دوران قیام میں ایک چاند جیسا بیٹا دیا۔ نام سلمہ رکھا گیا۔ اور باپ عبداللہ کی بجائے ابو سلمہ اور ماں ہند کے بجائے ام سلمہ کے نام سے پکاری جانے لگیں۔ حبشہ میں خبر ملی کہ مکہ والے مسلمان ہو گئے ہیں تو خوشی خوشی تین آدمیوں پر مشتمل یہ خاندان واپس مکہ پہنچا۔ لیکن خبر غلط ثابت ہوئی۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ ہجرت فرما چکے تھے۔ ابو سلمہ نے فیصلہ کیا کہ مدینہ چلنا چاہیئے۔ بیوی اور بچے کو ساتھ لیا اور مکہ سے چل نکلے۔ کفار کو خبر ہوئی تو شہر سے باہر ہوتے ہی انہیں گھیر لیا۔ ابو سلمہ کے خاندان والے بھی تھے۔ اور ام سلمہ کے قبیلے والے بھی۔ سواری روک دو۔ ہر طرف سے آواز آئی۔ ابو سلمہ ٹھہر گئے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ ام سلمہ کے اہلِ قبیلہ آگے بڑھے اور دریافت کیا۔ کیا تم مکہ چھوڑ رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا۔ ہاں! اتنا سُننا تھا کہ بنو مغیرہ نے جو ام سلمہ کے اہلِ قبیلہ تھے آگے بڑھ

کہ اونٹ کی مہار حضرت ابو سلمہ کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور کہا کہ تم اپنی مرضی کے مالک ہو جہاں چاہو جاؤ لیکن ہمیں یہ گوارا نہیں کہ ہمارے خاندان کی خاتون تمہارے ساتھ دربدر ماری پھرتی رہے۔ ام سلمہ گود میں بچے کو لیے اونٹ پر بیٹھی بے بسی سے شوہر کو دیکھ رہی ہیں۔ فریاد کی لیکن وہ درد بھری فریاد دل پر اثر کر سکتی تھی پتھر پر کیا اثر کرتی۔ اہلِ قبیلہ ام سلمہ کا اونٹ لے کر ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ بنو مخزوم حضرت ابو سلمہ کے قبیلے والوں نے راستہ روک لیا۔ تم اپنے خاندان کی خاتون کو لے جا سکتے ہو۔ لیکن ابو سلمہ کا بیٹا سلمہ ہمارے خاندان کا فرد ہے ہم اسے تمہارے حوالے نہیں کر سکتے یہ کہہ کر ایک ظالم بڑھا اور ماتا بھری گود سے سلمہ کو چھین لیا۔ ابو سلمہ کے دل سے ہوک اٹھی کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ بیک وقت دونوں قبیلوں سے ٹکرانے کی طاقت نہ تھی۔ ایک طرف بیوی جا رہی تھی دوسری طرف بچہ۔ ابو سلمہ نے اپنا رُخ مدینے کی طرف موڑا کہ ان کے درد کی دوا تو وہیں تھی۔ دل نے پکار کر کہا ابو سلمہ تیری بیوی اور تیرے بچے کو تجھ سے جدا کر دیا گیا۔ پھر بچے کو ماں سے چھین لیا گیا۔ تو نے یہ سارے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ پلک جھپکتے تیرا خاندان تین حصوں میں بٹ گیا۔ سب کچھ تو چلا گیا۔ کچھ بھی تو نہ رہا۔ پھر بھی تو نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ یہ تو خاندان تھا دین تو ایسی چیز ہے کہ اس کے لیے نقد جان بھی ہارنی پڑتی ہے۔ ممکن ہے کہ ابو سلمہ کی اس مصیبت پر چشم فلک خون کے آنسو بہا رہی ہو اور مکہ کے درو دیوار بھی لرز گئے ہوں۔ لیکن ابو سلمہ اس لیے مطمئن تھے کہ سب کچھ ہار کر بھی وہ بازی جیت چکے تھے۔ ابو سلمہ نے اللہ کے لیے سب کو چھوڑا تھا پورا ایک سال بھی نہ گزرا کہ اللہ نے باپ۔ بیٹے اور ماں سب کو مدینے کی خنک چھاؤں میں اکٹھا کر دیا۔ عشق و ایمان کا امتحان لیا گیا اور تین افراد پر مشتمل یہ خانوا ، کامیاب و کامران قرار پایا۔

حضرت امّ حرامؓ کی آرزو

اگرچہ وہ ایک عورت تھی اور عورتوں پر جہاد فرض نہیں۔ تاہم جہاد فی سبیل اللہ کے فضائل سُن سُن کر آتشِ شوق تیز سے تیز تر ہوتی رہتی وہ زندگی ہی کیا جو اعلاء کلمتہ الحق کے راستے میں کام نہ آئے۔ جانور اپنی زندگی کا کوئی مقصد متعین نہیں کرتے بس کھاتے جاتے ہیں اور جیتے جاتے ہیں۔ ایک دن موت آ جاتی ہے اور ختم۔

انسان تو ایک اعلیٰ وارفع مخلوق ہے جسے بلند ترین مقاصد کی تکمیل کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی تخلیق کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک وقت مقررہ تک کھائے پیئے۔ عیش کرے اور پھر مر کر مٹی میں مل جائے۔ اسے تو خلافت ربانی کے عظیم فریضے کو انجام دینا۔ حق کو غالب کرنا باطل کو مغلوب کرنا۔ اور خالق کائنات کی سجائی ہوئی اس بزم کائنات کو حسین سے حسین تر اور مفید سے مفید تر بنانا ہے۔

حضرت انس کی خالہ ام حرام کے سر میں بھی یہی سودا سمایا ہوا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کا قرب انہیں حاصل تھا۔ آپ کثرت سے ان کے گھر تشریف لے جاتے اور کبھی دوپہر میں انہیں کے مکان میں آرام بھی فرماتے۔ ایک دن جو ام حرام کے مقدر کا ستارہ چمکا۔ تو آقا نے دوپہر میں انہیں کے گھر کو قیام گاہ بنایا۔ کھانا کھانے کے بعد آپ تھوڑی دیر کے لیے سو رہے اچانک آپ اُٹھ بیٹھے اور مسکرانے لگے۔ ام حرام نے جو رُخِ نبوت پر مسکراہٹ کی لہریں دیکھیں تو برداشت نہ کر سکیں دریافت کیا حضور! میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کس بات پر مسکرا رہے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا " ابھی ابھی میری اُمت کے کچھ لوگ مجھے دکھلائے گئے ہیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے ارادے سے سمندر پر اس طرح سوار چلے جا رہے تھے جیسے کہ تخت شاہی پر بادشاہ بیٹھے

ہوں۔ ام حرام کے سینے میں دبی ہوئی آرزوئیں ایک دم سے مچل اُٹھیں۔
جذبات میں ہیجان بپا ہو گیا۔ عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک آپ
دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس جماعت میں شامل فرمائے۔ آپ نے
ارشاد فرمایا ام حرام تم بھی اس میں شامل ہو گی۔ اس کے بعد آپ پھر سو رہے
اور دوسری بار بیدار ہو کر پھر اسی طرح ارشاد فرمایا۔ دوسری مرتبہ بھی ام حرام
نے درخواست کی کہ دعا فرمائیں میں بھی اس جماعت میں شامل رہوں۔ سرکار
صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ام حرام! تم پہلی جماعت میں ہو گی۔ حضرت عثمان
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ خلافت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اس
وقت شام کے حاکم تھے خلیفہ سے جزائر قبرص پر حملے کے اجازت طلب کی۔
حضرت عثمانؓ نے اجازت دے دی۔ لشکر سمندر کے راستے روانہ ہوا۔
ام حرام بھی اپنے شوہر حضرت عُبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شریکِ سفر تھیں۔ سمندر
میں سفر کے دوران کوئی کچھ سوچ رہا تھا اور کوئی کچھ۔ ام حرام کی نگاہوں کے
آگے تو اپنے گھر کی وہ دوپہر تھی جب مسکراتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے
تھے۔ اور ام حرام کے حق میں اس سفر کی پیش گوئی فرمائی تھی۔ صحیح بخاری شریف
میں ہے کہ جزائر قبرص سے روانگی کے وقت ام حرام خچر پر سوار ہونے لگیں
تو خچر بدکا اور ام حرام اس پر سے گر پڑیں گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وفات
پا گئیں سرزمین قبرص نے اس مجاہدہ کی لاش کو اپنی چادر میں چھپا لیا۔ کہ بڑی
محترم لاش تھی۔ شوقِ جہاد سے سرشار ایک سیدہ کی لاش۔ اور پھر حضور نے بھی
تو فرمایا تھا کہ تم پہلی جماعت میں ہو گی۔ جب دوسری بار جزائر قبرص پر
حملہ ہوا تو بھلا ام حرام اس میں کیسے شامل ہو سکتی تھیں۔ لسان نبوت تو لسان
صدق ہوتی ہے۔

ایک ہی تمنّا

وہ کوئی بڑا عالم و فاضل یا محدث و مفسر نہیں تھا۔ سیدھا سادہ وہ بدو تھا۔ مگر اس کا سینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی ہی ملاقات میں نورِ ایمان کا خزینہ بن چکا تھا۔ ایک دن آپ کی خدمت میں حاضر ہؤا۔ اسلام قبول کیا۔ اور ساری زندگی آپ کے دامانِ رحمت سے رہنے کا عہد کر لیا۔

رزق حلال کمانے کے لیے لوگوں کے اونٹ چرایا کرتا اور مزدوری کے بعد جو وقت ملتا دربار نبوی میں حاضر رہتا۔ اگر غزوات پیش آتے تو ان میں شرکت کرتا۔ اور واپس آکر پھر اپنے کام میں لگ جاتا۔ سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ نہ ماں نہ باپ نہ بھائی نہ بہن۔ نہ جورو نہ جاتا۔ اس کی نگاہیں صرف ایک ذات پر مرکوز تھیں۔ وہی ذات اس کی مطلوب و مقصود تھی۔ ایک دن غزوے سے واپس آکر لوگوں کے اونٹ لیے اور چرانے کے لیے جنگل کی طرف نکل گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو صحابہ کرام نے مالِ غنیمت کا حصّہ اس کے حوالے کیا۔ غنیمت لے کر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہؤا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیک یہ کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا تم نے غزوے میں شرکت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب کی اور مالِ غنیمت حاصل ہؤا۔ مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا گیا اور تمہارا حصّہ تمہیں دیدیا گیا۔ اسے قبول کرو۔ بدو کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ آقا! میں نے مالِ غنیمت کے لیے تو اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ میری صرف ایک آرزو ہے کہ میرے حلق کے اس حصّے پر دشمن کا ایک تیر لگے اور میں مر کر جنت میں داخل ہو جاؤں۔ اس کے سوا میری کوئی تمنا ہے نہ آرزو۔ دل کی گہرائیوں سے آواز نکل رہی تھی اور اجابت خداوندی بہرِ استقبال عرش سے اُتر رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر تو اللہ کے نزدیک اپنی نیت میں سچا ہے تو اللہ تجھے سچا ہی کر دکھائے گا۔ بدو کو یقین ہو گیا اور وہ پہلے کی طرح اپنے کام میں لگ گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک غزوہ پیش آیا

اور وہ بدو بھی اس غزوے میں شریک ہوا۔ چونکہ طلب سچّی تھی۔ نیّت میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس لیے شام کے وقت جب شہداء کی لاشیں اٹھائی جانے لگیں تو اس بدو کی لاش بھی سردار انبیاء ﷺ کے حضور لائی گئی۔ اسے ٹھیک اسی جگہ تیر لگا تھا۔ جہاں تیر لگنے کی خواہش اس نے کی تھی۔ روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ بدو اپنی مراد کو پہنچ چکا تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے حلق پہ تیر کھانے اور جامِ شہادت نوش کرنے کی آرزو ظاہر کی تھی؟ لوگوں نے کہا۔ جی ہاں یہ وہی شخص ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ یہ سچا تھا اللہ تعالیٰ نے بھی اسے سچا ہی کر دکھایا۔

نسائی شریف میں حضرت شداد بن الهاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی رحمت ﷺ نے اُسی وقت اپنا جبہ مبارک اُتارا اور اس میں اُس شہید وفا کو کفنایا پھر اس کی نماز جنازہ ادا فرمائی اور دعا فرمائی۔ مولا! یہ تیرا بندہ ہے جو تیری راہ میں مہاجر بن کر نکلا۔ تیری ہی راہ میں شہید ہو کر مرا۔ مولا! میں اس کی ہجرت و شہادت کا گواہ ہوں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

بابِ نہم

اکلِ حلال

حلال روزی

حضور ﷺ رحمت مجسم تھے۔ ترسٹھ سالہ حیات طیبہ میں آپ نے کسی سے اظہار نفرت کیا نہ کسی کی تحقیر کی۔ آپ کے دامان رحمت میں سب کو پناہ ملی۔ چاہے وہ آپ کا جانی دشمن تھا، چاہے اس نے آپ پر اپنی سابقہ زندگی میں پتھروں کی بارش کی تھی۔ آپ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ آپ کے اور آپ کے اہل خانہ کے خلاف گندے اور بے ہودہ اتہامات تراشے تھے۔ لیکن جب اس کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے نے آپ سے آپ کا پیراہن مبارک طلب کیا کہ اپنے باپ کے کفن میں شامل کر دے تو آپ نے بغیر کسی پس و پیش کے اس کی درخواست قبول فرمالی کہ شانِ رحمۃ للعالمینی کا یہی تقاضا تھا۔ دوستوں پہ بارشِ کرم کرنا بڑی بات نہیں کہ یہ تو سب ہی کرتے ہیں۔ آپ کا اصل کام تو دشمنوں کو سینے سے لگا لینا تھا۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ وہی رحمۃ للعالمین، وہی باعث تخلیق کائنات، وہی سواد دیدۂ امکاں اور وہی بشیر و نذیر ﷺ جن کے سایہ کو گلشن ترستے تھے۔ اور جو طائف جیسی پتھروں والی زمین کے مکینوں پر پھولوں کی بارش کی دعا مانگ رہے تھے یک بیک انتہائی غضب ناک ہو کر ارشاد فرمانے لگتے ہیں "کہ خائب و خاسر ہو دینار و درھم اور ریشمی لباسوں کا بندہ کہ اگر اُسے دیا جائے تو خوش رہے اور نہ دیا جائے تو ناراض ہو جائے

ایسا ذلیل اور لالچی شخص ہلاک و برباد ہو جائے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر ایسے شخص کے پاؤں میں کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ کانٹا بھی نہ نکالا جائے اور اسے اسی حال میں چھوڑ دیا جائے۔"

غور طلب امر یہ ہے کہ آخر ایسے شخص پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنے برہم کیوں ہیں؟ وہ کافر و مشرک بھی نہیں وہ اسلام کے خلاف علم بغاوت بھی بلند نہیں کر رہا۔ تو پھر اس قدر ناراضگی کا سبب؟

وجہ یہ ہے کہ مال کا لالچ اور عیش و تنعم کی زندگی گزارنے کی اندھی طمع تمام مفاسد کی جڑ ہے۔ اس سے معاشرہ فاسد ہوتا ہے۔ اصحاب حق اپنے حق سے محروم رہ جاتے ہیں اور غیر مستحق لوگ ان کے حقوق غصب کر لیتے ہیں۔ پھر جب حرام مال کسی کے پاس جمع ہو جائے تو وہ "بسوئے حرام رفت" کے اصولوں کے مطابق انسان کو انسان کے بھیس میں درندہ بنا دیتا ہے۔ رشوت ستانی اور اقرباء پروری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں۔ قدریں پامال ہو جاتی ہیں بے حیائی عام ہو جاتی ہے۔ اور اُمت اسی ڈگر پر چلنے لگتی ہے جس پر پہلی اُمتیں چل کر ہلاک ہوئی تھیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت عمر بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خدا کی قسم مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ تم میرے بعد فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاؤ گے مجھے تو اس بات کا ڈر ہے کہ تمہارے اوپر دنیا اسی طرح پھیلا دی جائے گی جس طرح ان قوموں پر پھیلائی گئی تھی جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں پھر تم اندھا دھند طلب دنیا میں اسی طرح لگ جاؤ گے جس طرح وہ قومیں لگ گئی تھیں اور دنیا کی حرص تمہیں بھی اسی طرح ہلاک کر دے گی جس طرح اُس نے انہیں ہلاک کیا تھا۔

حرام روزی قلب میں تاریکی پیدا کرتی ہے اور رزق حلال قلب کو حکمت و شرافت سے معمور کرتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ میرے لیے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا فرمادیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ حلال روزی کھاؤ۔ تمہاری دعائیں قبول ہونگی۔ صحیح مسلم شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے پریشان بالوں والے سفر سے غبار آلود اور میل کچیل میں آئے ہوئے لوگ جن کا کھانا حرام اور لباس حرام طریقوں سے حاصل کیا ہؤا ہوتا ہے۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ بھلا ایسے لوگوں کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں ایک روایئت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "عبادت کے دس حصے ہیں ان میں سے نو حصے حلال روزی طلب کرنے میں ہیں"۔

رشوت کھانا خنزیر کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رشوت لینے والے، رشوت دینے والے اور بیچ میں پڑ کر رشوت کا معاملہ طے کرانے والے سب کے سب جہنمی ہیں۔

دُعا کے قبول نہ ہونے کی وجوہات

عوام بھی موجود تھے اور خواص بھی۔ درمیان میں ایک پُر وقار شخصیت جلوہ افروز تھی۔ عبادت کا نور چہرے سے چھلکا پڑتا تھا۔ نگاہ نیچی۔ قلب یادِ الٰہی میں غرق۔ غیر معمولی سنجیدہ۔ ایسا لگتا کہ ماہتاب کے گرد ایک ہالہ ہے۔ جب کوئی سوال کیا جاتا فوراً جواب مل جاتا۔ مریض اکٹھا تھے۔ ہر ایک اپنا مرض بیان کرتا۔ اور طبیب حاذق انتہائی نرمی اور متانت سے اس کے لیے نسخۂ شافی تجویز کر دیتا۔ اللہ والے دلوں کے طبیب ہوتے ہیں۔ مکر وریا سے پاک۔ خلق خدا کے غم خوار و غم گسار۔ سب کے دکھ کے ساتھی۔ دل درد مند والے سب کو دیتے ہیں اور کسی سے کچھ لینا پسند نہیں کرتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے

بارے میں صادق ومصدوق ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر کوئی قسم دے دیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو ضرور پورا کرتا ہے۔ اس بزرگ کا لباس فاخرانہ نہیں ہے۔ خرقۂ فقر میں ملبوس ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تختِ سلیمان پر بیٹھے ہیں۔ کسی کو جھڑکتے ہیں نہ کسی کی تحقیر و توہین کر رہے ہیں۔ گناہ میں لتھڑے ہوئے لوگ آ رہے ہیں اور فیضانِ نظر سے سنور کر جا رہے ہیں۔ کبھی یہ بلخ کے حکمراں ہوا کرتے تھے۔ مگر اب نہ تختِ شاہی ہے نہ کج کلاہی۔ اب دوسری ہی حکومت حاصل ہو چکی ہے۔ مجلس میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر سوال کیا۔ حضرت! کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں قبول نہیں فرماتا۔ حضرت ابراہیم ادھم بلخی رحمتہ اللہ علیہ نے سائل کا سوال نہایئت توجہ سے سُنا اور جب جواب دینا شروع کیا تو مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں اس لیے قبول نہیں فرماتا کہ تم خدا کو جانتے اور مانتے ہو مگر اس کی اطاعت نہیں کرتے۔ رسول اکرم سید الانبیاء والمرسلین ﷺ کو پہچانتے ہو مگر ان کی پیروی نہیں کرتے۔ قران کریم پڑھتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قسم قسم کی نعمتیں کھاتے ہو مگر اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ یہ جانتے ہو کہ بہشت اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرنے والوں کے لیے ہے مگر اس کی طلب نہیں رکھتے۔ یہ جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والوں کا ٹھکانا جہنم ہے مگر اس سے ڈرتے نہیں۔ تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ شیطان تمہارا دشمن ہے پھر بھی اس سے نہیں بھاگتے۔ بلکہ اُلٹا اس کو اپنا دوست بنائے ہوئے ہو۔ تم جانتے ہو کہ موت برحق ہے۔ اور ایک نہ ایک دن اس دنیا کو چھوڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہونا ہے مگر اس سفر کا کوئی سامان نہیں کرتے۔ بلکہ دن رات دنیا سمیٹنے اور متاعِ دنیا کو جمع کرنے میں سرگرداں ہو۔ اپنے خویش و اقارب کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کرتے ہو مگر عبرت نہیں پکڑتے۔ نہ اپنی برائیوں کو ترک کرتے ہو۔ لوگو! تم دوسروں کے عیب تو تلاش کرتے ہو

کبھی اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال کر دیکھا ہے کہ خود تمہارے اندر کتنے عیوب ہیں؟ بے عیب ذات خدا کی ہے۔ کون انسان ہے جس میں عیب نہیں۔ غفلت نہیں۔ کوتاہی نہیں۔ اس لیے دوسروں کا عیب تلاش کرنے سے پہلے اپنے عیبوں کی خبر لینی چاہیئے۔ یہ تو تمہارا حال ہے۔ بھلا بتلاؤ کہ ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔ شیخ ابراہیم ادھم بلخی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی گفتگو ختم کی تو مجمع اشک بار تھا۔ شیخ نے ہر شخص کے سامنے ایک ایک آئینہ رکھ دیا تھا۔ جس میں ہر شخص اپنا اپنا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

ایماندار تاجر

بازار میں خرید و فروخت اپنے شباب پر تھی۔ ہر طرف بھیڑ بھاڑ اور شور و شغب تھا کہ مؤذن کی اذان فضاؤں میں گونجنے لگی سناٹا چھا گیا اور آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹنے لگی۔ سلے سلائے کپڑوں کے مشہور تاجر یونس بن عبید بھی اپنی دکان سے اُتر پڑے اور اپنے بھتیجے کو اپنی جگہ بٹھلا دیا۔ اکثر و بیشتر بھتیجا یونس بن عبید کی غیر موجودگی میں دکان پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس لیے وہ کپڑوں کی قیمت سے بھی واقف تھا۔ اور دیگر اصولوں سے بھی آگاہ۔ یونس مسجد کی طرف چلے گئے اور ایک خریدار دکان پر آیا۔ اس نے یونس کے بھتیجے سے کہا کہ مجھے چار سو کا جوڑا دکھاؤ۔ بھتیجے نے ایک جوڑا اس کے سامنے رکھ دیا۔ خریدار جوڑے کو اُلٹ پلٹ کر دیر تک دیکھتا رہا۔ کپڑے کی نفاست اور اس کی سلائی کا جائزہ لینے کے بعد خریدار پوری طرح مطمئن ہو گیا۔ رقم نکالی اور یونس کے بھتیجے کے حوالہ کر دی۔ خریدار نے اپنا پرانا جوڑا دکان کے ایک کونے میں اتارا اور نیا جوڑا زیب تن کر لیا۔ اب خریدار کو جماعت کا خیال آیا تو مسجد کی طرف لپک پڑا لیکن جماعت تو ہو چکی تھی۔ نمازی مسجد سے نکل رہے تھے خریدار چونکہ اجنبی تھا اسے مقامی جماعت کے اوقات کا علم نہ تھا۔ اس لیے اس سے یہ

غفلت سرزد ہوگئی۔ خیر۔ اب چل کر مسجد میں نماز پڑھ لوں یہ سوچ کر مسجد کے دروازے کی طرف بڑھا کہ یونس بن عبید سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یونس نے وہ حُلّہ پہچان لیا جو خریدار کے بدن پر تھا۔ اس سے دریافت کیا بھائی یہ جوڑا تم نے کس دکان سے اور کتنی قیمت میں خریدا ہے۔ خریدار نے جو اتا پتا بتایا تو یونس سمجھ گئے کہ میری ہی دکان سے خریدا ہے لیکن جب اس نے قیمت بتلائی تو یونس چکرا گئے کیونکہ اس جوڑے کی قیمت تو دو سو درہم تھی۔ اور ان کے بھتیجے نے دو سو کا جوڑا چار سو میں بیچ دیا تھا۔ یونس نے خریدار سے کہا بھائی آپ نماز پڑھ کر میرے ساتھ چلیں۔ نماز کے بعد سخت غصّے میں یونس خریدار کا ہاتھ تھامے اپنی دکان پر آئے اور بھتیجے سے کہا ظالم! تونے اس بیچارے خریدار کو دو سو کے جوڑے چار سو میں بیچے ہیں تجھے ایک مسلمان کو دھوکا دیتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ [یونس کی گفتگو سُن کر خریدار نے مداخلت کی۔ بابا! آپ خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ ہمارے شہر میں تو یہی جوڑا پانچ سو درہم میں ملتا ہے۔ پھر میں نے برضا و رغبت اسے خریدا ہے۔ اس نوجوان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یونس نے کہا۔ جناب یہ ٹھیک ہے لیکن آپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ مومن کی خیر خواہی دنیا اور دولتِ دنیا سے ہزار گونہ بہتر ہے] مومن کو چاہیئے کہ جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرے۔ نفع لینا منع نہیں لیکن نفع کے نام پر لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہرگز روا نہیں ہے۔ احیاء العلوم میں امام غزالی نے لکھا ہے کہ یونس نے اپنے بھتیجے کو بہت بُرا بھلا کہا اور اسی وقت دو سو درہم صندوقچی سے نکال کر خریدار کو لوٹا دیئے کہ مومن کامل کی یہی شان ہے۔

اکلِ حلال

خدا کی قسم مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ میرے بعد تم غربت وافلاس،

میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ مجھے ڈر تو اس بات کا ہے کہ تمہارے اُوپر دنیا اُسی طرح پھیلا دی جائے گی جس طرح ان قوموں پر پھیلائی گئی تھی۔ جو تم سے پہلے ہو گزری ہیں پھر تم اندھا دھند طلب دنیا میں اُسی طرح لگ جاؤ گے جس طرح وہ قومیں لگ گئی تھیں اور دنیا کی حرص تمہیں بھی اُسی طرح ہلاک کر دے گی جس طرح اس نے انہیں ہلاک کیا تھا۔

سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے آخری حصے میں اپنی اُمت کو یہ تنبیہہ اس لیے فرمائی تھی کہ آگے چل کر یہ اُمت طلب دنیا میں مبتلا ہو کر حلال و حرام کی حدود نہ پھلانگ جائے اور اکل حلال کی دولت سے محروم نہ ہو جائے۔ وہ چیز جو انسان کو حرام کمائی کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ حرص ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

دو بھوکے بھیڑیئے بکریوں کے ریوڑ کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا کہ حب مال اور حبِ جاہ انسان کے دین کو تباہ کر سکتے ہیں۔ حب مال ایسی چیز ہے کہ اگر وہ انسان پر غالب آ جائے تو پھر یہی انسان جو مسجود ملائک بنا تھا محبت و رحمدلی کے تمام لطیف جذبات سے عاری ہو کر صرف نفس کا بندہ اور خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔ اور اس کا وجود عالم انسانیت کے لیے سرطان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حبِ مال سے بچنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان کسب معاش ترک کر کے صرف عزلت گزینی اور تسبیح گردانی میں لگ جائے۔ کیونکہ یہ تو رہبانیت ہے جسے اسلام جائز قرار نہیں دیتا حضور ﷺ نے تو کسب حلال کو فریضہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ طبرانی شریف میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "حلال کا طلب کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے" یعنی جس طرح نماز اور روزہ مسلمان پر فرض ہے اسی طرح یہ بھی اس کی ذمے داری ہے کہ حلال روزی طلب کرے۔ ایک روایت میں یہاں تک ہے

کہ جو شخص اپنے اہل و عیال کے لیے حلال روزی طلب کرتا ہے وہ مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے اور جو خود کو سوال کرنے سے بچانے کے لیے رزق حلال طلب کرنے میں مصروف ہے وہ درجہ شہداء میں ہے۔

ایک مرتبہ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ میرے لیے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا فرما دیں تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ پاک اور حلال روزی کھاؤ تمہاری دعائیں قبول ہونگی۔ صحیح مسلم شریف میں ہے سرکار کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسے بہت سارے لوگ ہیں جن کے بال سفر کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں میل کچیل میں اٹے ہوئے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اے میرے رب اے میرے رب! کی صدا لگاتے اور دعائیں مانگتے رہتے ہیں لیکن ان کے پیٹ میں حرام رزق اور جسم پر حرام ذرائع سے حاصل کیا ہؤا لباس ہوتا ہے بھلا ایسے لوگوں کی دعائیں کیسے قبول ہو سکتی ہیں۔

معلوم ہؤا کہ ہر عبادت کی بنیاد اکل حلال ہے۔ اگر اکل حلال نہ ہو تو ساری عبادت و ریاضت اکارت ہے۔ اکل حلال نہ ہونے سے خاندان بھی فاسد ہو جاتا ہے۔ اولاد نافرمان ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس گوشت کی پرورش حرام روزی سے ہوتی ہے اسے آخر کار جہنم میں جانا ہوگا۔ کیونکہ ناپاک گوشت جنت جیسی پاک جگہ میں کیسے داخل ہو سکتا ہے۔

ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ انسان کی غذا اور اس کے دین کے درمیان وہی رشتہ ہے جو کسی عمارت کی بنیاد اور عمارت کے درمیان ہوتا ہے کہ اگر بنیاد ثابت اور مضبوط رہے تو عمارت بھی مستحکم رہتی ہے اور اگر بنیاد کمزور یا ٹیڑھی ہو جائے تو عمارت بھی کمزور ہو کر گر پڑتی ہے۔ رزقِ حلال سکونِ قلب

طمانیت روح اور فراستِ ایمانی عطا کرتا ہے اور لقمۂ حرام خوف و حزن، کرب و اضطراب کو جنم دیتا ہے۔ اب یہ انسان کا اپنا انتخاب ہے جو چاہے اپنے لیے پسند کرلے۔

تحفہ رشوت کی ایک شکل

جب زکوٰۃ و عشر کی فرضیت کے احکام نازل ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اسلامی مقبوضات میں عاملوں کا تقرر فرما دیا جن کے ذمے زکوٰۃ اور عشر کی وصولی تھی۔ ابن اللتبیہ کو آپ نے عامل بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ جب وہ واپس آئے تو انہوں نے وصول شدہ زکوٰۃ کی رقوم اور مویشی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیئے اور مال کا ایک حصہ الگ کر لیا۔ عرض کیا۔ حضور! یہ مال تو زکوٰۃ میں وصول ہوا ہے اور جس حصے کو میں نے الگ کر لیا ہے یہ وہ ہے جسے لوگوں نے تحفے کے طور پر مجھے دیا ہے۔ اتنا سُننا تھا کہ آپ کا چہرہ مبارک متغیّر ہو گیا۔ غصّے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ آپ منبر پر تشریف لے گئے۔ اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان فرمائی پھر ارشاد فرمایا کہ عامل کا کیا حال ہے کہ ہم جب اسے صدقات کی وصولی کے لیے بھیجتے ہیں تو آ کر کہتا ہے کہ یہ آپ کا ہے اور یہ میرا ہے۔ لوگوں نے مجھے تحفے کے طور پر دیا ہے۔ ایسا شخص اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اسے تحفے ملتے ہیں یا نہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے آج جو شخص اس میں سے لے جائے گا وہ قیامت کے دن اپنی گردن پر لاد کر لائے گا اُونٹ گائے بکری جو بھی ہو۔ پھر آپ نے اپنا دست مبارک بلند کر کے ارشاد فرمایا

"خداوندا! میں نے پہنچا دیا۔"

اسی حدیث کی بنیاد پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ حاکم کے

لیے تحفہ قبول کرنے کو مکروہ جانتے تھے۔ کسی نے ان سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ہدیہ قبول فرماتے تھے تو پھر آپ کیوں مکروہ سمجھتے ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو یہ تحفے ہی تھے۔ مگر آج کل یہ رشوت ہے۔

ایک عرب ہر سال حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اونٹ کی ران کا ہدیہ دیا کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک مرتبہ اس کا کسی سے جھگڑا ہو گیا تو وہ فریق ثانی کو لے کر مقدمے کا فیصلہ کرانے خلیفہ حضرت فاروق اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا امیر المومنین! ایسا فیصلہ کیجیئے کہ حق باطل سے بالکل اسی طرح الگ ہو جائے جس طرح اونٹ کی ران اونٹ سے حضرت فاروق اعظم اس کے اس اشارے کو سمجھ گئے اور تحفہ قبول کرنے کی خرابی آپ پر منکشف ہو گئی۔ آپ نے فوراً اپنے تمام گورنروں اور عاملوں کے نام فرمان جاری فرمایا کہ "تحفے نہ قبول کیا کرو کیونکہ اب وہ رشوت کی ایک شکل بن گئی ہے۔ بلکہ اس بات کی تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب حکام کو تحفے کے نام سے رشوت دی جائے گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ چھ چیزیں حرام میں سے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ بُری اور ناپاک چیز حاکم کا رشوت لینا ہے۔ مسند امام احمد میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں سود عام ہو جائے وہ قحط سالی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جس قوم میں رشوت عام ہو جائے وہ دشمنوں سے مرعوبیت کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

رزق حلال

مجلس میں کسی نے سوال کیا "اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیک سب سے اچھی کمائی کونسی ہے؟ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے برجستہ ارشاد فرمایا آدمی کا اپنے ہاتھ کی مشقت سے کمانا یا پھر ایسی تجارت سے کمائی کرنا جس میں

بے ایمانی اور جھوٹ سے کام نہ لیا گیا ہو۔ حضرت ابو سعید خدری سے ترمذی شریف میں روایت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سچائی کے ساتھ تجارت کرنے والا امانت دار تاجر قیامت کے دن نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے یہ بات واضح ہوئی کہ تجارت جو بظاہر ایک خالص دنیاداری کی چیز ہے اگر اس میں بھی امانت داری اور دیانت داری کے اصولوں کا لحاظ رکھا جائے تو یہ دنیاداری کا کام بھی عبادت بن جاتا ہے۔ اور حشر کے دن ایماندار تاجر اللہ کے ان پاک بندوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا جن کی پاکی کا عالم یہ ہے کہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ اس روایئت کے ساتھ ساتھ ترمذی شریف ہی میں ایک دوسری روایئت بھی ہے جس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تاجر لوگ قیامت کے دن بدکار کی حیثیت سے اٹھائے جائیں گے۔ سوائے ان تاجروں کے جنہوں نے اپنی تجارت میں تقویٰ اختیار کیا نیکی کی اور سچائی کے ساتھ معاملہ کیا۔

رزق جو قسمت میں لکھا ہے مل کر رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت تقدیر میں لکھی ہوئی روزی کو روک نہیں سکتی۔ جو قسمت میں نہیں لکھا ہے وہ ہمیں ہرگز نہیں مل سکتا چاہے اسے حاصل کرنے کے لیے ہم ایڑی چوٹی کا زور کیوں نہ لگا ڈالیں۔ اس رزق مقسوم کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں اختیار ہے کہ حلال ذریعہ اختیار کریں یا اسی قسمت میں لکھی ہوئی روزی کو وجۂ حرام سے حاصل کریں۔ یہ ایمان کی کمزوری ہے جو ہمیں حرام راہ کی طرف لے جاتی ہے۔ ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجھہ اونٹ کی نکیل تھامے مسجد کے دروازے تک آئے۔ مسجد کے دروازے پر ایک شخص کھڑا تھا۔ آپ نے اونٹ کی نکیل اُسے تھما دی۔ فرمایا کہ اسے تھامے رکھو۔ میں نماز پڑھ کر ابھی آتا ہوں۔ جب نماز پڑھ کر باہر نکلے تو وہ شخص اونٹ

لے کر فرار ہو چکا تھا۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ سیدنا حضرت علیؓ نے فرمایا لوگو! میری بات سنو۔ میں نے جب اس شخص کے ہاتھ میں اونٹ کی نکیل تھمائی تھی اسی وقت اس کی غربت کو دیکھ کر میں نے اپنے دل میں یہ ارادہ کر لیا تھا کہ نماز کے بعد میں وہ اونٹ اس شخص کو دے دوں گا۔ اب وہی چیز جو حلال ذریعہ سے اس کو ملنے والی تھی اس نے اسے حرام ذریعہ سے حاصل کر لیا ہے۔ جس کا وبال اس پر دنیا اور آخرت دونوں جگہ پڑے گا۔

رشوت کی مذمّت

تاجر بیچارا بازار میں آوارہ و سرگرداں پھر رہا تھا۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اس کی کشتیاں مال سے لدی گھاٹ پر کھڑی تھیں۔ ٹیکس وصول کرنے والوں نے انہیں روک رکھا تھا۔ ٹیکس اگر مناسب و معقول ہوتا تو بیچارے کو کیا اعتراض تھا۔ ادا کر دیتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ گھاٹ کا عملہ تاجر کو خوامخواہ تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اور اس نے مال پر جو ٹیکس عائد کیا تھا اس کی مالیت تو تقریباً مال کی کل قیمت کے برابر تھی۔ رشوت خوروں کا عموماً یہی انداز اور یہی طریقۂ واردات ہوتا ہے کہ آدمی کو خوامخواہ زچ کیا جائے۔ آخر کار آدمی تنگ آ کر ان کی مٹھی گرم کرتا ہے۔ اور پھر اس کی جان چھوٹتی ہے۔ مگر تاجر یہ خسارہ خود تو برداشت کرتا نہیں کیونکہ اگر ایسا کرنے لگے تو پھر کر چکا کاروبار۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس طرح مال کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے جس کا بار آخر کار ملک کے عوام پر پڑتا ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے والوں کو جہنمی فرمایا ہے۔ بدحال و پریشان حال تاجر کی کیفیت دیکھ کر اللہ کے کسی بندے کو ترس آ گیا۔ اس نے تاجر سے کہا کہ مردِ خدا! تو کہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔

اس طرح تیرا مسئلہ حل ہونے کو نہیں۔ میری مان تو سیدھا حضرت

مالک بن دینارؒ کے پاس چلا جا۔ وہ اللہ کے مقبول بندے ہیں۔ سارا شہر بغداد ان کا احترام کرتا ہے۔ وہ بے نواؤں کے وارث اور بے سہاروں کے سہارا ہیں۔ تو ان کی خدمت میں جا کر فریاد کر۔ یقیناً وہ تیری مشکل کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر دیں گے۔ تاجر بیچارا حضرت مالک بن دینارؒ کی خدمت میں حاضر ہؤا اور انہیں اپنی داستان الم سنائی۔ ایک لمحے کا توقف نہ ہؤا اور حضرت مالک بن دینارؒ تاجر کو ساتھ لے کر گھاٹ پہ پہنچ گئے۔ گھاٹ والوں نے تاجر کو مالک بن دینار کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے بڑھ کر استقبال کیا۔ عرض کی حضور آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ ہمیں ہی طلب کر لیا ہوتا۔ ہم تو تابعدار ہیں۔ مالک رحمۃ اللہ نے فرمایا وا جبی ٹیکس لے کر اس کی کشتی کا مال اس کے حوالے کر دو۔ انہوں نے فوراً کشتی تاجر کے حوالے کر دی۔ حضرت مالک بن دینار جب چلنے لگے تو سب نے مل کر دست بستہ عرض کی۔ حضور ہمارے حق میں دعائے خیر کریں۔ جناب مالک نے اُس صندوقچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس میں وہ روپیہ رکھتے تھے فرمایا کہ اس صندوقچی سے کہو کہ یہ تمہارے لیے دعا کرے بھلا جن لوگوں کے لیے روزانہ ہزاروں مظلوم بد دعا کر رہے ہوں انہیں اکیلے مالک کی دعا کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ ظلم سے بچو کہ ظلم ظلمات ہے۔

حرام خوری

ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے اچھی اچھی باتیں ہو رہی تھیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا لوگو! مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ میرے بعد تم لوگ فقر و فاقہ اور غربت و افلاس میں مبتلا ہو جاؤ گے بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ میرے بعد دنیا اور دولت دنیا

تمہارے اوپر اسی طرح پھیلا دی جائے گی جس طرح اگلی امتوں پر پھیلائی گئی تھی اور میری اُمت کے لوگ بھی طلب دنیا میں اسی طرح منہمک ہو جائیں گے جس طرح اگلی اُمتیں منہمک ہو گئی تھیں۔ اور دنیا کی طمع تمہیں بھی اسی طرح ہلاک کر دے گی جس طرح اس نے اُن امتوں کو ہلاک کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ دنیا طلب نہ کی جائے اور رہبانیت اختیار کر لی جائے۔ اسلام ترک دنیا کا سبق نہیں دیتا۔ بلکہ حکم ہے کہ زمین کی وسعتوں میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق حلال طلب کرو۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ تم پر تمہاری جان کا حق ہے۔ تم پر تمہاری آنکھوں کا حق ہے۔ تم پر تمہاری بیوی اور بچوں کا حق ہے۔ سب کا حق ادا کرو۔ محنت مزدوری کر کے روزی کماؤ اور ان حقوق کو ادا کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اُوپر عائد کیئے ہیں البتہ لقمۂ حرام سے بچو۔ کہ ایک لقمۂ حرام برسوں کی عبادت کو غارت کر دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو گوشت لقمۂ حرام سے پلتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم کے سوا کوئی نہیں۔ اپنی اولاد کو حرام روزی نہ کھلاؤ ورنہ وہ کبھی بھی تمہاری اطاعت گزار و فرماں بردار نہ ہو گی۔ آپ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی چیز میں ناجائز طور پر ملاوٹ کر کے اسے فروخت کرتا اور اس طرح مسلمانوں کو دھوکا دیتا ہے وہ میری جماعت سے خارج ہے۔ جو شخص ضروری اشیاء کا اس اُمید پہ ذخیرہ کرتا ہے کہ قلت پیدا ہو جائے گی اور دام چڑھ جائیں گے تو منافع کماؤں گا ایسا شخص ملعون ہے۔ آپ نے فرمایا رشوت لینے والا اور درمیان میں پڑ کر رشوت کا معاملہ طے کرانے والا اور رشوت دینے والا سب کے سب جہنمی ہیں۔ مسند امام احمد بن حنبل میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسی دولت جو تقویٰ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حاصل کی جائے نقصان دہ نہیں ہے۔ البتہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہ

دولت ملعون ہے جو حلال و حرام کی تمیز کئے بغیر اندھا دھند کمائی جائے۔
یہ دولت کتنے دن کسی کے ساتھ رہے گی۔ آخر کار ایک دن احکم الحاکمین
کے دربار میں حاضر ہو کر کوڑی کوڑی کا حساب دینا ہے۔ انسان دنیا سے
سوائے کفن کی ایک چادر کے کچھ نہیں لے جاتا۔ چاہے وہ شہنشاہ ہفت
اقلیم ہو کہ گدائے بے نوا ہ

تربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا ۔۔۔ شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا

بابِ دہم

حقیقتِ دُنیا

حقیقتِ دُنیا

اِس وقت بنو عباسیہ کا جلیل القدر اور مطلق العنان حکمران مجبور و بیکس بستر مرگ پر پڑا تھا۔ موت اس کے سر پہ منڈلا رہی تھی۔ وہ جس کے نام سے بڑے بڑے شہنشاہ لرزہ براندام ہو جایا کرتے۔ جس کے قلم کی گردش تقدیروں کے فیصلے کرتی اور زبان کی معمولی سی جنبش دلوں کو دہلا دیا کرتی۔ آج خود اپنی تقدیر کے آخری فیصلے کا منتظر تھا۔ عالی شان محل تھا۔ خدم و حشم دست بستہ کھڑے تھے۔ اطباء اور معالجین کی فوج ظفر موج بھی تھی۔ تدبیروں پر تدبیریں اور دعاؤں پہ دعائیں ہو رہی تھیں مگر سب بے سود۔ ہارون الرشید کو صاف نظر آ رہا تھا کہ موت اپنے پنجے اس کے وجود میں گاڑتی چلی جا رہی ہے۔ اور موت سے کسی کو مفر نہیں۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔ اس نے اس محل میں جس میں وہ ٹھہرا ہُوا تھا اپنی قبر کھدوائی اور قبر جب تیار ہو گئی تو چند حافظوں نے قبر میں اُتر کر قرآن مجید ختم کیا۔ ہارون نے اپنا پلنگ قبر کے قریب بچھوایا اور لیٹا غور سے اپنی قبر کو دیکھتا رہا۔ زندگی کی برف پگھل رہی تھی اور ہر لمحہ اسے موت کے قریب لے جا رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوُا کہ اب وقت آخر آن پہنچا ہے تو اس نے کہنا شروع کیا۔

لوگو گواہ رہنا کہ میں اللہ تعالیٰ پہ ایمان رکھتا ہوں۔

اپنی ذات و صفات میں اسے یکہ و تنہا تسلیم کرتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے سچے اور آخری رسول تھے۔ میں معصیت و گناہ کا پیکر ہوں میں نے تمام عمر غم غلط کرنے کی کوشش کی۔ تعیشات دنیوی میں سکونِ قلب کو ڈھونڈا۔ لیکن عیش و سکون کا سامان جتنا ہی جمع کرتا رہا دل کے اطمینان اور قلب کے سکون سے اتنا ہی محروم ہوتا گیا۔ میں نے بے حد مغموم اور پُراندوہ زندگی گزاری ہے۔ حکومت کے کاموں اور دنیوی تعیشات نے مجھے اکثر خدا اور مذہب سے غافل رکھا۔ لوگو! دعا کرو کہ خدا مجھے معاف فرمائے۔ مجھے زندگی کا کوئی ایسا دن یاد نہیں جسے میں نے بے فکری سے گزارا ہو۔ اب میری کشتیِ حیات غرقاب ہونے والی ہے۔ عنقریب موت مجھے تم سے جدا کردے گی۔ اور یہ قبر جو اس وقت منہ کھولے میرے سامنے ہے میرے جسم کو نگل لے گی۔ رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ خویش و اقرباء سب جدا ہو جائیں گے۔ میں ہونگا اور قبر کی اتھاہ تاریکی۔ یہی ہر انسان کا انجام ہے لیکن انسان اپنے انجام سے میری طرح غافل رہتا ہے۔ میں جو کروڑوں اور اربوں کا مالک تھا۔ دیکھ لو کہ خالی ہاتھ دنیا سے جا رہا ہوں۔ میں کہ میرے نام کا طوطی بولتا تھا۔ شرق و غرب میں میری عظمت و برتری کا ڈنکا بجتا تھا۔ آج دوسروں کے لیے سامانِ عبرت ہوں۔ مجھے دیکھو اور دنیا اور دولت دنیا کی حقیقت پہچاننے کی کوشش کرو۔ اس گفتگو کے بعد ہارون الرشید نے آخری ہچکی لی اور اس سفر پہ روانہ ہو گیا جس پہ جانے والا کوئی مسافر کبھی واپس نہیں آیا کرتا۔

طمع اور لالچ کا انجام

راستے کے کنارے پڑی ہوئی سونے کی اینٹ پر جب آفتاب کی کرنیں پڑیں تو وہ اس طرح چمکنے لگی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ اللہ کے پاک اور برگزیدہ نبی جناب عیسیٰ مسیح علیہ السلام گزر رہے تھے۔ اور ان کے پیچھے بہت سے آدمی تھے۔ ہمراہیوں میں سے تین آدمیوں کی نگاہیں جب اس

چمکتی دمکتی اینٹ پر پڑیں تو لالچ اور طمع کی وجہ سے ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ اینٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ سیدنا عیسٰی مسیح علیہ السلام نے ان کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے ارشاد فرمایا اُدھر نہ جاؤ۔ یہ طمع تمہیں ہلاک کردے گی۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ میری پیروی کرو۔ میرے بتائے ہوئے راستے پر چلو۔ میں تمہیں حقیقت حیات سے آشنا کردوں گا۔ فانی کی طرف دوڑنے والو! میرا کہا مانو میں تمہیں ذات باقی کی معرفت عطا کردوں گا۔ مگر سونے کی اینٹ کی چمک نے تین آدمیوں کی آنکھوں پر لالچ کا پردہ ڈال دیا تھا۔ انہوں نے ایک نہ سُنی اور حضرت مسیح علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ کر اس اینٹ کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھ گئے۔ تینوں نے جا کر اینٹ کو اٹھایا۔ اینٹ کافی وزنی اور قیمتی تھی۔ ان کے دل کھل اُٹھے۔ سوال پیدا ہوا کہ اس کو آپس میں تقسیم کیسے کیا جائے۔ ایک نے کہا کہ اس اینٹ کے تین ٹکڑے برابر برابر کرلیے جائیں اور ہر آدمی ایک ایک ٹکڑا لے لے۔ مگر تینوں کو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ سونا کھانے کی چیز تو نہیں کہ وہ لوگ اسے کھا کر اپنی بھوک مٹا لیتے۔ قرار پایا کہ دو آدمی تو مل کر سونے کی اینٹ کے ٹکڑے کریں۔ اور ایک آدمی بازار جا کر کھانا خرید کر لائے۔ چنانچہ دو شخص اینٹ کو توڑنے میں لگ گئے اور تیسرا کھانا لینے بازار چلا گیا۔ جب یہ دونوں اکیلے ہوئے تو مشورہ ہوا کہ کیوں نہ ہم اس اینٹ کے دو ہی ٹکڑے کریں اور آپس میں بانٹ لیں۔ تیسرا جب کھانا لے کر آئے تو اسے قتل کردیں۔ اس طرح ہمارے حصے میں زیادہ سونا آئے گا۔ بات طے ہوگئی۔ اور ان دو آدمیوں نے اینٹ کو صرف دو حصوں میں تقسیم کیا۔ اور تیسرے ساتھی کا انتظار کرنے لگے۔ تیسرا بازار گیا۔ کھانا خریدا لیکن ساتھ ہی تھوڑا سا زہر قاتل بھی خریدا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں اس کھانے میں زہر ملا کر ساتھیوں کو کھلا دوں تو وہ سب مرجائیں گے اور میں پوری اینٹ کا تنہا مالک بن جاؤں گا۔ زہر ملا ہوا کھانا لے کر جب وہ اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچا تو طے شدہ منصوبے کے مطابق

اس کے دونوں ساتھی اس پر جھپٹ پڑے اور تلوار کے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اب دونوں بے فکر بھی تھے اور خوش بھی۔ کہ ان کے حصے میں زیادہ سونا آگیا۔ لیکن بھوک تھی کہ چمکتی ہی جا رہی تھی۔ سونا لے کر چلنے سے پہلے دونوں نے سوچا کہ کھانا تو کھا لیں۔ ڈٹ کر کھانا کھایا۔ دو چار لمحوں میں زہر نے اپنا اثر دکھایا۔ اور وہ دونوں بھی موت کی آغوش میں چلے گئے۔ سونے کی اینٹ پڑی تھی اور اس کے قریب ہی تین بے جان لاشے۔ جناب مسیح علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس آ رہے تھے۔ سونے کی اینٹ دیکھی اور تین طالبین دنیا کے لاشے فرمایا ساتھیو! دیکھ لو۔ یہی دنیا ہے۔ اور یہ ہے اس کے چاہنے والوں کا انجام۔

حقیقتِ دُنیا

خلیفہ مہدی بڑی شان اور بڑے جلال کا خلیفہ تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے قیام کے واسطے ایک مستحکم اور پائیدار محل تعمیر کرائے بڑے بڑے معماروں اور مہندسوں کو جمع کیا۔ مہینے تو لگ گئے۔ محض عمارت کا نقشہ بنوانے میں۔ پھر سامان تعمیر اکٹھا کیا جانے لگا۔ ہزاروں مزدوروں کاریگروں اور ماہرین نے بڑی محنت۔ جانفشانی اور مشقت سے محل کی بنیادیں استوار کیں۔ کام شروع ہو گیا اور برسوں میں نہائیت خوبصورت، مستحکم اور عالی شان محل تیار ہوا۔ اب آرائش کا دور آیا۔ اتنے بڑے حکمران کو کس چیز کی کمی تھی۔ محل سجا دیا گیا۔ خلیفہ نے اعلان کیا کہ محل کے دروازے چوپٹ کھول دیئے جائیں اور ہر عام و خاص کو اجازت دی کہ اگر محل دیکھنا چاہے تو آکر دیکھے۔ کیونکہ ناظرین یا تو دوست ہونگے یا دشمن۔ اگر دوست ہونگے تو محل کا استحکام اور اس کی شان و شوکت دیکھ کر خوش و خرم ہونگے اور دوستوں کی خوشی ہی تو خلیفہ کو مطلوب تھی۔ اور اگر بالفرض دیکھنے والوں میں دشمن اور حاسد ہوئے تو محل کی خوبی کو

دیکھ کر کڑھیں گے دل گرفتہ ہونگے۔ اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا دشمن کڑھے جلے۔ ویسے خلیفہ کو اس بات کا بھی خیال تھا کہ دشمن کی نگاہ اچھی سے اچھی چیز میں کوئی نہ کوئی عیب تلاش ہی کر لیتی ہے لہذا ممکن ہے کہ کوئی دشمن اس محل پر حاسدانہ نگاہ ڈالے اور اس کی تعمیر و تزئین میں کوئی عیب نکال دے۔ اس طرح اگر محل میں کوئی خامی ہوئی تو اس کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔ جس دن محل کے دروازے کھولے گئے آدمیوں کا جم غفیر ٹوٹ پڑا۔ جو آتا محل کی مضبوطی اور اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتا۔ حاسدین بھی آئے اور انہوں نے اپنی چشم بد بیں سے محل کے گوشے گوشے کا جائزہ لیا۔ لیکن ان کی نظروں کو مایوس ہی لوٹنا پڑا اس لیے کہ خلیفہ نے اپنے پر شکوہ محل کو ہر قسم کے نقص سے بچانے کا پورا پورا اہتمام کر رکھا تھا۔ دن بھر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا یہاں تک کہ شام کا دھندلکا چھانے لگا۔ اب رفتہ رفتہ لوگ بھی وہاں سے سرکنے لگے۔ نہائیت فخریہ انداز میں خلیفہ مہدی محل کے سامنے کھڑا اپنے خوبصورت محل کو دیکھ رہا تھا۔ کہ اس کے قریب ایک کمبل پوش فقیر آ کر کھڑا ہؤا۔ اور امیرالمومینین کو سلام کیا۔ امیرالمومینین خلیفہ مہدی جب اس گلیم پوش کی طرف متوجہ ہؤا تو اس نے کہا خلیفہ! آپ نے بہت مضبوط اور خوبصورت محل تیار کرایا ہے۔ مگر اس میں دو عیب ہیں۔ فقیر کی بات سن کر مہدی چونک پڑا۔ اور غضب آلود نگاہوں سے فقیر کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ کونسے دو عیب؟ فقیر نے نہائیت سنجیدگی اور جرائت سے جواب دیا کہ ایک تو یہ کہ "آپ اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ ایک نہ ایک دن اسے چھوڑ کر کنج مزار میں جانا ہوگا اور دوسرا یہ کہ "یہ محل ہمیشہ نہ رہے گا۔ خلیفہ کو ایسا لگا جیسے وہ طویل خواب سے جاگ اٹھا۔ دنیا اور حقیقت دنیا اس کی آنکھوں پہ منکشف ہو گئی اور وہ اتنا متاثر ہؤا کہ اس محل کو غرباء پہ وقف کر دیا۔

زندگی کی حقیقت

سیدنا حضرت عیسٰی مسیح علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنے حواریوں کے حلقے میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص حیران و پریشان انتہائی بدحواسی کے عالم میں حاضر ہوُا۔ اور کچھ عرض کرنا چاہا آپ نے حلم و وقار کے ساتھ اسے بیٹھنے کو کہا۔ جب ذرا اس کی طبیعت کی شورش رفع ہوئی تو آپ نے اسے معروضات پیش کرنے کی اجازت دی۔ اس نے کہا۔ حضور! میں نے آج صبح صادق کے قریب ایک نہائیت بھیانک خواب دیکھا ہے نہ جانے میرے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ خدا کے لیے میری دستگیری فرمایئں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک جنگل میں ہوں۔ اچانک ایک شیر کے دھاڑنے کی آواز سُن کر میں بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے میں ایک کنوئیں کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوفناک شیر میرا پیچھا کرتا ہوُا آرہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایک درخت کی جڑیں اس کنویں میں لٹک رہی ہیں شیر سے بچنے کے لیے اس درخت کی جڑ کو پکڑ کو کنویں میں اُترنے لگا اتنے میں شیر کنویں کے منہ پر آگیا۔ وہ نہائیت غصّے میں اُوپر سے مجھے گھورنے لگا۔ شائدُ وہ اس انتظار میں تھا کہ میں اُوپر آؤں تو مجھے وہ اپنا لقمہ بنائے۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ کنویں میں کتنا پانی ہے میں نے جو نیچے نگاہ ڈالی تو لرز اُٹھا کیونکہ وہ کنواں خشک تھا۔ اس میں پانی کی بجائے ایک نہائیت خوفناک اژدھا تھا جو منہ پھاڑے اسس انتظار میں تھا کہ میں نیچے اُتروں اور وہ مجھے ہڑپ کر لے کنویں کے منہ پر بھوکا شیر اور تہ میں خوفناک اژدہا۔ دونوں مجھے نگل لینے کے لیے تیار۔ یا خدا! میں کیا کروں۔ درخت کی جڑ کی ایک شاخ ہی میرا واحد سہارا تھی۔ میں نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ اور تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ اتفاقاً تھوڑی دیر بعد جو میں نے نگاہ اٹھائی تو ایسا منظر دیکھا کہ میں کانپ اُٹھا اور موت میری

آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ کیا دیکھا کہ ایک سفید اور ایک سیاہ پرندہ ہے اور دونوں کنویں میں لٹکی ہوئی اس جڑ کو کُتر رہے ہیں۔ اب میری موت یقینی تھی. کیونکہ جس تیزی سے وہ پرندے اس شاخ کو کُتر رہے تھے بہت جلد وہ شاخ ٹوٹ جاتی اور میں دھڑام سے اژدہے کے منہ میں چلا جاتا۔ اُمید کی نبضیں ڈوبنے لگیں اور میں سخت اضطراب میں تھا کہ میری آنکھ کھُل گئی جسم پر لرزہ طاری تھا. اور سارا بدن پسینے میں شرابور۔ حضور! میں بھاگا بھاگا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے نا اُمید نہ فرمایئے۔ اس خواب کی تعبیر بتلایئے. کونسی مصیبت آنے والی ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی آنکھیں اس کا خواب سُن کر چمک اُٹھیں۔ فرمایا میرے بچے! یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ مگر افسوس کہ تم لوگ خواب کو حقیقت اور حقیقت کو خواب سمجھنے کے عادی ہو. سُن! کہ وہ شیر فرشتہ اجل ہے جو ہر وقت تیری گھات میں لگا ہوا ہے۔ درخت کی جس جڑ کو پکڑ کر تو لٹکا ہوا تھا یہ تیرا تار حیات ہے اور وہ دو سفید و سیاہ پرندے دن اور رات ہیں جو تیری زندگی کی مہلت کو کم سے کم کرتے جا رہے ہیں. کنویں کی تہ میں جو اژدھا منہ کھولے ہوئے تجھے نگل لینے کے انتظار میں ہے یہ اژدہا نہیں تیری قبر ہے جس میں تجھے ایک نہ ایک دن گر جانا ہے۔ حقیقت کو خواب سمجھنے والے اب بھی ہوش کے ناخن لے۔

روشنی

دینی موضوعات پر نشری تقاریر

جلد اول

مولانا محمد متین ہاشمی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور